مشفقِ من خواجہ من
اس سرا میں نہیں قیام بہت
زندگی مختصر ہے کام بہت
مرتب:
محمد عالم مختار حق
BOOKMAN

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُشفقِ مَن خواجۂ مَن

مُشفق خواجہ مرحوم کے حوالے سے

تعزیتی اور تاثراتی تحریریں

مرتب

محمد عالم مختارِ حق

بہ اشتراک

بُک مین لاہور بیت الحکمت لاہور

BOOKMAN

کتاب دوستوں کے لیے ہماری مطبوعات
سدابہار ارزاں اور معیاری مطبوعات

اہتمام اشاعت
مظہر سلیم مجوکہ

ضابطہ

ISBN 969-8598-06-5

نام کتاب : مشفق من خواجہ من
مرتب : محمد عالم مختار حق
ناشر : بک مین
انجم بلڈنگ نیلا گنبد لاہور — فون: 7322996
اشاعت : 2006ء
سرورق : عامر
مطبع : قدوسیہ اسلامک پریس لاہور
قیمت : 150 روپے

ڈسٹری بیوٹرز

7339884 :فون
hikmat100@hotmail.com :ای میل

فہرست

اپنی بات

عظیم محقق، ادیب، کالم نگار، مشفق انسان، خزینہ علم و ادب، شناور بحر تحقیق، نجی فی العلم، کتاب [illegible] نادر روزگار شخصیت ''مشفق خواجہ'' کی پہلی برسی کے موقع پر [illegible] مشفق پر مجموعہ ہمارے اس عہد نا سپاس کے ایک بہت بڑے محقق اور عظیم [illegible] جسے تشنگان علم کے لیے ہمارے اس عہد کے ایک اور [illegible] سے مرتب کیا ہے۔ یہ وہ آنسو ہیں جو خواجہ [illegible] ہیں۔ ان کی یادوں سے معطر سدا [illegible] بڑی محنت سے گوندھ کر ایک ایسی مالا میں [illegible] مشفق خواجہ برصغیر پاک و ہند کے گنے چنے کتاب [illegible] تحقیق، شاعری، کالم نویسی، ادارت، فوٹو گرافی ان کے خاص [illegible] شخصیت کی رحلت دنیائے ادب کا ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ ان [illegible] ادب کے نووارد ان کو راستہ دکھاتے رہیں گے۔

[illegible] مشفق خواجہ سے شناسائی ہوئی۔ زندگی میں اُن سے [illegible] آپ بھی جب یہ تحریریں پڑھیں گے تو میری ہم [illegible] ہیں۔

[illegible] جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں رہتی ہے۔ لوگ اس سرائے میں آتے ہیں قیام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں مگر مشفق خواجہ جیسے لوگ یہاں سے جا کر بھی اپنی خوش گوار یادوں کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، امر ہو جاتے ہیں۔ مجھے شکریہ ادا کرنا ہے، محترم محمد عالم مختار حق کا جنہوں نے میری درخواست پر [illegible] میں خواجہ صاحب کے حوالے سے لکھی گئی تحریروں کا ایک جامع انتخاب مرتب کیا۔ اپنے

نام لکھے گئے خواجہ صاحب کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی وہ مرتب کر چکے ہیں۔ جو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اپنے ادارے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی جانب سے شائع کر رہے ہیں۔ میں ہمیشہ ان کی محبتوں کا مقروض رہتا ہوں۔ سید قاسم محمود، پروفیسر عبدالجبار شاکر اور سید اویس علی سہروردی کا شکریہ جن کی رہنمائی شامل حال رہتی ہے۔ ان تمام مدیران جرائد اور لکھاریوں کا شکریہ جن کی تحریروں سے یہ ارمغان محبت ترتیب دیا گیا ہے۔

اور آخر میں "کتاب سرائے" کے نوجوان منتظم اعلیٰ محمد جمال الدین افغانی کا خصوصی شکریہ کہ جن کے تعاون سے یہ مجموعہ اشاعتی مراحل طے کر سکا۔ اب خواجہ صاحب کے چاہنے والوں تک اس کی ترسیل بھی انہیں کے ذمہ ہے کہ یہ خود بھی اچھی اچھی کتابوں کی اشاعت اور ترسیل کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اللہ پاک انہیں اپنی امان میں رکھے اور تمام کتاب دوستوں کو بھی (آمین)۔

مظہر سلیم مجوکہ

بک مین لاہور۔ ۲۲ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ بمطابق ۲۱ فروری ۲۰۰۶ء

تعارف

[illegible] طرف سے جانے والے دو ہی طریق ہیں۔ تخلیق اور تحقیق۔ تخلیق آزاد اور مجرد خیالوں [illegible] اور منظومہ خیالوں کی تخلیق ہے۔ مشفق خواجہ میں بیک وقت دونوں طریق پر [illegible] تحقیق کو تخلیق بنایا اور تخلیق کو تحقیق۔ محمد عالم مختار حق میں دوسری حس زیادہ [illegible] شہد کی مکھی کی طرح وہ دور ہی سے سونگھ لیتے ہیں کہ چھتے [illegible] ان کی اس [illegible] شامہ سے میری پہلی شناسائی چالیس [illegible] انہوں نے اس [illegible] ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی وفات پر مظہر سلیم مجوکہ کی [illegible] انہوں نے اپنے نام ڈاکٹر [illegible] انہی دنوں انہوں نے ڈاکٹر حمید اللہ کی [illegible] میں چھپنے کے انتظار میں ہیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ [illegible] ایک جامع تالیف ہے جو اپنے وقت کے لاہور کی نہایت [illegible] دکان ایک بہت بڑی بین الاقوامی اسلامی [illegible]

[illegible] اپنی پہلی برسی کے موقع پر [illegible] کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا جس سے [illegible] اس ایک برس کے [illegible] خواجہ صاحب کے بارے میں [illegible] محمد عالم مختار حق نے ان سب کا [illegible] انتخاب کی اپنی [illegible] مستقبل میں مشفق خواجہ کی زندگی کے [illegible] ساتھ [illegible]

یہاں ان کی دل پذیر شخصیت کی جھلکیاں بھی ہیں، یادیں بھی، تاثرات بھی، کچھ آنسو بھی ہیں، کچھ قہقہے ہیں۔ خواجہ صاحب تو چلے گئے، اب ان سے کیا کہنا، اردو ادب کی وہ واحد شخصیت ہیں جن کے خلاف ایک سطر بھی کسی کو کہنے یا لکھنے کا یارا نہیں۔ جب بھی زبان ہلے گی یا قلم اٹھے گا، ان کی ذات یا تحریر کے بارے میں تعریف و تحسین کے کلمات ہی نکلیں گے۔ اس وقت تو داد اور مبارک باد کے مستحق محمد عالم مختار حق ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد کے ایک شخص کی عظمت میں خراج عقیدت پیش کرنے والی تحریروں کا انتخاب کر کے انہیں یکجا کر دیا ہے اور اس داد و مبارک باد میں شریک ہیں مظہر سلیم مجوکہ بھی جو راہِ حق و تحقیق پر چلنے میں مختار حق کو تحریک دیتے رہتے ہیں۔

سید قاسم محمود

سوانحی خاکہ

[illegible]

(۲) ''پرانے شاعر نیا کلام'' بعض ایسے شعرا پر تحقیقی کام، جن پر پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔ حالات اور انتخاب کلام۔ یہ کتاب [illegible] ادارہ ماہی ''غالب'' کراچی میں ۷۶۔۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔

(۳) ''ابیات'' مجموعہ کلام ۱۹۷۸ء کراچی

(۴) ''اقبال'' (از احمد دین) علامہ اقبال پر لکھی گئی اردو میں پہلی کتاب جو پہلی بار علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوئی مگر یہ جو جلا دی گئی۔ مفصل مقدمے، تعلیقات و حواشی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۷۹ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی سے شائع ہوئی۔

(۵) ''غالب اور صفیر بلگرامی'' غالب اور ان کے شاگرد صفیر کے باہمی تعلقات اور مراسلت کے بارے میں۔ کراچی ۱۹۸۱ء

(۶) ''تخلیقی ادب'' (ادبی کتابی سلسلہ): ہم عصر تخلیقی ادب کے جائزوں اور منتخب تحریروں پر مشتمل یہ پانچوں جلدیں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران کراچی سے شائع ہوئیں۔

(۷) ''جائزہ مخطوطات اردو'' پاکستان میں موجود مخطوطات اور دنیا بھر میں ان کے ذخیروں کا تذکرہ۔ پہلی جلد جو ۱۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، مرکزی اردو بورڈ لاہور سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

(۸) ''تحقیق نامہ'' تحقیقی مقالات کا مجموعہ، شائع کردہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۹۱ء

(۹) تقریباً دو درجن تحقیقی مقالات، جو برصغیر کے مختلف علمی جریدوں میں شائع ہوئے۔

(۱۰) ریڈیو پاکستان کے لیے ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۶ء تک مختلف موضوعات پر تقریباً پانچ سو فیچر لکھے۔

(۱۱) ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۷ء تک مختلف اخبارات و رسائل (صداقت، جسارت، زندگی، تکبیر) کے لیے دو ہزار سے زائد (سیاسی و ادبی) کالم لکھے۔ ادبی کالموں کے تین انتخاب کتابی صورت (۱) خامہ بگوش کے قلم سے ۱۹۹۵ء (۲) سخن در سخن ۲۰۰۲ء (۳) سخن ہائے ناگفتنی ۲۰۰۲ء میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۲) کلیاتِ یگانہ ۲۰۰۳ء

انتقال: ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء

تدفین: سوسائٹی قبرستان، پی ای سی ایچ ایس، کراچی

مشفق خواجہ اور ان کا ''کتب خانہ''

(آمد ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء رخصت ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء)

''[illegible] کتب خانہ ہے۔''

[illegible] جب چند برس قبل ہندوستان کے نامور ادیب اور [illegible] اور خواجہ صاحب کے گھر میں تشریف فرما [illegible] دیکھا نہ کہیں سنا۔ چھوٹے سائز [illegible] کتابوں سے بھرے ہوئے نہیں بلکہ اٹے [illegible] تو فرش بھی کتابوں سے بھر [illegible] کے بھی ہوں گے لیکن یہ وہ کتب خانہ [illegible] کے لیے کھلے تھے۔ خواجہ [illegible] کیا ہے [illegible] صاحب کو پیش کرنے [illegible] علامہ اقبال کے اس مصرع [illegible]

[illegible] اور ہے

[illegible] دوسروں کی عملی مدد کرتے اس کی [illegible] کے حصول کے لیے [illegible] اور فوٹو اسٹیٹ [illegible] ہمارے معاشرے [illegible]

[illegible] ہمارے معاشرے [illegible] کرتا عام [illegible] میں حصول علم [illegible]

جاننے والے جانتے ہیں کہ خواجہ صاحب کوئی امیر کبیر آدمی نہ تھے۔ وسائل محدود اور اس پر طرح طرح کے امراض کا ساتھ لیکن انہوں نے اپنے دکھ اور اپنی تکلیفوں پر پردہ ڈال کر دوسروں کی مدد کرنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ اس کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جو کبھی خواجہ صاحب کی محفل میں بیٹھا ہو۔ وہ اپنے دلچسپ اور چبھتے ہوئے جملوں سے محفل کو زعفران زار بنانے کا فن جانتے تھے۔ مخاطب کو لاجواب کرنے اور اسے دلائل سے قائل کرنے میں خواجہ صاحب اپنی مثال آپ تھے۔ خواجہ صاحب کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ اچھا دوست ضائع کر دیتے ہیں لیکن اچھا جملہ نہیں۔ واقعات تو بہت سے ہیں لیکن خواجہ صاحب کی بذلہ سنجی اور دلچسپ جملوں کی ادائیگی کا ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔

ایک محفل میں ایک صاحب کافی دیر سے اپنی تعریف میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے انہیں اپنا ماضی بے اختیار یاد آیا اور فرمانے لگے۔ "ہمارے بچپن کا زمانہ بھی کیا سستا زمانہ تھا۔ دایہ بچہ جنوا کر تھوڑا سا آٹا اور آٹھ آنے لے کر خوش ہو جاتی تھی۔"

خواجہ صاحب ان صاحب کی باتیں پچھلی صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی ان صاحب سے یوں گویا ہوئے۔ "اور آٹھ آنے میں بچے بھی آپ جیسے ہی پیدا ہوتے تھے۔"

اس جملے کو سنتے ہی پوری محفل زعفران زار بن گئی۔ اس طرح کے جملے خواجہ صاحب کے گھر اتوار کی نشست میں حاضرین کو بار بار سننے کو ملتے تھے۔

مشفق خواجہ کا قلمی نام تمام اردو دنیا میں اس قدر مشہور ہوا کہ اصلی نام لوگ بھول گئے۔ ان کا اصلی نام خواجہ عبدالحی تھا۔ خواجہ صاحب کے والد محترم خواجہ عبدالوحید (وفات ۱۸ دسمبر ۱۹۷۹ء) مشرقی و مغربی علوم کے ماہر، علامہ اقبال کے ہم جلیس اور کئی علمی کتب کے مصنف تھے۔ ان کے حقیقی چچا خواجہ عبدالمجید اردو کی ضخیم لغت "جامع اللغات" کے مولف تھے۔ ان کے نانا میاں میر بخش کا لاہور میں "کریمی پریس" تھا جس میں علامہ اقبال اور دیگر مشاہیر ادب کی کتب شائع ہوتی تھیں۔ اسی علمی گھرانے میں ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو خواجہ صاحب کی ولادت ہوئی۔ ان کی جائے ولادت محمد نگر لاہور ہے۔ قیام پاکستان کے بعد خواجہ عبدالمجید لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے۔ یہیں مشفق خواجہ نے بی اے اور ۱۹۵۸ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ ایم اے تو بے شمار ہوں گے لیکن خواجہ صاحب نے مسلسل مطالعے اور محنت سے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ اردو ادب کا خواہ کوئی موضوع ہو، تحقیق کرنے والا طالب علم ان سے ضرور مدد حاصل کرتا اور خواجہ صاحب بڑی فراخدلی سے ان کی مدد کرتے۔ یوں گزشتہ چالیس برسوں میں پی ایچ ڈی کرنے والے بیشتر خواتین و حضرات خواجہ صاحب کی مدد ہی کی بنا پر یہ ڈگری حاصل کر پائے۔

خواجہ صاحب محض ۲۳ برس کی کم عمری میں اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے معاون بن چکے تھے۔ بابائے اردو سے ان کا تعلق ۱۹۵۷ء میں قائم ہوا جو ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو بابائے اردو کے انتقال تک جاری رہا۔ بابائے اردو خواجہ صاحب پر اس قدر اعتماد کرتے تھے کہ اپنی زندگی ہی میں

انہیں انجمن ترقی اردو کے دو معروف پرچوں یعنی سہ ماہی "اردو" اور ماہنامہ "قومی زبان" کا مدیر مقرر کیا۔ خواجہ صاحب نے ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء تک انجمن ترقی اردو کی ملازمت کی لیکن حقیقتاً تادم آخر ان کا انجمن سے گہرا تعلق رہا۔ بابائے اردو کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کے علمی منصوبوں کے مختلف مراحل کی نگرانی سے تکمیل تک کا نازک کام اور ان کی نشر و اشاعت میں خواجہ صاحب کا پس پردہ کردار رہا۔ [illegible] بابائے اردو کے انتقال کے بعد خواجہ صاحب ہی نے انجمن ترقی اردو کے علمی منصوبوں کی تکمیل اور رسائل کی اشاعت کی ذمہ داری اعزازی طور پر سنبھال رکھی تھی۔ وفاداری بشرط استواری کی ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

خواجہ صاحب نے اپنے قیمتی وقت اور صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ انجمن ترقی اردو [illegible] غالب کے اشاعتی منصوبوں کی نگرانی تادم آخر کرتے رہے۔ انتقال سے قبل ادارہ [illegible] کتب ان کی نگرانی میں اشاعت کے مختلف مراحل میں تھیں۔ اب ان کے [illegible] ان اداروں کی کون خدمت کر سکے گا؟

خواجہ صاحب [illegible] وسیع المطالعہ شخص تھے اور جتنے بڑے علمی کام وہ کر سکتے تھے، اس کے مقابلے [illegible] ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کی زندگی اور ان کی صلاحیتیں اپنی ذات [illegible] کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے وقف تھیں۔ ان کی کتابوں میں "تذکرہ خوش معرکہ [illegible]) اقبال از احمد دین، غالب اور صفیر بلگرامی، جائزہ مخطوطات اردو (جلد اول)، [illegible] ابیات (شعری مجموعہ)، کلیات یگانہ (تحقیق) اور ادبی کالموں کے تین [illegible] تحقیق شامل ہیں۔ خواجہ صاحب دیگر کئی علمی و [illegible] کتابیں غیر مطبوعہ تھیں لیکن وہ انہیں شائع نہیں [illegible] کہ جب کوئی کتاب مکمل ہو جاتی ہے تو نظروں [illegible] Perfectionist مصنفین [illegible] شائع کر دی۔ [illegible] کہ ان چاروں جلدوں کی [illegible] لیکن ان کا [illegible]؟

[illegible] اور اس کی [illegible] اس کے بعد [illegible] سید سلیمان ندوی [illegible] و دیگر [illegible] شائع کرائیں۔ اس کے علاوہ [illegible] اردو کے ساتھ [illegible] سالہ

قیام کی ڈائری بھی مرتب کر کے شائع کرانے کا ارادہ تھا۔ افسوس کہ یہ تمام منصوبے ان کے جانے سے نامکمل رہے۔

خواجہ صاحب سے راقم الحروف کا غائبانہ تعارف تو برسہا برس سے تھا اور ان کا ادبی کالم ہر ہفتے بڑے شوق سے راقم پڑھتا۔ لیکن باقاعدہ تعارف تقریباً دس سال قبل ہوا۔ اس کے بعد اکثر اتوار کی نشستوں میں اور گاہے بگاہے اس کے علاوہ بھی ملاقات اور استفادہ کے مواقع حاصل ہوئے۔ راقم کی گزارش پر انہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے "تذکرۂ خطاطین" کے کمپوز شدہ صفحات کے مطالعہ کے لیے وقت نکالا۔ مفید مشورے دیے اور کتاب کے بارے میں بغرض اشاعت اپنی تحریر بھی عنایت فرمائی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کتاب بے حد پسند کی گئی۔ خواجہ صاحب کتاب کی تیاری کی خاطر راقم کی محنت سے واقف تھے۔ خطاطی ان کا خصوصی شعبہ نہیں تھا لیکن اس فن سے دلچسپی اور اس کے نوادرات کی جمع آوری کا ذوق ضرور تھا۔ یہ ان کی عنایت تھی کہ کتاب کی خاطر استاد محمد یوسف دہلوی کی دو وصلیوں کے عکس عنایت فرمائے جن کی اصل ان کے پاس محفوظ تھیں۔ یہ ان کی بڑائی تھی کہ وہ راقم کی محنت کو بنظر تحسین دیکھتے اور لوگوں سے اس حوالے سے تعارف کراتے۔ جس وقت خواجہ صاحب نے اپنی تحریر بغرض اشاعت عنایت فرمائی تو راقم نے ان کی طاقتور اور موثر عبارت پڑھ کر شکریہ ادا کیا۔ اس وقت انہوں نے فرمایا کہ وہ اس سے قبل ایک اور عبارت لکھ چکے تھے لیکن بعد میں اسے پھاڑ دیا کیونکہ وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ پھر دوبارہ زیادہ موثر اور زوردار عبارت لکھی۔

اس دنیا میں جو آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ خواجہ صاحب بھی ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کی شب راہی ملک عدم ہو گئے لیکن نہ جانے کیوں اب تک دل کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا۔ اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں فون کریں گے اور وہ اپنے مخصوص مہذب اور نستعلیق لہجے میں کہیں گے۔ "فرمایئے..... ای بی بے"

اب بھی ایسا لگتا ہے کہ پاپوش نگر کے اس مکان میں اتوار کی نشست میں جائیں گے اور خواجہ صاحب اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ استقبال کریں گے۔ علمی مشاغل کے بارے میں پوچھیں گے، مفید مشورے دیں گے اور اپنے مخصوص چبھتے ہوئے جملوں سے حاضرین کو خوش کریں گے اور خود بھی خوش ہوں گے۔ لیکن یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ مگر حقیقت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعد اس گھر کے در و دیوار تاریک ہو چکے، اب اس گھر میں کتابیں ہیں، رسائل ہیں، مخطوطات ہیں مگر خواجہ صاحب نہیں۔ عجب نہیں کہ کسی گوشے سے خواجہ صاحب کا ہی یہ شعر سنائی دے:

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو!
اسے بھی دیکھو، جو اک عمر یاں گزار گیا

(بحوالہ(۱)) [illegible] روزہ "فرائیڈے اسپیشل" کراچی، ۴ مارچ ۲۰۰۵ء)
(بحوالہ(۲)) اردو بک ریویو نئی دہلی، مئی، جون ۲۰۰۵ء)

[illegible] صاحب کے لکھے چند جملے

[illegible] ان ہی کاموں پر سزا دی جاتی ہے، ہمارے ہاں انہی کاموں پر Ph.D. کی [illegible]

[illegible] "لوقات فاتحہ خوانی شام چار تا چھ بجے"

[illegible] پریس والا چھاپنے کی اجرت وصول کرتا ہے، جلد ساز اپنا [illegible] کو اس کی محنت کے صلے سے کیوں محروم کیا جائے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کی [illegible] نے کی اتنی مصنف نے اس کے لکھنے میں نہیں کی۔

[illegible] ہے وہ کسی نظم کے دو ہزار مصرعوں میں بھی بیان کر دی [illegible]

[illegible] کہ وہ ایک طاقتور عورت ہے۔ اس نے مجھے [illegible]

[illegible] یہ سوچ کر کہ جو گزر رہی ہے ایک ہی مرتبہ گزر [illegible]

[illegible] ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں اسی دور اور اسی [illegible]

[illegible] کر کے اس کی کھال میں بھس بھر دیا [illegible]

[illegible] جاتے ہیں اور یوں جھوٹ بولتے [illegible]

[illegible] اب اس [illegible]

[illegible]

مشفق خواجہ۔ نگینہ شخص رخصت ہوا

میں اس مضمون کا آغاز یہ کہہ کر کروں گا کہ مشفق خواجہ زندہ رہنے کے لیے پیدا ہوئے تھے ادب کے بڑے آدمی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

مشفق خواجہ جیسی نادر روزگار شخصیت کراچی میں ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء علم و ادب سے متعلق لاتعداد حضرات کو سوگوار کر کے رخصت ہو گئی۔ بہت کم ایسے ادیب، نقاد، محقق اور شاعر ہوتے ہیں جن کی رخصتی کا غم صحیح معنوں میں محسوس کیا جاتا ہے۔

مشفق خواجہ علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے بہت سے طالب علم باوجود اس کے کہ علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں خود نہ ادیب ہوتے ہیں اور نہ شاعر۔ یہ کسی بھی گھرانے کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اس کے یہاں دو نسلوں میں قابل ذکر عالم اور ادیب پیدا ہوں اور ان میدانوں میں اپنا نقش ثبت کریں۔

مشفق خواجہ نے اپنا سفر انجمن ترقی اردو سے شروع کیا جہاں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انہیں مخطوطات کے شعبے کی ذمہ داری عطا کی جس کے نتیجے میں بہت سے مخطوطات اور تحقیقی مقالات نے کتابی صورت اختیار کی اور تشنگان علم، ادب و تحقیق کو سیراب کیا۔ مشفق خواجہ اچھے شاعر تھے۔ "ابیات" ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چوں کہ وہ انتہائی وسیع المطالعہ شخص تھے اور قدرت نے انہیں زرخیز علمی و ادبی ذہن سے نوازا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنی کالم نگاری سے پوری ادبی دنیا کو متاثر کیا۔ لیکن یہ کالم نگاری ادق موضوعات سے متعلق نہیں تھی بلکہ طنز و مزاح اور فکاہیہ تحریروں پر مبنی تھی۔ وہ ادیبوں کو ان کی تحریروں اور انٹرویو اور ارشادات کے حوالے سے مزاح اور طنز کا نشانہ اس طرح بناتے تھے کہ مضروب کو بھی ضرب سے لطف کا مزا حاصل ہوتا تھا۔ ان کا اسلوب مزاح اور طنز ایک علیحدہ ہی طرز رکھتا تھا۔ جس زمانے میں وہ کراچی کے ایک اخبار میں یہ ہفتہ وار کالم تحریر کرتے تھے اس زمانے میں ہر شخص جمعہ کے دن "خامہ بگوش کے قلم سے" والا کالم پڑھنے کے لیے بے چین ہوتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اب کس کی باری ہے؟ مشفق خواجہ جملے میں سے مزاحیہ جملہ تراشنے کا فن جانتے ہیں جن میں سے دو متضاد مزاحیہ و طنزیہ صورت ہائے احوال کے امتزاج سے ایک ایسا منظر نامہ وجود میں آتا تھا جس سے کوئی بھی قاری محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ پاتا تھا۔ ان کے کالم کی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ معاندانہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ خامہ بگوش کے قلم سے "سخن در سخن" اور "سخن ہائے ناگفتنی" ناقابل فراموش ادبی سرمایہ ہے۔

[illegible] میں بھی انہوں نے اپنے لیے حسب معمول ایک نئی راہ نکالی تھی یعنی تحقیق کے ذریعہ حقیقت [illegible] سے کو کھولا جاتا تا کہ دوسرے اس سے مستفید ہوں اور اس خاص موضوع پر تحقیق کے دوسرے [illegible]۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ صرف اسی شخص کو تحقیق کا موضوع بنائیں [illegible] "غالب اور صفیر بلگرامی" "خوش معرکہ زیبا" (تذکرہ شعرا مصنفہ سعادت خان ناصر) [illegible] "اقبال" از احمد دین (اقبال پر پہلی کتاب جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی تھی پھر جلا [illegible] کا مقصد بھی ہے) "جائزہ مخطوطات اردو" "تحقیق نامہ" وہ انجمن ترقی اردو [illegible] کے علاوہ "سہ ماہی اردو" سے منسلک بھی رہے۔ وہ "سہ ماہی [illegible] "کلیات یگانہ" ہے جس پر آنے والے دنوں میں صحیح [illegible] ان کی عظیم ادبی حیثیت اور مرتبے کا صحیح تعین کریں [illegible] اردو زبان و ادب کی دیو مالائی شخصیت کے زیر تربیت [illegible] بڑی ذمہ داری سے انہیں اپنے [illegible]

[illegible] دور رہے۔ بہت [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] شہر اور قصبے میں [illegible] تھے انہیں [illegible] اور دوسرے ہی [illegible] آنے والے استفسارات کا [illegible] رہتے تھے۔ افسوس کہ اب [illegible] ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالی [illegible] کے حامل اشخاص [illegible]

[illegible] تھے [illegible] میں کتنا وہ دل [illegible] قابل ذکر [illegible] پاس پوری [illegible] حوصلہ افزائی [illegible] خود ہی خاموشی

سے نواز دیا کرتے تھے۔ وہ بے روزگار ادیبوں کے لیے روزگار کا بندوبست بھی خاموشی سے کرتے۔ ایسا لگتا تھا گویا ادب کی دنیا میں موجود افتادانِ خاک کو اوپر اٹھانے کا انہوں نے ذمہ لیا ہوا تھا۔ وہ بدلہ لینے کے قائل نہ تھے خاصے لوگ ان کے قریب آئے مگر تھوڑے دنوں بعد ان دوستوں کی کم ظرفی نے رنگ دکھایا اور پھر خواجہ صاحب سے دور ہوگئے اور خواجہ صاحب نے بھی انہیں بھلا دیا اس لیے انہیں ''زندگی مختصر ہے کام بہت'' والے مقولے کے تحت اس قسم کے جھگڑے پالنے کا شوق نہ تھا۔ ان سے جو بھی اپنی ذاتی کمزوری کے تحت دور ہوا اس نے اپنا ہی نقصان کیا۔

خواجہ صاحب ہر ہفتے اپنی علمی و ادبی محفل سجاتے تھے جس میں اہم لوگ شریک ہوتے تھے۔ وہ مہمان نواز شخص تھے۔ بھارت اور دوسرے ممالک سے آنے والے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی دعوت کرنا ان پر فرض تھا۔ انہوں نے ''تخلیقی ادب'' کا اجرا کیا تو اس کی دھوم مچ گئی حالاں کہ ''نقوش''، ''دیپ'' اور ''فنون'' کی موجودگی میں ایک نئے رسالے کا نقش جمانا امر محال تھا مگر وہ جذبے سے بھرپور اولوالعزم شخص تھے۔ انہوں نے جس سے ادبی تحریر کے لیے رابطہ کیا اس نے اسے اپنے لیے اعزاز گردانا۔ انہوں نے بغیر طلب کیے تحریروں کا معاوضہ پیش کیا انہوں نے میرے انگریزی ادب کے استاد اور معروف ناول نگار و نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی کی دونوں کتابوں ''ادبی تخلیق اور ناول'' اور ''قریب نظر'' کی بھرپور رائلٹی ادا کی جبکہ بڑے بڑے پبلشروں میں چند پبلشر کتابوں کا معاوضہ دینے میں پس و پیش کیا کرتے ہیں اور کتابوں کی فروخت پر لاکھوں روپے کماتے ہیں مگر یہ ایک دوسرا قصہ ہے۔

ان کی بذلہ سنجی پر ایک سے زیادہ کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ ایک مضمون میں ان کی شخصیت کا احاطہ نہیں ہو سکتا ایک ہی شخص ان پر کئی مضامین تخلیق کر سکتا ہے۔ وہ ہمہ جہت شخصیت تھے جس پر پاکستان بھارت اور دوسرے ممالک میں موجود اردو زبان و ادب سے متعلق حلقے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مسافر ایسے گئے ہیں کہ لوٹتے ہی نہیں
کھلے ہوئے ہیں ابھی تک گھروں کے دروازے

(بحوالہ: ''مخزن'' لاہور، شمارہ نمبر ۹، ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ

[illegible] ہوتے ہیں، بیٹھتے بولتے ہیں، ملتے جلتے ہیں مگر [illegible] ہیں اور ان کے بارے میں شعوری طور پر ہی سوچتے [illegible] بھی نظر نہیں آتے لیکن ان کے [illegible] دیکھنے کا تناظر بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ [illegible] ہوئے بھی نہ دیکھ رہا تھا۔ چند [illegible] ہو گیا۔ سارا دن عجیب بے [illegible]

[illegible]

[illegible]

تھے۔ ایسا انھیں ان کی تحقیقی معلومات، ادبی شخصیات کے بارے میں ٹھوس اطلاعات اور حقائق فراہم کرتی تھیں۔ اسی طرح ان کی تنقیدی نگاہ کتاب اور صاحب کتاب کی پرکھ کے لیے میزان کا کام کرتی تھی، ایسی میزان جسے انھوں نے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ مظفر علی سید کے مرتبہ کے کالموں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ "خامہ بگوش کے قلم سے"، "سخن ہائے ناگفتنی" اور "سخن در سخن"۔

ان کالموں کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک کردار استاد لاغر مراد آبادی کے نام سے تخلیق کیا، ایسا کردار جو دراصل ان ہی کا ہمزاد تھا مگر انھوں نے نقطہ افروزی کے لیے اسے گویا زبان خلق کا نقارہ خدا بنا دیا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

☆ "آج کل کتاب لکھنا اتنا آسان ہو گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کتاب کی جلد سازی ایک مشکل کام نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جلد سازی کے پیشے میں ناکام ہونے والے بھی کامیاب مصنف بن جاتے ہیں۔ مشکل کام اگر کوئی ہے تو وہ کتاب کا پڑھنا ہے، اس مشکل کام کو آسان بنانے کے لیے ہم نے ایک عرصے سے مطالعہ کتب کا شغل ترک کر رکھا ہے"۔ (سخن ہائے ناگفتنی)

☆ "اردو کے عام اخبارات تو اپنے اداریوں اور ادارتی صفحات کی وجہ سے مزاحیہ اخبار سمجھے جاتے ہیں لیکن لندن کے روزنامہ "جنگ" کو اپنے ادبی صفحہ کی بنا پر "اودھ پنچ" کے مقابلے پر رکھا جاتا ہے"۔ (لوح جہاں پہ حرف مکرر)

☆ "جس طرح نمک کے بغیر کھانا بے مزہ ہوتا ہے اسی طرح اگر بھائی فاروق کے کسی انٹرویو میں احمد فراز کا ذکر نہ ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ انٹرویو نہیں پڑھ رہے کشور ناہید کی کوئی نثری نظم پڑھ رہے ہیں"۔ (ایضاً)

☆ "اپنے متعلق جون ایلیا نے کہا ہے کہ میں ایک ناکام نقاد ہوں۔ گزارش ہے کہ اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہیے، جہاں اہل نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرتے ہیں، ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں"۔ (شاعری یا جنون شباب آور)

☆ "بعض کتابیں اگر شائع نہ ہوں تو اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں لیکن بعض ایسی کتابیں بھی ہوتی ہیں جو شائع ہو کر ضائع ہو جاتی ہیں"۔ (آپ بیتی یا آپ بیتی کی معذرت)

☆ "یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اردو ادب کی عزت افزائی کا سبب غزل گو شعراء ہیں یا وہ مقالہ نگار جو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیق کرتے ہیں۔ غزلوں کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ پی ایچ ڈی کے مقالے ہیں۔ یہ راز نہیں کھلتا کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیوں کہا جا رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے دیکھیے تو گمان گزرتا ہے جیسے غزلیں کہی جا رہی ہیں"۔ (بڑا شاعر چھوٹا آدمی)

☆ "ایک زمانہ تھا کہ مشاعروں میں ایسے شعر پڑھے جاتے تھے جنھیں سن کر چھتیں اڑ جاتی تھیں مگر

کرنے والے اور دوسروں کے دکھ درد میں شرکت کرنے والے اور اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کی مالی اور اخلاقی مدد کرنے والے انسان تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ نہ صلے کا لالچ اور نہ شہرت کی تمنا۔ درویشی اور لاتعلقی کے دعوے تو بھی کرتے ہیں مگر بہت کم ایسے اہل قلم ملیں گے جو اپنے عمل سے اپنے دعووں کی توثیق بھی کر سکتے ہوں۔ مشفق خواجہ نے بے داغ عمل سے صلہ، انعام اور شہرت کو مسترد کر دیا۔ بہت پہلے رائٹرز گلڈ کی جانب سے ان کی ایک کتاب کو انعام ملا تو انھوں نے یہ کہہ کر انعام لینے سے انکار کر دیا کہ میں صلہ یا انعام کے لیے نہیں لکھتا۔ اس سلسلے میں میں بھی ایک بات کا گواہ ہوں۔ جب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں میں نے ایم فل کی کلاس کو پڑھانا شروع کیا، نصاب ختم ہونے اور سالانہ امتحان کے بعد تھیسس لکھنے کا مرحلہ آیا تو میں نے انھیں خط لکھ کر بربنائے دوستی ان پر ایم فل کا تھیسس لکھوانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر انھوں نے مجھے سختی سے اس کام سے باز رہنے کو کہا، کہ بقول ان کے انھوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ ان پر تحقیقی مقالہ قلم بند کیا جائے۔ جامعات سے وابستہ اساتذہ اس بات کے شاہد ہیں کہ زندہ شخصیات پر ایم اے/ایم فل کی ڈگری کے حصول کے لیے تحقیقی مقالات کے لیے جب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آتا ہے تو ”زندہ“ شخصیات کیسے کیسے دباؤ اور سفارشوں سے خود پر مقالہ لکھوانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود ہی طالب علم کو مقالہ لکھ دیتے ہیں۔ ایسے میں مشفق خواجہ صاحب کے انکار کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خالد احمد نے ماہنامہ ”بیاض“ میں ان کا گوشہ شائع کرنے کی بات کی تو انھوں نے منع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب کسی بچہ نادان کی مانند شہرت کے کھلونوں کے لیے ہر دم مچلتا نہ رہے لیکن اگر بلا کوشش خود بخود پھل مل جائے تو انکار بھی نہ کرنا چاہیے لیکن مشفق خواجہ شہرت کے معاملے میں انکار کی منزل سر کر چکے تھے۔ اسی لیے عمر قلب مطمئن کے ساتھ بسر کی۔ اب یہ الگ بات کہ قلب مطمئن مریض بھی بن سکتا ہے۔ کھید مقدر اں دی!

میری ان کی دوستی کالم، دیباچہ، تبصرہ اور فلیپ کی سطح سے بہت بلند تھی۔ میں ان کے اسلوب کا رسیا تھا اور اچھے فقرے سے حظ اٹھاتا تھا خواہ ہدف میں ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لیے ہمارے تعلقات کی اساس باہمی خلوص اور محبت پر استوار رہی۔ اس ضمن میں ان کا ”جھکاؤ“ اور میرا ”جھکاؤ“ رخنہ اندازی کا باعث نہ بن سکے۔

میں طبعاً مجمع پسند نہیں۔ بھیڑ میں میرے اعصاب کشیدہ ہو جاتے ہیں، دوستوں کا ریوڑ پالنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ گنتی کے چند احباب ہیں اور ان ہی کے ساتھ مل کر خوش ہوتا ہوں۔ کراچی میں مشفق خواجہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور نسیم درانی کے ساتھ ہی زیادہ تر وقت کٹتا ہے۔

کراچی پہنچتے ہی میں انھیں فون کرتا۔

”فرمایئے“

یہ ان کا مخصوص انداز تھا، وہ مجھے کہتے تم نے فلاں دن خالی رکھنا ہے، نہ کسی طرح کی تقریب اور نہ

[illegible] ساتھ ان کے ہم زلف ذوالفقار مصطفیٰ۔ ہم سیدھے ساحل [illegible] انھیں علم تھا کہ میں سمندر سے کیسے مسحور ہو جاتا ہوں اس لیے اور کہیں جانے کا [illegible] ساحل پر گزارتے۔ کھانا بھی وہیں کھاتے اور پھر رات گئے وہ مجھے گھر پہنچا [illegible] سال بھر کی ادبی ڈائری گوش گزار کرتا۔ وہ مجھے کراچی کے [illegible] میرے لیے یہ ایک دن کراچی کے [illegible] کہ تم کراچی نہ آئے تو میرے لیے گویا یہ [illegible] دسمبر میں کراچی آ ہوتا [illegible]

[illegible] آئے۔ آج شام کلفٹن میں میری [illegible] ان سب سے ملاقات ہو [illegible]

[illegible] ہیں۔ رات کے بارہ [illegible] سوٹ اٹھایا [illegible]

[illegible] مستور صاحب [illegible] حضرات۔ یہ ایک [illegible]

[illegible] عجیب منظر تھا۔ [illegible] سمندر کی لہریں جو بند کمرہ کی [illegible] اور لمحات منجمد [illegible] لیکن اس رات کا [illegible] اس رات کو ضرور [illegible]

[illegible] شاندار [illegible] اس سے [illegible]

[illegible] زیادہ مزہ آتا [illegible] ”مشفق“

کہلوائے۔ کتنے ان کے فیض سے مقدمہ نگار بن گئے اور کتنے مقالہ نگار۔ ایسے حضرات کی فہرست خاصی طویل ہے۔

ایک مرتبہ کراچی گیا تو انہوں نے لاہور کے ایک نوجوان سے ملوایا جو کئی ماہ سے ان کے ہاں مقیم تھا اور کتب خانہ اور حضرت خواجہ دونوں سے کما حقہ انصاف فرما رہا تھا۔ خود میں نے ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے تھیسس لکھنے والے اپنے کئی طالب علموں کو ان کے پاس بھیجا اور کبھی ناکام واپس نہ آئے۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔ ہر وہ شخص جو کتابوں کا رسیا ہے اور محنت سے لائبریری بناتا ہے اس کے لیے کسی کو کتاب دینا آسان نہیں ہوتا اس لیے کہ ہمارے علم ناآشنا معاشرے میں کتاب واپس نہ کرنا ایک طرح کی شیخی سمجھا جاتا ہے اس حد تک کہ یاروں نے دوسروں کی کتابوں سے اپنی لائبریری تیار کر لی مگر خواجہ صاحب کا رویہ برعکس تھا۔ کتاب تو خیر یہ بھی نہ دیتے لیکن اس کی فوٹو کاپی فوراً مہیا کر دیتے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات کے مقابلے میں فوٹو سٹیٹ کے اخراجات کہیں زیادہ ہوں گے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ممالک کے سکالر ان کی لائبریری سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔

مشفق خواجہ صحبت اجنس سے الرجک تھے۔ اسی لیے ادیبوں اور ادیبوں کے اجتماعات، ادبی تقریبات، مشاعروں اور ضیافتوں سے خود کو محفوظ رکھا لیکن جنھیں وہ دوست سمجھتے تھے، جن سے پیار کرتے تھے یا جن کے علم، ذہانت یا شرافت کے قائل تھے ان کے لیے جی جان سے حاضر۔ وہ مجلسی انسان نہ تھے۔ جس مجلس میں ہوتے وہاں صرف وہی بولتے کہ علم کی بنیاد پر طنز کا بگھار لگانے میں ماہر تھے مگر وہ طنز برائے طنز نگار نہ تھے جیسا کہ میں نے اپنے ایک انٹرویو میں ان کے بارے میں یہ مصرع پڑھا تھا۔

ع۔ اسے جب سے ذوق شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

دراصل ان کا طنز ادب سے ان کی کمٹمنٹ کا مظہر تھا۔ وہ ادب اور ادیب کو جس بلند منصب پر دیکھنے کے خواہش مند تھے جب وہ اسے اس سطح سے نیچے گرا دیکھتے تو رہا نہ جاتا۔ ادب و نقد، شعر و شاعری اور علم و دانش کے بارے میں ان کے اپنے مخصوص تصورات تھے۔ لفظ کے بارے میں کیا خوب صورت بات کی۔

"لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح انہیں عزت بھی ملتی ہے اور ذلت بھی۔ کبھی یہ معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بلند مدارج تک پہنچ جاتے ہیں اور کبھی بلند مدارج سے گر کر معمولی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں.....“ (تاریخ باطنے نویسی)

لفظ تحریر کی اساس بنتا ہے اور تحریر کتاب کی۔ دیکھیے کتاب کے حوالے سے کیا کہتے ہیں۔

"کسے معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جن کتابوں کا شائع ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ان کا چرچا ہوگا اور جو کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں ان کے نام سے بھی کسی کی واقفیت نہ ہوگی۔ ایسی ایسی کتابوں کی رونمائیاں ہوتی ہیں جو اگر کسی مہذب

معاشرے میں شائع ہوں تو ان کے مصنف منہ چھپاتے پھریں مگر اب زمانہ ہی ایسا ہے کہ منہ چھپانے والے سر اٹھا کے چلتے ہیں کہ انہوں نے کتابیں شائع کر کے اپنا وقت اور پیسہ ضائع کیا“۔ (خامہ بگوش)

تو ان اٹھا دوک تھلن دوا یسے تھے اس کے اہداف:

اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

(بحوالہ ”مخزن“ لاہور، شمارہ نمبر ۹، ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ اپنے [illegible] ۱۹۸۵ء

پروفیسر محمد اقبال جاوید

اٹھ گیا ناوک فگن......

۲۱ فروری ۲۰۰۵ء دس بجے شب، کتابوں کی رفاقت میں زندگی بسر کرنے والا ایک قابل قدر محقق اور قابل تحسین مبصر، انتہائی خاموشی کے ساتھ جوار رحمت میں پہنچ گیا۔ عالم تنہائی میں خوش رہنے والا قبر کی تنہائیوں میں اتر گیا اور اس کے ساتھ ہی اخلاق و کردار کی شائستگی، قرطاس و قلم کی شگفتگی، فکر و خیال کی بالیدگی اور گفتار و رفتار کی سنجیدگی منوں مٹی میں چھپ گئی۔

کس کو خبر اس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی کتنے جنازے گئے ہیں آج

مشفق خواجہ کی تنقید میں شگفتگی کا بانکپن تھا اور ان کی شگفتگی میں نقد و نظر کی ایک ایسی کاٹ کہ زد میں آنے والا بھی، نہ صرف کیف اندوز ہوتا بلکہ لاشعوری طور پر اپنی اصلاح بھی کرتا چلا جاتا تھا کیونکہ ادب کے جس نقطۂ عروج پر بیان کی خوبیاں، ذہن کے تنقیدی زاویے اور قلم کی تعمیری شوخیاں یکجا ہو کر ایک معیاری لطافت بن جاتی ہیں وہ مزاح کہلاتا ہے۔ مشاہدے کی قوت اسے ابھارتی، سوچ کی سچائی اسے سنوارتی اور خیال کی رفعت اسے تیر نیم کش بنا دیتی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ ہیں: ''طنز و ظرافت آسانی سے ہاتھ آ جانے والے لیکن پر پیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی، دل لگی یا طعن و تشنیع کے نہیں آتی لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہیے؟ کتنا ہنسنا چاہیے؟ اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہیے؟ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے بعض اسی طرح ہنستے ہیں، ممکن ہے اسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو۔''

مشفق خواجہ میں تنقید کی ثقاہت و ثقالت، کالم نگاری کی فصاحت و لطافت اور شاعری کی نزاکت و نظافت کا ایک طرفہ امتزاج لو دے رہا تھا۔ ''تذکرہ خوش معرکہ'' ان کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کی تعارفی سطور، ان کے علمی رسوخ اور فکری پختگی کی آئینہ دار ہیں۔ اسی طرح ''کلیات یگانہ'' ان کی اس شاعرانہ وابستگی کا ایک واضح اظہار ہے جس کا رخ ان کے دو محترم اساتذہ نے متعین کیا تھا۔ میری مراد جناب سید محمد ابوالخیر کشفی اور جناب خلیق ابراہیم سے ہے۔ ''ابیات'' ان کی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا آئینہ ہے۔ جہاں تک ان کے شگفتہ کالموں کا تعلق ہے ان کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں جو میرے استاد گرامی قدر جناب مظفر علی سید کے حسن نظر کا حسین انتخاب ہیں۔ ان کے کالموں کے بیشتر جملے ایمائیت کا کمال

اور تغزل کا جمال لیے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ ''تغزل'' اس کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی تحریر میں فکری گداز بن کر [illegible] رمز و ایماء سے بال و پر لیتی اور دل کو گھائل کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کیفیت کا احاطہ کرنا ویسے ہی دشوار ہے جیسے رنگ کو کسی آہنگ میں ڈھالنا، خوشبو کو حواس میں مقید کرنا اور موج نور کو لفظوں میں زنجیر کرنا، [illegible] میں سے ہے، تغزل ایک غیر مرئی شے ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں [illegible] ہو سکتا ہے، ادراک و خرد مجبور ہیں، سرخوشی کا یہ کیف جہاں بھی ہوگا تغزل کہلائے گا، نثر و نظم کا کوئی [illegible]۔ مشفق خواجہ کے ہاں تغزل کے اس کیف کے ساتھ ساتھ دانش مندی اور دردمندی کی حلاوت ہے اور اس کے لیے ایک عمر کی ریاضت مطلوب ہے۔

ع رنگی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

[illegible] ہو تعلق پلکوں پہ شرر ہو اور رات سولی پر بسر ہو تب کہیں جا کر بستان گداز مہکتا ہے۔

کہاں زمانے کا ذہن پہنچا مرے تصور کے بانکپن تک
ہزار عالم گزر چکے ہیں شعور فن سے خلوص فن تک

یہ شعور فن اور خلوص فن کا اعجاز ہے کہ آج مشفق خواجہ کی وفات پر ایک دنیا نالہ بلب اور دست بدعا [illegible] ہے اور [illegible] ان کی علمی وجاہتوں، فکری رفعتوں اور قلمی شوخیوں کے حضور میں یوں سراپا اعتراف ہے:

[illegible] مشفق خواجہ کے پر مغز اور کاٹ دار جملے پڑھنے والوں کو عجیب طرح کا لطف دیتے تھے۔ (ڈاکٹر [illegible])

[illegible] میں ایک ایسی انجمن تھے جن سے گزشتہ چار عشروں کے دوران میں صد ہا ادیبوں نے [illegible] وہ اپنے وجود میں ایک مجسم انسائیکلوپیڈیا تھے۔ جن کے دماغ کی [illegible] (ڈاکٹر انور سدید)

[illegible] ایک ذاتی سانحہ ہے وہاں اردو تحقیق اور تنقید [illegible]

[illegible] ان کی گہری نظر تھی۔ (ڈاکٹر سید [illegible])

[illegible] ''ماڈل'' کی حیثیت رکھتا [illegible]

[illegible] بے حد [illegible]

[illegible] (ڈاکٹر عصمت

اللہ زاہد)

☆ انہیں مجھ سے جو شفقت اور محبت تھی اس سے محرومی کا کوئی مداوا نہیں۔ (ڈاکٹر تحسین فراقی)

☆ علم و ادب کا ایسا بے لوث اور بے غرض خدمت گزار ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

☆ مشفق خواجہ تحقیقی سرگرمیوں کا سدا بہار چشمہ تھے۔ ایک شخص دنیا سے اٹھ گیا مگر شخصیت نہیں اٹھی۔ تحقیق و تدوین میں بالخصوص اردو ادب کی دوسری اصناف میں بالعموم عہد ساز کارکردگی کا حوالہ قرار پائے۔ اس صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے مشفق خواجہ کو مشفق ادب کہنے کو جی چاہتا ہے۔ (جان کاشمیری)

☆ تحقیق اور تخلیق کے سارے رشتوں کو مربوط اور مضبوط کرنے والا ایک شخص شاید اس زمانے میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ (ڈاکٹر محمد اجمل نیازی)

☆ مرنا تو سب کو ہے لیکن میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ مشفق خواجہ بھی مر جائیں گے۔ ہم لوگ ساری عمر اپنی موت کے خوف میں گزار دیتے ہیں اور اپنے پیاروں کے بارے میں خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کرتے چنانچہ جب کبھی اس طرح کی کوئی خبر موصول ہوتی ہے تو ہمیں اندر سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ (عطاء الحق قاسمی)

یہ اعترافات ثبوت ہیں اس حقیقت کا کہ بطور کالم نگار مشفق خواجہ کی نیت، لفظ لفظ، راست رہی، دل آزاری سے ان کے قلم کو دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ ورنہ کہیں تو بیزاری کی جھلک ملتی۔ خود انہوں نے "خامہ بگوش کے قلم سے" کے دیباچے (عنوان غلط نامہ) میں لکھا تھا۔

"ہم نے جو کچھ لکھا ہے ہمیشہ نیک نیتی سے لکھا ہے مگر آج کل نیت کو کون دیکھتا ہے۔ صرف وہی دیکھا جاتا ہے جو کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لکھنے والے کو غلط سمجھا جائے اور اس کی تحریر کو درست"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پطرس بخاری کی شگفتہ نگاری کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "انہوں نے ہر جگہ ہر بات میں خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے۔ "جیسے صحرا کو مسکرا کے گلستان بنا دیا ہو.... بخاری ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں۔ ان کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے۔

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں، گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

ہنس ہنس کے مار ڈالنے کا گر، بخاری کو خوب آتا تھا۔ ظرافت اور ظرافت نگاری کی یہ معراج ہے۔"

رشید احمد صدیقی نے جن خصوصیات کی بنا پر پطرس بخاری کو سراہا ہے، کم و بیش ویسی ہی پہلودار

...یہاں مشفق خواجہ کی تحریروں میں بھی نمایاں ہیں۔ مضامین پطرس کا مختصر دیباچہ اور "خامہ بگوش کے قلم سے" کا قدرے طویل دیباچہ ایک نوع کی مماثلت رکھتے ہیں۔ اثر پذیری اور اثر اندازی کا لیکن دین فی الواقع ایک روح پرور معاملہ ہے۔ "نوائے وقت" کے کالم نگار تنویر حسین کے الفاظ ہیں۔

"شگفتہ تبصرہ نگاری میں مشفق خواجہ کے پیش رو پطرس بخاری تھے۔ مشفق خواجہ کے اس دنیا سے اٹھ جانے سے یہ روایت بھی ختم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ اب لوگ اچھی تعریفیں پسند کرنے لگے ہیں اور [illegible] کے آئینے میں اپنی پسندیدہ صورت دیکھتے ہیں۔"

مسائل حیات پر فکر کی ابتدائی منزل سنجیدگی ہے لیکن فکر و نظر کے ان مرحلوں میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب انسان کا فکر فلک رس، جذبات کی شدت سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس شدت کو خفیف سمجھ [illegible] اور یہ مقام تب آتا ہے جب سورج کے سامنے چراغ واضح ہو جاتا اور قطرے میں قلزم اور [illegible] صحرا دکھائی دیتا ہے۔

راز دار خوئے آدم کردہ اند
خندہ برنادان و دانا می زنم

[illegible] کی ایک شکل ہے مگر تنقید سے مراد کسی ادب پارے کی قدر و قیمت اور حیثیت و واقعیت کا [illegible] کے ساتھ ساتھ اصلاحی اور تعمیری پہلو بھی موجود ہے۔ طنز کا کمال ہے کہ اس [illegible] اور بصیرت و بصارت پر ہو اور وہ اشاروں میں اپنا کام کرے۔

مشفق خواجہ [illegible] جملوں سے تنقید کی سنجیدگی کو مزاح کی شگفتگی دینے کی کوشش کیا کرتے [illegible] ہر قلم کے بس کا روگ نہیں۔ کتابوں اور شخصیتوں کے بارے میں [illegible] انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔

[illegible] اس میں کوئی وجہ کارفرما ہوتی ہے اگر کسی کتاب میں مجھے [illegible] اس کا ذاتیات سے کوئی تعلق نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] تحسین طلبی [illegible]

[illegible]

اسی لیے آج کا ادیب شاعر (حکم ہمیشہ اکثریت پر لگایا جاتا ہے) غلطیوں کی نشاندہی برداشت نہیں کرتا اور اس نوع کی تنقید کو تنقیص تصور کیا جاتا ہے کہ دل خوشامد کے عادی ہو چکے ہیں، یہی باعث ہے اس امر کا کہ مشفق خواجہ کے تبصروں کو بعض ناقدین نے "تضحیکی، استہزائی اور تحقیری مزاج" قرار دیا اور ان کے اسلوب نگارش کو "معاندانہ، سفاکانہ اور جارحانہ" سمجھا گیا نیز کہا گیا کہ اپنے ہوں یا بیگانے "انہیں زخم لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

بہرکیف اب مشفق خواجہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ اب وہ اس بارگاہ میں ہیں جہاں اعمال کا حساب اور احتساب، نیتوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اب ہم سب کو، سب کچھ بھول کر، جانے والے کو مغفرت کی دعا کے ساتھ یاد کرنا اور یاد رکھنا چاہیے کہ جانے والے کا تو محض بہانہ ہے، دعا تو ہم خود اپنی مغفرت کے لیے مانگ رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا دین، ذات کے ساتھ کائنات کو لے کر چلتا ہے۔ جناب مشفق خواجہ کی ذات میرے لیے بالواسطہ کئی اعتبار سے محترم رہی ہے۔

☆ اپنے شگوفوں کی طرح چٹکتے اور گلوں کی طرح مسکراتے جملوں کی بنا پر کہ وہ جملے ذہن کو مسرت اور نظر کو وسعت عطا کرتے ہیں نیز مصرعوں کی طرح ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆ اپنے اجلے دل اور روشن دماغ کی وجہ سے کہ ایسے عطیات کسی کسی کو ارزانی ہوتے ہیں۔

☆ اس لیے بھی کہ ان کی بذلہ سنجی میں سنجیدگی کی شان، ان کی حاضر جوابی میں انفرادیت کی آن اور ان کی برجستہ نویسی میں نشاط روح کا سامان حرف حرف ضو دیتا ہے۔

☆ یوں بھی کہ ان کے ہاں تحقیق اور تخلیق کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

☆ اس باعث بھی کہ وہ اس عہد خود سپاس میں، ستائش کی تمنا اور صلے سے بے پروا ہو کر، گوشہ گمنامی میں مصروف عمل رہے جب کہ ان کے گرد و پیش، اکثریت جلوت کی ہوس میں پاگلوں کی طرح سرگرداں تھی۔

☆ اس وجہ سے بھی کہ ان کی بات میں وزن بھی ہوتا تھا اور وقعت بھی، وقار بھی ہوتا تھا اور اعتبار بھی۔

☆ اس لیے بھی کہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ انسانیت کے تقاضے، فن اور فنکار کے تقاضوں سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتے ہیں اور انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

☆ وہ کچھ یوں بھی دل میں بستے ہیں کہ انہوں نے مجھ جیسے کج مج رقم کو غائبانہ کئی بار یاد فرمایا۔ انہوں نے جناب ارشد میر مرحوم کی وساطت سے، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے ادبی مجلّہ "مہک" کا گوجرانوالہ نمبر طلب فرمایا۔ قبل ازیں میری ادارت میں شائع ہونے والے "مہک" کے اقبال نمبر اور سیرت نمبر غالباً ارشد میر ہی مرحوم کے ذریعہ ان تک پہنچ چکے تھے۔ وفات سے کچھ دن پہلے جناب ضیاء اللہ کھوکھر (مہتمم عبدالمجید کھوکھر لائبریری گوجرانوالہ) انہیں ملے انہوں نے میری تالیف "مضامین شورش" کے بارے میں تحسینی کلمات کے ساتھ مجھے یاد کیا۔

☆ سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے دو عظیم المرتبت استاد، ان کی عظمتوں کے معترف رہے اور مشفق خواجہ کے لیے ان کی محبتیں، احترام کے گرد گھومتی رہیں۔ میری مراد جناب مظفر علی سید مرحوم اور ڈاکٹر وحید قریشی سے ہے۔ مظفر علی سید مرحوم ایسے "تابندہ نظر نقاد" نے ان کی تحریروں کے انتخاب کو اپنے لیے وجہ ناز سمجھا اور محنت کے ساتھ محبت کا حق ادا کیا۔ جناب ڈاکٹر وحید قریشی، بستر علالت (اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے نوازیں) پر ان کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو بھی رہے اور ان کی ادبی وجاہتوں کے ثنا خواں بھی، ورنہ ہم عصر، ایک دوسرے کی عظمتوں کا اعتراف کم کم کیا کرتے ہیں کہ "اعتراف عظمت کے لیے بھی باعظمت انسان ہونا ضروری ہے۔" ...... اور یہ میرے دونوں اساتذہ کرام کی شخصی بڑائی اور قلبی اخلاص ہے کہ انہوں نے مشفق خواجہ کو کھلے دل وسیع الفاظ کے ساتھ خراج تحسین اور خراج محبت پیش کیا۔ ویسے ہی جیسے رشید احمد صدیقی نے پطرس بخاری کو، ان کی وفات کے بعد، دل کی ساری محبتوں کو قلم کی نوک پر سمیٹ کر یاد کیا تھا۔

حق یہ ہے کہ مشفق خواجہ ایک سچے فنکار تھے۔ ان کی تحریروں میں جذبات کی صداقت، احساس کی [illegible] اور [illegible] کی نفاست جلوہ گر تھی اور باتوں باتوں میں قارئین کے ذہن کی گرہیں کھلتی چلی جاتی تھیں [illegible] سے نکھرتا اور زندگی، ادب سے سنورتی ہے۔ "وہ تحقیق کے ذریعے دوسروں کا اور شاعری [illegible] کا سراغ لگانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔" ان کے دو شعر ہیں۔

کیا بات ہے پھرتے ہو پریشاں کئی دن سے
اے مشفق من سلمہ اللہ تعالیٰ

[illegible] ہو سدا شعلہ بجاں گوشے میں اپنے
[illegible] زہر غم ہستی کا پیالا

[illegible] مسرتوں اور تلخیوں کا ایک زیرک ناظر ہوتا ہے، اس کے [illegible] ہوتا ہے۔ ہنسی سنگتے ماحول کا "ری ایکشن" [illegible] ہے۔ انور مسعود کا شعر ہے۔

[illegible] تیرے
[illegible] پیچھے

[illegible]

[illegible]

چلتے پھرتے نظر آتے رہیں۔"
ہمیں بھی مشفق خواجہ کو اپنی خوشگوار یادوں کے ذریعے زندہ رکھنا ہے اور ہمارے ہاں زندگی ختم ہی کب ہوتی ہے کہ۔

ع۔ طول محشر بھی ہے جزو داستان زندگی

موت برحق بھی ہے اور بروقت بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی کام بے وقت نہیں ہوتا اور ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اچھا ہی ہوا کہ یہ خامہ بگوش اور گوشہ گیر، بروقت گوشہ لحد میں جا مقیم ہوا اور یہ وہ مقام ہے۔

جہاں آستیوں میں خنجر نہیں
جہاں آدمی زادہ اژدر نہیں
نہ واں کینہ پرور کوئی اہل ہوش
نہ واں کوئی گندم نما جو فروش
نہ شمعوں سے چلتی ہوا کو ستیز
نہ کشتی کناروں پہ طوفان خیز
وہ جاتا رہا ہوش و مستی سے دور
مہذب درندوں کی بستی سے دور

لمحہ موجود میں زبان اور دل کی دورنگی بڑی سرعت سے رنگ لا رہی ہے اور وہ اس دورنگی سے بچ بچا کر وہاں چلے گئے جہاں نہ مداہنت ہے نہ مخالفت، نہ خود سپاسی ہے نہ سپاس طلبی، ہر شخص اپنے ہی روبرو ہے جبکہ اس دنیائے آب و گل میں اپنے آپ کو، شہادت کے لیے، اپنے ہی مقابل لانا، ایک کٹھن کام ہے۔ وہ یہاں بھی زاویہ عافیت میں رہے اور بفضل خدا وہاں بھی سکون سے ہوں گے، غالباً غالب کا شعر ہے۔

ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

بحوالہ سہ ماہی "قرطاس" گوجرانوالہ (اپریل۔ جون ۲۰۰۵ء)

ایک بڑے محقق اور مزاح نگار کی رخصت

مشفق خواجہ اور میرا ساتھ کم و بیش 52 برس کا ہے۔ 50ء یا 51ء میں خط و کتابت کے ذریعے رابطہ ہوا۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید سے لاہور میں میری دوستی 1954ء میں ہوئی۔ قیوم نظر مرحوم نے [illegible] کرایا تھا اور خواجہ صاحب ان کے ساتھ اے جی آفس میں ملازم تھے۔ یہ دوستی بھی چلتی رہی۔ خواجہ [illegible] عالم آدمی تھے۔ اسلامیات کے علاوہ انہیں انگریزی پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ شیخ محمد اشرف نے مولانا ظفر علی خان کا ترجمہ "الفاروق" از شبلی چھاپا تو زبان پر نظر ثانی خواجہ عبدالوحید مرحوم نے کی۔ یہ [illegible] بات ہے کہ باپ بیٹا دونوں سے میری دوستی رہی اور دس برس تک پتہ نہ چلا کہ دونوں کا رشتہ باپ بیٹے کا ہے۔ اتفاقاً مجھے کراچی جانا ہوا مشفق خواجہ کے ہاں قیام رہا اور میں نے ان سے کہا کہ میرے ایک [illegible] خواجہ عبدالوحید یہاں رہتے ہیں ان سے مجھے ملوا دیجئے۔ مشفق خواجہ ہنس پڑے اور بتایا کہ وہ تو [illegible] والد صاحب ہیں۔ اسی سے یہ پول کھلا کہ خطوں میں "الاسلام" کے جس منتظر کا سلام مجھے بطور [illegible] وہ یہی مشفق خواجہ ہیں۔

مشفق خواجہ [illegible] شاعر بھی تھے اور ان کا ایک مجموعہ "ابیات" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے لیکن [illegible] محقق کی ہے۔ خواجہ کے انتقال سے پاکستان ایک بہت بڑے محقق سے محروم ہو گیا [illegible] نگاری تھی۔ وہ "خامہ بگوش" کے نام سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے اور تین [illegible] اس وقت بھی چھ سات کتابیں زیر ترتیب و تدوین تھیں۔ آخری [illegible] جو 600 صفحات پر مشتمل ہے اور اس وقت [illegible] ہر دوسرے تیسرے دن بات چیت [illegible] بہت خفیف آواز میں جواب دیا۔ میں [illegible] سے مبتلا ہوں اور بہت سردی [illegible] جلد ہسپتال جائیں۔ غالباً اس بجے [illegible] پھر وہ ہوش میں [illegible]

([illegible] ۲۰۰۵ء)
([illegible] ۲۰۰۵ء)

مشفق انسان، لاجواب محقق

22 فروری کی صبح کو اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر بے حد صدمہ ہوا کہ مشفق خواجہ کل رات دس بجے کراچی کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئے۔ اگرچہ یہ خبر میرے لیے اتنی اچانک بھی نہیں تھی پھر بھی میں کسی معجزے کا منتظر تھا اور دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ خواجہ صاحب اپنے مداحین کو چھوڑ کر یوں دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ 21 فروری کی صبح کو فیصل آباد سے میرے عزیز دوست ڈاکٹر انور محمود خالد نے فون پر اطلاع دی تھی کہ خواجہ صاحب بے ہوش ہیں اور ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

چند سال پہلے خواجہ صاحب دل کے دورے کے ایک شدید حملے سے بمشکل صحت یاب ہوئے تھے۔ اس کے چند ماہ بعد وہ لاہور آئے اور فلیٹیز میں قیام پذیر ہوئے۔ وہ لاہور آتے تو عموماً فلیٹیز ہی میں ٹھہرتے تھے جہاں ان سے ملاقات کے لیے ادبی، تعلیمی اور تحقیقی حلقوں کے لوگ جایا کرتے تھے۔ میں بھی حاضر ہوا۔ ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے قدرے بے پروائی سے کہا کہ فشارِ خون اور ذیابیطس کے علاوہ میرے گردے پچاس فی صد تک کام کرنا چھوڑ چکے ہیں۔ آخری چند برسوں میں وہ خورد و نوش کے معاملے میں بے حد محتاط ہو گئے تھے۔ نوشیدنی اشیاء میں چائے اور سگریٹ کا شوق پال رکھا تھا اور ان کے استعمال میں بھی راہِ اعتدال اختیار کر لی تھی۔ سب دوستوں کو اس بات کی بڑی تشویش تھی کہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو ان کے انتہائی نادر ذخیرہ مخطوطات و کتب و جرائد کا کیا بنے گا؟ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کتنے نادر شخصی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں۔ جب اس بات کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے وصیت کر دی ہے کہ میرا کتب خانہ ہمدرد یونیورسٹی کو دے دیا جائے۔ ناظم آباد کراچی میں ان کے گھر کے تمام کمروں میں فرش سے چھت تک کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ان دنوں صرف باورچی خانہ کتابوں سے خالی تھا۔ سنا ہے کہ بعد میں اس کا کچھ حصہ بھی کتابوں کے تصرف میں آ گیا تھا۔ ان کے ذخیرہ کتب میں تقریباً چالیس ہزار کتابیں اور ساٹھ ہزار رسائل اور جرائد تھے۔ کتابیں اور رسالے بڑی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے اور کسی کتاب یا رسالے کو تلاش کرنے میں انہیں بمشکل چند منٹ لگتے تھے۔ وہ تحقیق کرنے والوں کی مدد کرنے میں بڑے دریا دل تھے۔ میں نے خود بھی ان سے بعض نادر چیزیں طلب کیں اور متعدد طلبہ کو بھی اس غرض سے ان کے پاس بھجوایا۔ وہ طالبانِ تحقیق کی ہر ممکن مدد کرتے تھے اور ساتھ ہی پرتکلف کھانا کھلاتے اور چائے پلاتے تھے۔ ان کے پاس پاکستان اور ہندوستان سے چھپنے والی کتابیں برابر پہنچتی رہتی تھیں اور اگر کوئی کتاب نہیں پہنچتی تھی تو بہ تعجیل

اسے حاصل کر لیتے تھے۔ چند سال سے تو کتابیں خود بخود ان کے پاس پہنچنے لگی تھیں۔

خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

ان کا علم مستحضر تھا۔ میں نے نشستوں میں جب بھی ان سے کچھ پوچھا، انہوں نے اکثر بلاتامل جواب دیا اور باقاعدہ اعداد و شمار کے ساتھ اپنا استدلال مکمل کیا۔ جب بھی فون پر ان سے معلومات طلب کیں انہوں نے فوراً مہیا کر دیں۔ بعض اوقات چند منٹ کی مہلت مانگتے تھے اور پانچ منٹ میں مطلوبہ معلومات مہیا کر دیتے تھے۔

مشفق خواجہ 19 دسمبر 1935ء کو لاہور کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید علامہ اقبال کے قریبی لوگوں میں تھے اور علامہ ان پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ اقبال اپنے اکثر [illegible] وغیرہ ان سے لکھواتے۔ طریق کار یہ تھا کہ اقبال خواجہ عبدالوحید کو مختصر لفظوں میں بتا دیتے کہ اس قسم کا کوئی بیان تیار کر دو اور خواجہ صاحب ان کے حسبِ منشا تحریر لکھ لاتے جس میں اقبال معمولی قطع و برید کر کے پریس کو جاری کر دیتے۔ خواجہ عبدالوحید تقریباً بیس برس تک یہ خدمات انجام دیتے رہے لیکن انہوں نے اس تعلق سے کسی قسم کی منفعت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ اردو کی مشہور لغت "جامع اللغات" کے مرتب خواجہ عبدالمجید مشفق خواجہ کے چچا تھے۔ ان کے ایک اور قریبی عزیز نامور محقق خواجہ عبدالرشید تھے [illegible] ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر بھی رہے۔ اقبال پر پہلی کتاب کے مصنف احمد دین سے بھی [illegible] تھی۔ مشہور صاحبِ اسلوب ماہرِ موسیقی خواجہ خورشید انور بھی ان کے عزیزوں میں تھے۔ [illegible] لاہور کے کشمیریوں کا ایک انتہائی اہم خاندان تھا لیکن خواجہ صاحب کبھی پدرم سلطان [illegible] ہوئے۔ کبھی اپنے خاندان کا حوالہ نہیں دیا، بزرگوں کے نام سے فائدہ اٹھانا تو [illegible]

[illegible] ان کے متعدد عزیز و اقارب کراچی میں تھے۔ [illegible] ایم اے (اردو) کے امتحان میں کامیابی [illegible] اس دوران انہیں مولوی عبدالحق کا قرب حاصل [illegible] انجمن ترقی اردو کراچی کے صدر دفتر [illegible] سال انجمن سے وابستہ رہے۔ دیگر [illegible] بھی کام کرتے رہے۔ پھر [illegible] ہمہ تن مستغرق ہو [illegible] ہفتے میں ایک دن [illegible] کچھ مالی [illegible] تھے۔

1980ء میں انہوں نے "تحقیقی ادب" کے نام سے ایک ادبی جریدہ شائع کرنے کا آغاز کیا۔ وقفوں وقفوں میں جس کے پانچ شمارے ہی چھپ سکے لیکن ان کا معیار انتہائی اعلیٰ اور دوسرے جرائد کے لیے قابل تقلید ہے۔

خواجہ صاحب بیک وقت بہت سے تحقیقی منصوبوں پر کام کر رہے تھے۔ تقریباً پینتیس سال سے ان کا یہ معمول تھا۔ ان میں سے بیشتر منصوبے یقیناً نامکمل رہ گئے ہوں گے۔ مشکل ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ منصوبے اب کبھی تکمیل پا سکیں گے کیونکہ دنیا میں کوئی دوسرا مشفق خواجہ موجود نہیں جو ان منصوبوں کو اتنی تحقیقی گہرائی اور صحت کے ساتھ مکمل کر سکے۔

اب تک ان کا جو تحقیقی کام سامنے آیا ہے ان میں جائزہ مخطوطات اردو (1979ء) بہت اہم ہے۔ اس کام کو وہ کئی جلدوں میں مکمل کرنا چاہتے تھے اور بہت سا بنیادی کام Spade work کر چکے تھے لیکن اس کی ایک ہی جلد منظر عام پر آ سکی۔ ساڑھے بارہ سو صفحات کی اس جلد میں دو سو نادر مخطوطات کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ اردو مخطوطات "پاکستان کے مختلف سرکاری، غیر سرکاری اور ذاتی کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں"۔ یہ روایتی فہرست سازی کی کتاب نہیں ہے۔ اس میں مصنفین اور ان کے تصنیفی کاموں کے بارے میں انتہائی اہم معلومات بڑی عرق ریزی سے جمع کر کے اور مختلف اختلافی آرا کی چھان پھٹک کے بعد بڑے سلیقے سے ترتیب دی گئی ہیں۔ پاکستان میں تحقیق و تدوین کا فن قریب المرگ ہے۔ یونیورسٹیاں محض روپے اکٹھے کرنے کے لیے تحقیقی سندات بانٹ رہی ہیں۔ بیشتر ڈگری یافتہ اساتذہ تحقیق و تدوین کی نگرانی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں لیکن وہ تحقیق کے فن کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ تدوین کے کام کی اہلیت بمشکل ہزار میں سے ایک استاد کو حاصل ہے۔ یہ نام نہاد کسی طالب علم کی رہنمائی کا فریضہ کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔

ع۔ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

اگر فن تحقیق و تدوین کا جامعات میں احیاء مقصود ہے تو یہ کتاب تحقیق کی رہنمائی کرنے والے اساتذہ کو سبقاً سبقاً پڑھائی جانی چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس ریاضت کے بعد انہیں تحقیق و تدوین کی شد بد حاصل ہو جائے۔

تذکرہ خوش معرکہ زیبا (از سعادت خاں ناصر) کی دو جلدوں میں تدوین و اشاعت خواجہ صاحب کا ایک اور اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اردو شعراء کے بارے میں بہت سے تذکرے لکھے گئے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آج بہت سے مشہور شعراء کے بارے میں بنیادی معلومات سے بھی محروم ہوتے۔ خواجہ صاحب کے تذکروں سے خصوصی لگاؤ تھا اور تمام مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تذکرے ان کے کتب خانے کی زینت تھے۔ غیر مطبوعہ تذکروں کی عکسی نقول انہوں نے بڑی دقتیں اٹھا کر اور بصرف زر کثیر حاصل کی تھیں۔ زیر نظر تذکرہ غیر مطبوعہ تھا جس کی عکسی نقول خواجہ صاحب نے پٹنہ، لکھنؤ اور علی گڑھ سے حاصل کیں اور انجمن ترقی

اردو کراچی کے مخطوطے کے ساتھ تقابل کر کے یہ کام مکمل کیا جو بارہ سو سے زائد صفحات میں منضبط ہوا۔ اس کے صفحے صفحے سے مرتب کی محنت، تلاش اور دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب کے مطبوعہ تحقیقی کاموں میں تازہ ترین اور معرکہ آرا کام "کلیات یگانہ" کی تدوین ہے۔ یہ عظیم کارنامہ تقریباً ساڑھے نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یاس یگانہ چنگیزی اردو غزل اور رباعی کے انتہائی اہم شاعر تھے۔ ان کے معاصرین میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کو جو شہرت حاصل ہوئی یگانہ اس سے محروم رہے جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان میں اعتدال و توازن ناپید تھا۔ غالب شکنی کی وجہ سے انہوں نے بہت سے شعراء اور ناقدین کو اپنا دشمن بنا لیا۔ ان کے نظریات و عقائد بھی لوگوں کو بہت ناگوار گزرتے تھے لیکن یگانہ کے کلام کا توجہ سے مطالعہ کرنے پر [illegible] پہنچا ہوں کہ وہ انتہائی منفرد اور اہم غزل گو ہیں اور میر و غالب کے بعد پوری غزل کی تاریخ میں [illegible] اہم ہیں لیکن چونکہ ان کے ہاں غیر روایتی مضامین اور اسالیب کے تجربات بکثرت ہیں اس لیے ان کے کلام کو سمجھنا اور تحسین کرنا آسان نہیں۔

مشفق خواجہ نے "کلیات یگانہ" کم و بیش پچیس تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد تیار کی۔ اس میں [illegible] کلام جمع کیا گیا ہے خواہ وہ مجموعوں کی شکل میں چھپ چکا تھا، غیر مطبوعہ شکل میں عزیز و اقارب [illegible] رسائل میں بکھرا ہوا تھا۔ اس مجموعے کے مقدمے، دیباچے، ضمیمے، حواشی اور تعلیقات [illegible] اور قابل قدر ہیں۔ کلیات متن کی اغلاط سے مبرا ہے۔ یہ کلیات تدوین کا کام کرنے [illegible] نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

[illegible] ایک مختصر تالیف ہے لیکن مطالعہ غالب کے لیے ایک اہم کڑی ہے۔

[illegible] تحقیقی اور تنقیدی کام مضامین و مقالات کی شکل میں مختلف رسائل و جرائد [illegible] اپنے تحقیقی مضامین میں سے چند اہم تحریروں کو انہوں نے [illegible] ہے لیکن ان کی تحقیقی و تنقیدی تحریروں سے کئی اور [illegible]

[illegible] بن جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ جس مزاج بھی [illegible] ظریف، طناز اور نکتہ سنج شخصیت کی [illegible] ہوتی تھی۔ وہ بے ساختہ بات [illegible] کوئی"۔ لوگوں کے [illegible] سے آگاہ تھے اور [illegible] لکھتے تھے جس میں [illegible] ہوتی تھیں جو یہ

صیغۂ راز کی ذیل میں آتی ہیں۔ بڑے بڑے بزرگ اہل قلم کے عشقیہ خطوط سے لے کر ان کی دیگر آلائشوں کے بارے میں ناقابل تردید تحریریں ان کے پاس بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ ان کے انتقال سے بہت سے بزرگوں کی کمزوریوں پر قدرت نے پردہ ڈال دیا ہے۔

وہ طنز و ظرافت سے گفتگو ہی میں کام نہیں لیتے تھے قلم برداشتہ نہایت عمدہ مزاح لکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ مختلف ناموں سے مختلف اخبارات و رسائل میں کالم لکھتے تھے۔ ان کا ایک مشہور قلمی نام "خامہ بگوش" تھا۔ اس نام سے ان کے بے شمار کالم ہفت روزہ تکبیر کراچی میں شائع ہوئے ہیں جن کا انتخاب مظفر علی سید نے تین جلدوں میں کیا ہے۔ پہلی جلد "خامہ بگوش کے قلم سے" کئی سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ مزید دو جلدیں 2004ء میں "سخن ہائے ناگفتنی" اور "سخن در سخن" کے عنوانات سے حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں بے ساختہ مزاح کی اعلیٰ پائے کی تصانیف ہیں اور میرے نزدیک ابن انشاء کی مزاحیہ تحریروں کے ہم پلہ ہیں۔

خواجہ صاحب بہت اچھے اور پختہ گو شاعر بھی تھے۔ "ابیات" کے نام سے ان کا مجموعہ کلام (1978ء) میں شائع ہوا تھا۔ عابد علی عابد جیسے استاد شاعر ان کی شاعری کے مداح تھے اور ان کا کلام مجلہ "صحیفہ" میں اکثر شائع کیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب کا بہت سا تحقیقی کام نامکمل رہ گیا ہے لیکن بعض منصوبے وہ تقریباً مکمل کر چکے تھے خصوصاً اپنے والد کی ڈائری تکمیل پا چکی تھی جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور جب یہ شائع ہوگی تو تحریک پاکستان اور علامہ اقبال کے حوالے سے ایک نادر دستاویز ہوگی۔ ان کے متعدد نامکمل منصوبے جس شکل میں بھی ہوں، انھیں بھی لازماً شائع ہونا چاہیے۔ ان میں سے کئی کتابیں تقریباً مکمل ہیں اور ان کی اشاعت سے بھی ہماری دنیائے تحقیق بہت استفادہ کرے گی۔ انھوں نے اپنی ذاتی کتابوں پر دوران مطالعہ جو حواشی لکھے ہیں یا مرتبین کی اغلاط کی طرف اشارے کیے ہیں ان کی اہمیت بھی کم نہیں۔ ان سے بھی رہروان تحقیق بہت کچھ سیکھ سکیں گے۔

بظاہر خواجہ صاحب کا تحقیقی کام کم دکھائی دیتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ صرف "جائزہ مخطوطات اردو" ہی ایسا کام ہے جو انھیں اردو تحقیق کی تاریخ میں زندہ رکھے گا۔ "خوش معرکہ زیبا" اور "کلیات یگانہ" تدوین کے میدان میں ماڈل کی حیثیت سے یاد رکھی جائیں گی۔ ان کا بکھرا ہوا تحقیقی اور تنقیدی کام جب یکجا ہوگا اس میں بھی اردو ادب کے بہت سے تاریک گوشے روشن ہوں گے۔ ان کے مزاحیہ کالم بھی بھلائے نہیں جا سکیں گے اور انھیں ایک اچھے طنز نگار کی حیثیت سے برابر پڑھا جائے گا۔

خواجہ صاحب کا تحقیقی کام کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے کم ہے لیکن ہزارہا صفحات پر مشتمل ہے جس میں تکرار سرے سے موجود نہیں۔ وہ بلاشبہ اپنے اس کام کی وجہ سے گنتی کے چند اعلیٰ محققین کی صف میں بآسانی شامل کیے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں ہوتا کہ اہم کام کرنے والا شخص کتابوں کے انبار لگا دے۔

مولوی محمد شفیع کی کتابیں تعداد میں بہت کم ہیں اس کے باوجود وہ اول درجے کے محقق مانے جاتے ہیں۔ ہمارے بعض محققین کو صرف یہ فن آتا ہے کہ ایک کتاب لکھ کر اس میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے اور نیا نام رکھ کر اسے دس کتابوں میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے! اگر بڑا محقق بننے کے لیے یہی ہنرمندی کافی ہے تو خواجہ صاحب اس فن سے بالکل نابلد تھے۔ ہمارے بعض محقق اپنے نام پر اتنے فریفتہ ہیں کہ ایک ایک کتاب میں اپنا نام سیکڑوں جگہ لکھ ڈالتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے تو تیس برس کی محنت کے باوجود کلیات یگانہ کے ٹائٹل پر اپنا نام تک نہیں لکھا۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ خواجہ صاحب نے مجلس آرائی میں وقت صرف کیا۔ وہ ہر روز صبح سے شام تک کام کرتے تھے۔ تحقیق و تدوین میں بعض اوقات ایک معمولی گتھی کو سلجھانے کے لیے کئی کئی دن صرف ہو جاتے ہیں لیکن اس بات کو وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو کتاب سازی کو معیار پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنی تمام تر توجہ دولت اور ہوس شہرت کے باوجود ڈھنگ کی ایک کتاب نہیں لکھ پاتے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کتب خانوں کے کارڈوں میں ایک شخص کے نام سے سو سو پچاس پچاس کتابیں موجود ہیں مگر آج ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا اور یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایک کتاب سے زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔

(بحوالہ: "سہ ماہی معاصر انٹرنیشنل" جلد ۵، شمارہ نمبر ۵، ۶، جنوری تا جون ۲۰۰۵ء)

ہمارے خواجہ صاحب!

لقمہ میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ خواجہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ ہیرا بھی ہم سے چھن گیا۔ وہ مجھ سے خواجہ صاحب کے نمبر پوچھ رہے تھے، برسوں سے زبانی یاد نمبر حافظے کی لوح سے اچانک مٹ چکے تھے۔ سچ پوچھیے تو سلیم احمد کے انتقال کے بعد یا تو ابن الحسن کی موت پر ایسے دکھ کا احساس ہوا یا اب مشفق خواجہ کے انتقال پر۔ اس فقرے کا مطلب وہی سمجھ سکتا ہے جو ان حضرات سے میرے تعلقات سے واقف ہو۔ یوں سمجھیے کہ اردو ادب کا حافظہ اس سے چھن گیا ہے۔ ذاتی طور پر میرا دکھ یہ ہے کہ اب کوئی شخص ایسا نہیں جسے جب بھی کسی مشکل کے لیے فون کیا جائے، اس کے پاس اس کا جواب ہو۔ ایک مخصوص انداز میں "فرمایئے" کہہ کر وہ فون اٹھاتے اور فوراً ہی آپ کی مراد بر آتی یا زیادہ سے زیادہ یہ کہتے فلاں کتاب میں یہ بات موجود ہے، ابھی نکال کر بتاتا ہوں۔ اب کوئی شخص ایسا نہیں جسے اتنا کچھ یوں مستحضر ہو۔ جنازے میں ہمیں یہی بات محمد علی صدیقی نے کہی اور ایسا ہی غازی صلاح الدین کہہ رہے تھے۔ ان کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا۔ وہ اپنے خیالات کے بہت پکے تھے، مگر ایسی پیاری شخصیت تھے کہ ان کے چاہنے والوں میں ہر حلقے کے لوگ شامل تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں جسارت میں لکھا جب یہ بہت بڑا جرم تھا۔ لیفٹ اور رائٹ کی لڑائی میں کھلم کھلا رائٹ کے ساتھ صف آرا ہونے کے مترادف تھا۔ یہ کام ادیبوں میں اس زمانے میں صرف سلیم احمد اور شمیم احمد نے کیا تھا۔ اس کا مطلب موثر ادبی حلقے کی دشمنی مول لینا تھا۔ "خامہ بگوش" کے نام سے ان کے کالم نہ صرف یہ کہ شگفتگی کی مثال ہیں، بلکہ نہایت ہی شاندار ادبی بصیرت کے شاہکار ہیں۔ یہی نہیں "غریب شہر" کے نام سے "اندیشہ شہر" کے عنوان سے سیاسی کالم بھی لکھے۔ یہ اس زمانے میں کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے بعد جب صلاح الدین نے "تکبیر" نکالا تو نصر اللہ خان اور ابن الحسن کے ساتھ ان کا نام بھی حلقہ مشاورت کے طور پر چھپتا تھا۔ یہ بھی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ان تینوں حضرات کے بارے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ تکبیر کی پالیسیوں سے سو فیصد متفق نہ تھے مگر اس جنگ میں وہ صلاح الدین صاحب کو تنہا بھی چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ یہ بڑے حوصلے اور جرات کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی بڑی بات یہ ہے کہ اتنی کھلم کھلا کمٹ منٹ کے باوجود اس نقطۂ نظر کے مخالفین بھی ان کے معتقد اور دوست تھے۔ یہ بات تینوں کے بارے میں درست ہے۔ یہ ایک مکتب فکر ہے جو ذاتی طور پر میرا آئیڈیل رہا ہے مگر شاید مجھ میں اتنی وسعت پیدا نہیں ہو پاتی جتنی میرے ان ممدوحین میں تھی۔

ایک بات اور عرض کروں کہ خواجہ صاحب تحقیق کے ایسے آدمی تھے کہ دور دور تک ان جیسا کوئی

دوسرا نظر نہیں آتا۔ جانے کتنے لوگوں کی تحقیقات خواجہ صاحب کی مرہون منت ہیں۔ ان کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور فیض بھی سب کے لیے عام تھا۔ ان کا کتب خانہ صرف کتابوں کا ڈھیر نہ تھا، بلکہ یہاں جو کچھ تھا، وہ سب ان کے ذہن میں تھا۔ برصغیر میں جو کتاب چھپتی جب تک ان تک نہ پہنچ پاتی، بیکار رہتی۔ خواجہ صاحب کے وسائل اور تعلقات دونوں اسی کام پر صرف ہوتے۔ برصغیر میں اس میدان میں اب بڑے نام ہیں، مگر سچ کہتا ہوں کوئی دوسرا مشفق خواجہ نہیں ہے۔ ایک کمال کی بات یہ ہے کہ محققین کو عام طور پر تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں سے عاری سمجھا جاتا ہے یا کم از کم یہ سوچا جاتا ہے کہ ان میں شگفتگی نام کی چیز نہیں ہوتی۔ جیسی بامعنی شگفتہ تحریریں خواجہ صاحب نے لکھی ہیں، وہ اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ عام زندگی میں بھی وہ بڑے ہی نفیس اور خوش دل شخصیت تھے۔

یہ میں کیا لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ طاہر مسعود کہہ رہے تھے کہ وہ بہت سی یادیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اپنا ابھی یہ حال ہے کہ ان سے کئی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں، ایک تسلی سی تھی، آسرا تھا کہ جب ضرورت پڑے گی، شہر میں ایک مرد درویش موجود ہے۔ ویسے یہ سچ ہے ایک درویش تھے۔ ذرا بھی شہرت کی آرزو نہ تھی، دنیا سے بھی کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ بس ایک آشیانہ بسا رکھا تھا اور ایک طرح کی گوشہ نشینی میں اتنے وسائل کا بندوبست کر لیا تھا جو ان کی ادبی زندگی کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ ماشاءاللہ بہن، بھائیوں اور ان کی چاہت نے اسے ایک پیار کرنے والا کنبہ بنا دیا تھا۔ بس وہ انہی چاہتوں اور دوست احباب کی محفلوں میں رہتے تھے۔ کتابوں کے درمیان رہتے تھے۔ ان کے گھر میں اس کے سوا کسی اور چیز کی جگہ ہی کہاں تھی اور ان کے دل میں بھی اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اسی کے سہارے جیتے تھے۔ پھر جانے ان کے [illegible] وہ اس ہجوم سے گھبرا گیا۔ خواجہ صاحب تو گھبرانے والے نہ تھے۔ ان کا [illegible] ان سے بھی کوتاہی نہ ہوتی تھی۔ البتہ انہوں نے بے وقت کے [illegible] کا فقہ کر دیا تھا۔ پھر بھی ہجوم عاشقاں گھیرے رہتا۔ ساتھ ہی [illegible]

[illegible] صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ان جیسا کوئی [illegible] برصغیر میں بھی بلکہ جہاں جہاں اردو [illegible]

[illegible] جلدی جلدی بہت [illegible] عبدالوحید کو حضرت [illegible] کچھ راز افشا ہو [illegible] دے۔ آمنہ [illegible] کیا عرض

کروں، ہر کوئی یہی کہہ رہا ہے کہ یہ تو اس کا ذاتی نقصان ہے۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی تاثر ہے ہی نہیں۔

(بحوالہ (۱): ''روزنامہ نوائے وقت، لاہور'' ۲۴ فروری ۲۰۰۵ء)

(بحوالہ (۲): ''سہ ماہی معاصر انٹرنیشنل'' جلد ۵، شمارہ نمبر ۶،۵، جنوری تا جون ۲۰۰۵ء)

سرفراز سید

مشفق خواجہ بھی چلے گئے!

مشفق خواجہ کی وفات کا سن کر عربی کا مقولہ یاد آیا کہ کسی عالم کی موت ایک عالم (دنیا) کی موت ہوتی ہے! ملک میں علمی و ادبی تحقیق کی دنیا کا سب سے بڑا اور معتبر نام اس حالت میں چلا گیا کہ اپنے پیچھے ملک کی سب سے بڑی ذاتی لائبریری چھوڑ گیا جس میں صرف علمی تحقیقی موضوعات پر 50 ہزار کتابیں اور اتنے ہی رسالے و مضامین شامل ہیں اور خوبی یہ کہ لائبریری اس انداز میں ترتیب دی ہوئی کہ صرف پانچ منٹ میں مطلوبہ کتاب میسر ہو جاتی تھی۔ خواجہ مشفق کا تین منزلہ گھر پورے کا پورا کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ صرف اوپر کا ایک کمرہ بچ گیا تھا، اس میں خواجہ صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ اولاد کوئی نہیں تھی۔ ایک ایسا بڑا آدمی چلا گیا جو اول سے آخر، سرتاپا علم تھا، علم کی بات کرتا تھا، علم کا اظہار کرتا تھا، علم کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اس کی دوستی صرف علم والوں سے تھی۔ وہ اٹھا تو علم کا ایک پورا ادارہ اٹھ گیا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''پھرتا ہے فلک برسوں، تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں''۔

مشفق خواجہ نے علمی تحقیق کا جو معیار اپنایا، اس نے بڑے بڑے محققین کے لیے معیار کی مشکلات پیدا کر دیں۔ مشہور کلاسیکی استاد شاعر یگانہ کی کلیات مرتب کرنے میں 30-35 برس لگا دیے۔ کئی برسوں کی مسلسل محنت کے ساتھ اردو مخطوطات کے بارے میں 1200 صفحات کی ضخیم کتاب مرتب کی۔ یہ برصغیر پاک و ہند میں اردو زبان و ادب کی پوری تاریخ کا معتبر ترین جائزہ ہے۔ اردو کے پرانے شاعروں کا تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' کے نام سے مرتب کیا، اس میں بھی کئی برس لگ گئے۔ آٹھ تحقیقی کتابیں شائع کیں۔ یہ کتاب اپنی جگہ معیار کی مثال قرار پائی۔ ایک پہلو یہ کہ نہایت خشک اور ٹھوس موضوعات پر [illegible] کے لیے عمر وقف کر دی، دوسری طرف ''خامہ بگوش'' کے نام سے ''سخن در سخن'' کے عنوان سے [illegible] اخباری کالم بھی لکھے۔ ان کے تین مجموعے مظفر علی سید نے ایڈٹ کر کے چھاپے۔

ایک ایسے دور میں جب ہر طرف پاپ موسیقی اور ڈائجسٹ قسم کا لٹریچر عام ہو رہا ہے، علمی تحقیق کے میدان میں مشفق خواجہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور ان دونوں کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی موجودگی بہت غنیمت رہی۔ تحقیق کے شعبہ میں ابتدائی ناموں میں لاہور میں محمود شیرانی سے خواجہ محمد زکریا تک اور کراچی میں مولوی عبدالحق سے جمیل جالبی تک ایک دور چلا۔ اس دور میں نوجوان طالب علم بزرگ اساتذہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے۔ مشفق خواجہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کو اپنی اپنی جگہ تحقیقی دبستانوں کی حیثیت حاصل رہی

ہے۔ یہ بات بظاہر عجیب لگتی ہے کہ اردو زبان و ادب کو بھارت کے مقابلہ میں پاکستان میں کہیں زیادہ وسیع پذیرائی اور اہمیت حاصل ہے مگر اس شعبے میں زیادہ اہم تحقیقی کام بھارت میں ہوا ہے۔ وہاں قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مسعود حسن رضوی جیسے لوگ موجود تھے۔ اب بھی مختارالدین احمد، رشید حسن خان، خلیق انجم اور تنویر احمد علوی جیسے معتبر محقق موجود ہیں۔ پاکستان میں اس کے مقابلہ میں بہت کم نام سامنے آتے ہیں۔

مشفق خواجہ لاہور میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے، جہاں ہر شخص علم و ادب کے حوالے سے اپنا مقام رکھتا ہے۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید علامہ اقبالؒ کے بہت قریب تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ علامہ اقبالؒ کا بہت سا سیاسی تحریری کام انجام دیا کرتے تھے۔ وہ باقاعدہ روزانہ ڈائری لکھتے تھے۔ مشفق خواجہ نے والد مرحوم کی اس ڈائری کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے کا کام بھی شروع کر رکھا تھا۔ اس کے چھ سو صفحے کمپوز ہو چکے تھے اور اب کچھ آخری کام باقی رہ گیا تھا کہ وہ چل بسے۔ مشفق خواجہ کے ایک کزن خواجہ خورشید انور نے موسیقی میں ناموری حاصل کی۔ ان کے ایک چچازاد بھائی کرنل (ر) خواجہ عبدالرشید دیال سنگھ لائبریری کے ناظم رہے۔ ان کی اپنی بڑی لائبریری بھی تھی۔ مرحوم کے چچا خواجہ عبدالمجید نے جامع اللغات مرتب کی۔ والد عبدالوحید 1952ء میں اے جی آفس سے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہو کر چلے گئے۔ مشفق خواجہ بھی سات بھائیوں اور تین بہنوں کے لیے کراچی منتقل ہوئے اور پھر باقی زندگی وہیں گزار دی۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ کچھ عرصہ تدریس بھی کی۔

ابتدا سے ہی تحقیق سے دلچسپی تھی، اس پر اتنی توجہ دی کہ تحقیق ان کی ذات کی پہچان کا حوالہ بن گئی۔ انہوں نے بعض بہت نادر کتابیں ڈھونڈ نکالیں، ان میں احمد دین کی علامہ اقبالؒ کے بارے میں کتاب شامل تھی جو تحقیق کے مطابق علامہ اقبالؒ کی شخصیت اور زندگی پر پہلی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحب نے زوال پذیر بادشاہ واجد علی شاہ کے کزن فرمان حسن سلیمانی کی ڈائری تلاش کر کے اسے فرمان سلیمانی کے نام سے ایڈٹ کرنا شروع کیا ہوا تھا۔ خود بہت اچھے شعر کہتے تھے، اپنا شعری مجموعہ ''ابیات'' کے نام سے شائع کیا۔ ان کے کلام کی سید عابد علی عابد جیسے شاعر اور نقاد نے ستائش کی۔ مرحوم کے کام کے معیار اور اعتبار کا عالم یہ تھا کہ خود ان کی زندگی میں ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ مرحوم مولوی عبدالحق کے سیکرٹری بھی رہے۔ اس ماحول نے ان کے علمی کام کو آگے بڑھنے میں بہت مدد دی۔ انہیں فوٹو گرافی کا بہت شوق تھا۔ ان کے پاس تین اعلیٰ کیمرے تھے، اپنے ہر مہمان کی تصویر ضرور بناتے تھے۔ دو روز قبل جناب ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھے فون کیا کہ مشفق خواجہ کا برین ہیمبرج ہوا ہے۔ آغا خان ہسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔ تفصیل پتہ کریں۔ میں نے کراچی آفس کو اطلاع دی۔ معلوم ہوا کہ حالت تشویشناک ہے۔ گزشتہ روز شام گئے تک اطلاع ملتی رہی کہ حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ پھر رات کو ساڑھے دس بجے مجھے کراچی سے ایک دوست نے فون کیا کہ خواجہ صاحب چل بسے۔ اس کے

ساتھ ہی ٹیلی ویژنوں پر خبر چلنے لگی۔ ڈاکٹر وحید قریشی پہلے ہی بہت علیل ہیں، اس خبر نے انہیں مزید مضمحل کر دیا۔ وہ مجھے ٹیلی فون پر بڑی مشکل کے ساتھ خواجہ صاحب کے ساتھ 52 برسوں کی رفاقت کا حال بتاتے رہے۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا سے بات ہوئی، کہنے لگے کہ میری تو ان کے ساتھ دور کی عزیز داری بھی تھی، میرا دکھ تو دوہرا ہے۔ ان کے ساتھ پرانے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ انہوں نے جانے میں جلدی کر دی۔ ڈاکٹر انور سدید کی آواز میں تو باقاعدہ آنسوؤں اور سسکیوں کی آمیزش تھی۔ ان کا مشفق خواجہ کے ساتھ گہرا ذاتی تعلق رہا ہے۔ انہوں نے مرحوم کی بہت سی باتیں سنائیں۔ وہ کس طرح نوجوان محققین کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ ہر خط کا جواب دیتے تھے۔ خطوں میں طویل علمی بحث کرتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے تو سیدھا فیصلہ سنایا کہ اب اس پایہ کا کوئی آدمی نہیں رہا۔

تو صاحبو! علم کا ایک بہت بڑا سرچشمہ بند ہوا۔ وہ شخص چلا گیا جس نے علمی تحقیق کو وقار بخشا۔ وہ علم کا اور علم اس کا ساتھی تھا، یہ ساتھ ٹوٹ گیا۔ کیسے کیسے لوگ اٹھ گئے، جن کے دم سے علم کا اعتبار قائم تھا!! عربی کا وہ مقولہ پھر یاد آ رہا ہے کہ کسی عالم کی موت ایک عالم (جہان) کی موت ہے.....!

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر!

(بحوالہ (۱): ''روزنامہ خبریں لاہور'' مورخہ ۲۳ فروری ۲۰۰۵ء)

(بحوالہ (۲): ''سہ ماہی معاصر انٹرنیشنل'' جلد ۵، شمارہ نمبر ۵، ۶، جنوری تا جون ۲۰۰۵ء)

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

مرنا تو سب نے ہے لیکن میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ مشفق خواجہ بھی مر جائیں گے۔ ہم لوگ ساری عمر اپنی موت کے خوف میں گزار دیتے ہیں اور اپنے پیاروں کے بارے میں خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کرتے۔ چنانچہ جب کبھی اس طرح کی کوئی خبر موصول ہوتی ہے تو ہمیں اندر سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ مشفق خواجہ کے دوستوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص بھی اسی طرح ان کا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ میری ان سے فون پر اکثر بات ہوتی تھی۔ تقریباً دو ہفتے قبل بھی میں نے انہیں فون کیا تھا۔ وہ حسب معمول پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے۔ میں اس روز زیادہ دیر ان سے بات نہ کر سکا کیونکہ مجھے کہیں جانے کی جلدی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ انہیں مجھ سے بھی زیادہ جانے کی جلدی ہے ورنہ چند گھڑیاں اور ان سے بات کر لیتا۔

مشفق خواجہ بہت بڑے محقق تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق میں ان کے پائے کا کوئی شخص فی الوقت پاکستان میں موجود نہیں۔ تحقیق اور تخلیق دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان شعبوں سے منسلک افراد ایک دوسرے سے لاتعلق سے رہتے ہیں۔ محقق کو زندہ ادیبوں کے کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی کہ وہ تو گم شدہ میراث کی تلاش میں رہتا ہے اور تخلیق کار اس سے کوئی خصوصی غرض نہیں اگر کوئی مخطوطہ برآمد ہوتا ہے اور محقق کے حواشی کے ساتھ شائع ہو جاتا ہے لیکن مشفق خواجہ زندہ ادیبوں میں مقبول ترین شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک چلتی پھرتی "کتابیات" تھے۔ انہیں پتہ ہوتا تھا کہ کس ادیب کی کون سی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ وہ کہاں سے مل سکتی ہے۔ نہایت خشک موضوع پر تحقیق کرنے والے مشفق خواجہ کی بذلہ سنجی برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مشہور تھی۔ ان کا ادبی کالم "خامہ بگوش" ہر ہفتے شائع ہوتا اور اس کی ایک ایک سطر میں چھپے طنز و مزاح کی خوشبو چاروں اور پھیل جاتی۔ انہوں نے ایک شاعری کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "اس کتاب میں ایک سو دس گرام کا کاغذ استعمال کیا گیا ہے جبکہ شاعری صرف دس گرام کی ہے۔" ایسے جملے جس کے بارے میں ہوتے تھے وہ تلملاتا ضرور تھا مگر صبر سے کام لیتا تھا کہ اس نے سن رکھا تھا اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

خواجہ صاحب اگرچہ "لاہوریے" تھے مگر مجید لاہوری کی طرح ان کی ساری عمر بھی کراچی ہی میں بسر ہوئی۔ انہیں زبان کی صحت کے حوالے سے اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ زبان جاننے کے لیے اہل زبان ہونا نہیں اہل علم ہونا ضروری ہے اور مشفق خواجہ سے زیادہ صاحب علم کون ہوگا۔ میں نے چند ماہ قبل انڈیا جانے سے پہلے خواجہ صاحب کو فون پر بتایا کہ میں نے بنارس اور کلکتے کے ویزے کے

لیے بھی اپلائی کیا ہے یہ سن کر خواجہ صاحب نے ان دونوں شہروں کی بڑی بڑی لائبریریوں اور وہاں کے صاحب علم حضرات کی پوری تفصیل میرے سامنے بیان کی اور کہا کہ موقع ملے تو وہاں ضرور جائیں اور ان صاحبان علم سے ملاقات بھی کریں مگر بھارتی سفارت خانے نے ان شہروں کا ویزا نہ دیا اور یوں میری اور خواجہ صاحب کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

خواجہ صاحب کی شگفتہ بیانی کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں نے انہیں پوچھا کہ دوزخ مذکر ہے کہ مونث۔ بولے ہر دو صورتوں میں اس سے پناہ مانگنا چاہیے۔ پھر کہا "میرا خیال ہے مونث ہے کیونکہ لوگ اس کے عذاب سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "خواجہ صاحب سنجیدگی سے بتائیں دوزخ مذکر ہے یا مونث ہے۔"

بولے۔ "میرا خیال ہے مونث ہے۔"

اس پر میں نے انہیں ہری چند اختر کا شعر سنایا جس میں انہوں نے دوزخ کو مذکر باندھا ہوا ہے۔ ہری چند اختر کا مصرعہ ہے۔

جناب شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہوگا

بولے۔ "اگر ہری چند اختر نے مذکر باندھا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوزخ کافروں کے لیے مذکر اور مسلمانوں کے لیے مونث ثابت ہوگا۔"

مشفق خواجہ معروف معنوں میں "اسلام پسند" تھے اور "اسلام پسند" جریدوں ہی میں کالم لکھتے تھے مگر وہ جتنے مقبول "اسلامی" حلقوں میں تھے شاید اتنے یا اس سے زیادہ مقبول "غیر اسلامی" حلقوں میں بھی تھے۔ یہ غالباً ان کے تبحر علمی کا رعب اور شوخی تحریر کا اعجاز تھا کہ انہیں ہر طرف سے داد سخن ملی۔ ان کے تحقیقی کارناموں کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی یا ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ہی گفتگو کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی شوخی تحریر کا کمال یہ تھا کہ ان کا طنز و مزاح بے پایاں علم میں رچا بسا ہوتا تھا۔ معلومات کا ایک ذخیرہ تھا جو ان کے ہر کالم میں نظر آتا تھا مگر ایک اچھے "باورچی" کی طرح وہ اپنا ادبی پکوان اس مہارت سے پکاتے کہ مرچ مصالحہ الگ سے نظر نہیں آتا تھا بلکہ وہ پکوان کا حصہ بن کر اس کی لذت میں اضافہ کرتا تھا۔ علم اور طنز و مزاح کا یہ سنگم ہمارے ہاں کم کم ہی نظر آتا ہے۔

دکھ صرف یہ نہیں ہے کہ مشفق خواجہ فوت ہو گئے دکھ تو یہ ہے کہ ایک ایک کر کے وہ سب لوگ اٹھتے جا رہے ہیں جن سے رونق بزم تھی۔ جن سے زیادہ خوبیوں کے حامل لوگ تو ممکن ہے ہمارے درمیان موجود ہوں مگر اب ان جیسا کوئی اور نہیں۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران اشفاق احمد، [illegible]، حبیب [illegible]، تابش دہلوی، احمد بشیر اور نواب مشتاق احمد خان ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ جو لوگ ان سے ملتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی وضع میں یکتا تھا اور ان کے چلے جانے سے پیدا ہونے والا خلا کیسے پر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ابھی جن مرحومین کا ذکر

کیا ادب کے قاری ان میں سے نواب مشتاق احمد خاں کے نام سے واقف نہیں ہوں گے۔ خاں صاحب قاسم رضوی کے ساتھی تھے اور سقوط حیدرآباد (دکن) کے سانحہ کے چشم دید گواہ کی حیثیت سے انہوں نے ایک بہت وقیع کتاب بھی لکھی۔ ان کا انتقال گزشتہ ہفتے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک سو تین سال کی عمر میں ہوا۔

سو اب ماتم صرف مشفق خواجہ کے جانے کا نہیں ایک پورے عہد کے آہستہ آہستہ رخصت ہونے کا ہے۔ اب صرف چند نشانیاں ہمارے پاس ہیں اور ہم لوگ ان کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ کفران نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ ہماری زبانیں بچھو کی طرح انہیں ڈستی رہتی ہیں۔ کاش جانے والوں کی جگہ لینے والا کوئی ہو۔ ویسے مجھے تو آج تک موت کی سمجھ نہیں آئی۔ یہ کمبخت منتخب روزگار لوگوں ہی پر کیوں جھپٹتی ہے۔ خواجہ صاحب ممکن ہو تو اس سے ضرور پوچھیے گا۔

(بحوالہ (۱) "روزنامہ جنگ لاہور" ۲۵ فروری ۲۰۰۵ء)

(بحوالہ (۲) سہ ماہی "معاصر انٹرنیشنل" جلد ۵، شمارہ نمبر ۵،۶، جنوری تا جون ۲۰۰۵ء)

انور سدید

مشفق خواجہ...... خطوط کے آئینے میں

اردو ادب کے ممتاز شگفتہ نگار رشید احمد صدیقی کو جب معلوم ہوا کہ ایک صاحب ان کے خط جمع کر رہے ہیں تو انہوں نے ایک مراسلہ شائع کرایا اور اس میں یہ لکھا:

"میرے تمام کرم فرما جانتے ہیں کہ بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے نام میں نے جو بھی خطوط لکھے ہیں، ان کا شائع کیا جانا مجھے کسی حال میں منظور نہیں، اس کو میں امانت میں خیانت سمجھتا ہوں۔ اپنے عزیزوں تک کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ میرے خطوط شائع نہ کریں۔ میری اس خواہش یا درخواست کو اگر کوئی قابل التفات نہ سمجھے تو میں کیا کوئی بھی اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ مجھے اس کی بڑی تکلیف ہوگی اور رہے گی کہ متعلقہ اصحاب نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔" (سخنہائے ناگفتنی ص ۱۹۴)

ممتاز و معروف زمانہ کالم "سخن در سخن" کے پردہ پوش قلمکار خامہ بگوش نے جن کا پیدائشی نام عبدالحی اور ادبی اسم گرامی مشفق خواجہ ہے، جب رشید احمد صدیقی کا یہ اقتباس پڑھا تو سوال اٹھایا:

"کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خطوط کی اشاعت پر پابندی عائد کر دے یا انہیں تلف کرنے کی ہدایت کرے۔ عام لوگوں کی بات دوسری ہے کہ وہ اپنے خطوط کے ساتھ جیسا سلوک چاہیں کریں لیکن کسی بڑے ادیب کے خطوط کا معاملہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ اس کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی کسی تحریر کا تلف ہو جانا اس ادیب کا نہیں، ادب کا نقصان ہے اور خطوط کی اہمیت عام تحریروں سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ان سے نہ صرف خط نگار کے سوانحی کوائف مرتب کرنے میں بیش بہا مدد ملتی ہے بلکہ اس کے عہد اور معاصرین کے بارے میں بھی بہت سی نادر معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ ..... یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ خطوط کاتب کے نہیں مکتوب الیہ کی ملکیت ہوتے ہیں، قانونی طور پر خطوں کو تلف کرنا یا شائع کرنے کا حق اسی کو حاصل ہوتا ہے۔ رشید صاحب کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنے خطوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے"۔ (سخنہائے ناگفتنی ص ۱۹۵)

خدا کا شکر ہے کہ رشید صدیقی کے اول الذکر ارشاد پر کسی نے عمل نہیں کیا اور ان کے خطوط کے مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں اور رشید احمد صدیقی کے انوکھے کردار کو آشکار کرتے ہیں جن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجی ہوئی تھی لیکن دل اندر سے اشکبار تھا۔ چنانچہ حقیقی رشید احمد کو دریافت کرنے کے لیے ان کی شگفتہ اور لطافت بار کتابوں کا مطالعہ کرنے کے برعکس ان کے

خطوط کو پڑھنا ضروری ہے۔

یہ چند باتیں میں نے اس لیے پیش کی ہیں کہ ان میں ادیبوں کے نجی خطوط کے بارے میں مشفق خواجہ نے اپنا نقطۂ نظر ہی پیش نہیں کر دیا بلکہ ادیبوں کے خطوط کی اہمیت اور تحقیق و تنقید میں ان کی ضرورت بھی واضح کر دی ہے۔ اہم بات یہ کہ انہوں نے خطوط کو کاتب کے نہیں مکتوب الیہ کی ملکیت قرار دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی میں اس موقف پر سختی سے عمل کیا، وہ اپنے کسی خط کی نقل کسی دوست کو ارسال کرتے تو تنبیہ کر دیتے کہ اس کی اشاعت مقصود ہو تو مکتوب الیہ سے باقاعدہ اجازت حاصل کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے متعدد احباب نے ان کے خطوط دوستوں سے اجازت لے کر رسائل میں چھپوائے تو نہ صرف ان کے کردار کے بہت سے گوشے سامنے آ گئے بلکہ یہ بھی ثابت ہوا کہ تحقیق کے انتہائی خشک کام میں ہمہ تن گم رہنے والے اس ادیب شہیر کے باطن میں کتنا عظیم انسان موجود تھا جو اس دنیا پرست زمانے میں خیر کی تقسیم پر مامور تھا، قلم و قرطاس سے جس کا رشتہ بے حد مضبوط تھا...... اور اپنے بے ساختہ طنز و مزاح سے پھل جھڑیاں بھی بکھیر رہا تھا۔

مشفق خواجہ عملی زندگی میں ایک گوشہ نشین انسان تھے لیکن ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور پوری دنیا میں وہاں تک پھیلا ہوا تھا، جہاں تک اردو بولنے، ادب لکھنے اور کتاب پڑھنے والے پہنچے ہوئے ہیں۔ بیرونی دنیا سے ان کے ربط و تعلق کا ایک وسیلہ ان کی خطوط نگاری تھی۔ میرے ذاتی مشاہدے میں ان کے بارے میں دو باتیں خصوصیت سے آئیں، اول یہ کہ انہیں کوئی ادیب اپنی کتاب بھیجتا تو اس کی رسید وہ التزام سے دیتے۔ دوم، وہ احباب کے خطوط کا قرض اتارتے رہتے اور جواب دینے سے کبھی گریز نہ کرتے۔ ان کی اس عادت کا ذکر آیا تو ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھے بتایا کہ مشفق خواجہ کے نظم الاوقات میں خطوط کا جواب لکھنے کے لیے ایک دن مقرر تھا، ہفتے بھر کے دوران جتنے خطوط آتے وہ معینہ روز کو ان سب کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھجوا دیتے۔ ان کی مخصوص عادت یہ تھی کہ خط ہمیشہ باریک کاغذ پر لکھتے جس کی "کاربن کاپی" ساتھ کے ساتھ تیار ہو جاتی، فوٹو سٹیٹ مشین کی ایجاد کے بعد انہیں خطوط کی نقول دوستوں کو ارسال کرنے میں سہولت حاصل ہو گئی۔ ان کی وفات (۲۱ فروری ۲۰۰۵ء) کے بعد میں نے اپنے نام کے خطوط تلاش کیے تو چند خطوط سامنے رکھے ہوئے کاغذات میں سے دستیاب ہو گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ ان کی وفات سے جو ذاتی صدمہ مجھے لاحق ہوا تھا اس کا بوجھ ان خطوط پر مختصر سا مضمون لکھ کر اتاروں۔ اسی دوران ممتاز کتاب شناس محمد احسن خان سے ملاقات ہوئی تو چند خطوط انہوں نے عنایت فرما دیے۔ مزید خطوط مجھے پروفیسر احمد سعید (مؤلف "نگارشات حمید نظامی") سے ملے۔ خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ ڈاکٹر محمود خالد کے پاس موجود ہے، اس ذخیرے سے مجھے جو فوری طور پر آٹھ خطوط ملے ان میں سے چار انور محمود خالد، ایک خط زمرد کوثر اور تین ساقی فاروقی کے نام ہیں۔ سب سے آخر میں ۱۱ خطوط کا تحفہ پروفیسر جعفر بلوچ نے عنایت کیا۔ اس مطالعے کی اساس میں نے متذکرہ ۳۹ خطوط پر استوار کی ہے۔

[illegible] کے مطابق ہر مکتوب الیہ نے مجھے اس مضمون کے لیے خطوط استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ [illegible] تاہم میں اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اپنی ستر برس کی عمر میں انہوں نے پوری اردو دنیا میں پھیلے [illegible] زیادہ احباب کو کتنے خطوط لکھے ہوں گے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہو سکتی ہے۔ [illegible] ہو کہ یہ تمام خطوط مشفق خواجہ کے ذخیرے میں نقول کی صورت میں موجود ہیں اور متعدد [illegible] سے ان کی اشاعت کا اہتمام بھی کرنے لگے ہیں (جناب محمد عالم مختار حق کے نام لکھے گئے [illegible] پاکستان اردو اکادمی لاہور سے کتابی صورت میں چھپ رہے ہیں، ان کا تعلیق نامہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔)

مشفق خواجہ کی خوبی یہ تھی کہ ان سے کوئی سوال پوچھا جاتا تو وہ اس کا تشفی آمیز جواب دیتے۔ [illegible] سے ایم اے کرنے کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انہیں انجمن ترقی اردو میں [illegible] پر فائز کر دیا تھا۔ اس منصب پر انہوں نے ۱۹۷۳ء تک کام کیا لیکن جب دیکھا کہ [illegible] ان کے اپنے ادبی کاموں کی تکمیل میں حارج ہو رہی تھی تو انہوں نے از خود یہ ملازمت [illegible] اور خانہ نشین ہو کر اپنے ادبی منصوبوں کی تکمیل کرنے لگے۔ اس ضمن میں محمد احسن خان نے [illegible] کیا تو خواجہ صاحب نے لکھا:

"[illegible] کسی ملازمت نہیں کی۔ اگر ملازمت کرنی ہوتی تو انجمن کیا بری تھی، وہاں مجھے ہر طرح [illegible] حاصل تھی اس ایک خرابی تھی کہ لوگ اتنی کثرت سے آتے تھے کہ کام کا وقت گزر جاتا تھا اور پھر [illegible] کے بعد کام کرنا پڑتا تھا۔ اس صورت حال کی وجہ سے میرے علمی منصوبے نامکمل پڑے [illegible] آزادی سے اپنی دلچسپی سے کام کر رہا ہوں۔"

[illegible] منصوبوں کے ضمن میں انہوں نے لکھا:

"[illegible] کی تیسری جلد ہے جو تعلیقات و حواشی پر مشتمل ہے۔ دوسرا کام پاکستان [illegible] کی وضاحتی فہرست کی تیاری ہے۔ اس کام کے لیے مختلف لائبریریوں اور ذاتی کتب [illegible] ہے۔ لاہور بھی اسی سلسلے میں آؤں گا۔ ٹیلی ویژن سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں ریڈیو [illegible] ریڈیو کی عالمی سروس سے ہر جمعرات کو میرا ایک پروگرام نشر ہوتا ہے۔ یہ آدھ گھنٹے کا [illegible] اردو میں مسلمان سیاحوں کے سفرناموں کی ابتدائی تفصیل کی جاتی ہے۔ رہا یہ کہ اب [illegible] کے لیے کون کون سے فیچر لکھے ہیں تو آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ [illegible] پروگرام ستمبر [illegible] ہے۔ اس کے علاوہ دو سال تک "دیکھتا چلا گیا" نامی پروگرام (ہفتہ وار) لکھتا رہا [illegible] ۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی میں چار مہینے تک "سنا آپ نے" کے عنوان سے ایک پروگرام ہر روز [illegible] ریڈیو کے لیے اتنا لکھا ہے کہ خود مجھے بھی یاد نہیں۔ لیکن آپ کو حیرت ہو گی کہ میں بھی [illegible] گھر ہی سے لکھ کر بھیج دیتا ہوں۔" (مکتوب بنام محمد احسن خان۔ ۱۰ نومبر ۱۹۷۳ء)

رسالہ "تخلیقی ادب" کے منصوبے کے سلسلے میں انہوں نے جو معلومات مجھے ارسال فرمائیں وہ حسب ذیل ہیں:

"میں گزشتہ ایک برس سے ایک منصوبے پر کام کر رہا ہوں اور وہ ہے ایک ادبی رسالہ جس کا نام "تخلیقی ادب" رکھا ہے۔ اس میں کئی مستقل سلسلے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ کسی اہم ادبی شخصیت کے فکر و فن کا مطالعہ ...... پہلی کتاب ...... یا ...... پہلا شمارہ مئی تک شائع ہو جائے گا۔ اس میں یگانہ کے لیے تقریباً سو صفحات مخصوص کیے گئے ہیں، دوسرے شمارے میں جو اس سال کے آخر میں شائع ہوگا ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن کا مطالعہ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ میں یہ کام آپ کے تعاون کے بغیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ابھی اس سلسلے میں خط نہیں لکھا۔ آپ کی رائے معلوم ہو جائے تو پھر انہیں لکھوں گا۔ ازراہ کرم آپ یہ تحریر فرمایئے کہ کن کن لوگوں سے مضامین لکھوانے چاہییں (شخصیت پر ڈاکٹر صاحب کی علمی کاوشوں پر میں صرف انہیں حضرات سے لکھواؤں گا جن کی خود اپنی علمی حیثیت بلند ہے اور جنہوں نے اب تک ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا"۔ (مکتوب بنام انور سدید۔ ۱۴ اپریل ۱۹۸۰ء)

میں نے مطالعہ وزیر آغا کے سلسلے میں چند نام تجویز کیے تو خواجہ صاحب نے جواباً تحریر فرمایا:

"ڈاکٹر وزیر آغا پر لکھنے کے لیے آپ نے جن اہل قلم کے نام لکھے ہیں، میں عنقریب ان سے رابطہ کروں گا پہلے شمارے سے ذرا فارغ ہو جاؤں۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہندوستان کے چند اہل قلم کو بھی لکھنے کی دعوت دوں گا۔ میری یہ دیانت دارانہ اور سوچی سمجھی رائے ہے کہ ہمارے ادب میں ڈاکٹر وزیر آغا جیسے جامع الحیثیات لوگ کم ہوئے ہیں، خصوصاً ان کا یہ کارنامہ عہد آفریں حیثیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اردو تنقید کی فکری سطح کو بلند کیا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف بہت ضروری ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے کہ ایک گروہ ڈاکٹر صاحب کے ادبی کارناموں کی قدر و قیمت کم کرنے پر کمربستہ ہے لیکن ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ "اودھ پنچ" والوں نے کئی برس تک حالی کے خلاف لکھا لیکن آج ان لوگوں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔" (مکتوب بنام انور سدید ۱۹ اپریل ۱۹۸۰ء)

اس اقتباس سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ مشفق خواجہ ادبی دنیا کے حالات سے کتنے باخبر رہتے تھے اور درون پردہ سازشوں کا پتہ کس خوبی سے لگا لیتے تھے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ادب اور ادیب شناس تھے اور ادبی دنیا کی ناانصافیوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ دوسری طرف جب اچھی کتاب ملتی تو ان کا غنچۂ دل کھل اٹھتا اور وہ مصنف یا مؤلف کی تحسین بڑی کشادہ دلی سے کرتے۔ پروفیسر جعفر بلوچ نے مولانا حامد علی خاں (مرحوم) کے مضامین کی کتاب "نفائس ادب" تالیف کی تو انہیں لکھا:

میں تو خود آپ کو "نفائس ادب" میں شمار کرتا ہوں، اب آپ نے اس نام سے کتاب مرتب کر کے جی خوش کر دیا ہے۔ نثر اور پھر وہ بھی مولانا حامد علی خاں کی نثر! اردو میں ایسی نثر لکھنے والے دو چار اور ہوں

گے۔ مولانا حالی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین۔ عبارت آرائی سے پرہیز، لفاظی سے کوسوں دور...... سیدھی بات سیدھے انداز میں کہہ دینا مگر اس طرح کہ دل میں اتر جائے۔ غالب کے دو لفظوں میں سادگی و پرکاری اسی کو کہتے ہیں مولانا (حامد علی خاں) کے یہ مضامین میرے لیے تو اس لیے بھی اہم ہیں کہ جن موضوعات پر انہوں نے لکھا ہے وہ میرے پسندیدہ موضوعات ہیں"۔ (مکتوب بنام پروفیسر جعفر بلوچ ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

میں نے اپنی دو کتابیں انہیں پیش کیں تو انہوں نے سند تحسین بھیجنے میں تاخیر نہ کی۔

"آپ کی دونوں کتابیں "ادب کہانی ۹۷ء" اور "دلاور فگاریاں" ملیں۔ ان عنایات کے لیے بے حد ممنون ہوں آپ کی جولانی قلم اور روانی طبع دونوں پر رشک آتا ہے۔ آپ جس انہماک سے کام کرتے ہیں، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ آپ نے کام کو عبادت کا درجہ دے دیا ہے کہ ایسا انہماک اللہ والوں کی عبادت ہی میں نظر آتا ہے۔ میں نے دونوں کتابوں سے بالاستیعاب استفادہ کیا اور آپ کے حق میں دعائے خیر کی۔ خدا آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے۔ ہاں ایک اور دعا بھی کرتا ہوں کہ آپ احمد ندیم قاسمی کی حمایت اور ڈاکٹر وزیر آغا کی مخالفت کے گرداب سے باہر نکل آئیں کہ اب آپ ان "مقامات آہ و فغاں" سے بہت بلند ہو چکے ہیں۔ میری یہ دعا صدق دل سے ہے اور یقین ہے کہ ضرور قبول ہوگی"۔ (مکتوب بنام انور سدید ۱۲ اپریل ۲۰۰۳ء)

پروفیسر احمد سعید کی مؤلفہ کتاب "نگارشات حمید نظامی" کی اشاعت کی خبر ملی تو مشفق خواجہ نے انہیں اپنے خط میں لکھا:

"یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ "نگارشات حمید نظامی" کی اشاعت عمل میں آ چکی ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے آپ کی نئی کتاب "مسلمانان پنجاب کی سماجی اور فلاحی انجمنیں" نظر سے گزری۔ یہ کام بھی آپ کے دوسرے کاموں کی طرح بنیادی نوعیت کا ہے اور نہایت عمدہ ہے۔

حمید نظامی مرحوم کے مزاحیہ کالموں پر میں ضرور لکھوں گا، آپ کتاب کے پروف بھجوا دیجیے۔ اگر حمید نظامی پر کوئی کتاب لکھی گئی ہو تو اس کی نشان دہی فرما دیجیے۔ میں یہ اپنے ذریعے سے منگوا لوں گا۔

پس نوشت ...... میں یہ خط لکھ کر لفافہ بند کر چکا تھا کہ آپ کی مرتب کتاب "نگارشات حمید نظامی" موصول ہوئی۔ بے حد ممنون ہوں۔ آپ نے صحافی حمید نظامی میں ادیب حمید نظامی کو تلاش کر لیا ہے۔ یہ بڑی اہم دریافت ہے"۔ (مکتوب بنام پروفیسر احمد سعید۔ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۳ء)

مشفق خواجہ کی مؤلفہ کتاب "کلیات یگانہ" کی اشاعت پر جعفر بلوچ صاحب نے نظم لکھی تو خواجہ صاحب نے انہیں شکریے کا خط لکھا۔ ان کا حسن تشکر ملاحظہ کیجیے جس میں انکسار کی بات نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا ہے:

"کلیات یگانہ پر آپ کی نظم دیکھی۔ ایسی قادر الکلامی تو یگانہ میں بھی نہیں تھی۔ جیسی اس تبصرے میں

نظر آتی ہے۔ بحر بھی ایسی استعمال کی ہے کہ غالب کے بعد آپ ہی نے اس میں شعر کہنے کی جسارت کی ہے۔ خدا جانے کہاں کہاں سے الفاظ اور تراکیب آپ ڈھونڈ کر لائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خاں کے بعد آپ ہی قادر الکلامی کے میدان کے مرد ہیں، اگرچہ ذیابیطس کے مرض کے بعد مردانگی محض اتہام کی صورت میں باقی رہ جاتی ہے"۔ (مکتوب بنام پروفیسر جعفر بلوچ ۱۶ جون ۲۰۰۳ء)

مشفق خواجہ اپنے ادیب دوستوں کی فرمائشوں کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے، ان کی وفات کے بعد بے شمار ادیبوں نے اعتراف کیا کہ ان کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے لیے بہت سا بنیادی مواد صرف ایک خط لکھنے پر خواجہ صاحب نے کراچی کے کتب خانوں سے اور اپنے ذخیرہ کتب سے تلاش کر کے فراہم کر دیا۔ وہ اپنے ہر دوست کے ذوق نظر کے جہت آشنا تھے اور ان کی نظر سے اپنے دوست کے مطلب کی کتاب گزرتی تو اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے خرید تے اور بھجوا دیتے۔ اس نوع کا ایک دلچسپ اقتباس حسب ذیل ہے جو محمد احسن کے نام ایک مکتوب سے لیا گیا ہے:

آپ بھی کمال کے آدمی ہیں، کتاب ابھی پریس میں ہوتی ہے اور آپ کو اس کی اشاعت کی اطلاع بھی مل جاتی ہے۔ کتابوں سے آپ کا تعلق خاطر لائق احترام ہے۔ "املائے غالب" کا سرورق ابھی نہیں چھپا اس کے بعد جلد سازی ہوگی۔ یہ کام رمضان کے بعد ہوں گے۔ مگر اتنی دیر آپ کو انتظار کے عالم میں کیوں رکھا جائے۔ جلد ساز سے میں نے فارم منگوا لیے ہیں اور یہی بھجوا رہا ہوں۔ جلد آپ خود بنوا لیجیے۔ ادارہ یادگار غالب کی ایک اور کتاب بھی آپ کے کام کی ہے۔ "تصحیح و تحقیق متن" از ڈاکٹر نذیر احمد۔ یہ بھی بھیج رہا ہوں۔ ان کی وصولی سے مطلع فرمائیے"۔ (مکتوب بنام محمد احسن۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۰ء)

اس نوعیت کا ایک خط پروفیسر احمد سعید کے نام بھی ہے:

""مخبر عالم" پر مولانا امداد صابری کی کتاب ان کی وفات کے کئی برس بعد شائع ہوئی، "مخبر عالم" کے ایڈیٹر کے پوتے اس کے ناشر تھے۔ کتاب کی طباعت کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے یہ کتاب بازار میں دستیاب نہیں ہے۔ حسن اتفاق سے مرحوم ناشر نے اس کے چند نسخے مجھے عنایت کیے تھے کہ میں اہل علم میں تقسیم کر دوں۔ ان میں سے ایک نسخہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔ ازرہ کرم اس کی وصولی سے مطلع فرمائیے"۔ (مکتوب بنام پروفیسر احمد سعید۔ ۲۸ جون ۲۰۰۱ء)

علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں عملی معاونت مشفق خواجہ کے لیے ایک اہم ترین فرض کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے گھر پر تشنگان علم کا ہجوم رہتا تھا اور وہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کا مواد جہاں سے بھی دستیاب ہوتا، تلاش کر کے فراہم کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد نے مجھے بتایا کہ ان کی ایک شاگرد زمرد کوثر پنجاب یونیورسٹی سے غمگین دہلوی پر پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ مشفق خواجہ کے پاس اس شاعر کا ایک قلمی دیوان ہے۔ اس نے ڈاکٹر انور محمود خالد کے حوالے سے انہیں خط لکھا، ایک ہفتے کے بعد خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اردو کے کتب خانے سے حاصل کردہ مخطوطے کی فوٹو کاپی اپنے خرچ سے

کرا کے ارسال کر دی، انور محمود خالد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری پر تحقیقی کام کر رہے تھے، خواجہ صاحب نے بجنوری کا مقالہ "محاسن کلام غالب" جو سب سے پہلے رسالہ "اردو" میں شائع ہوا تھا، تلاش کیا اور اس کی نقل انہیں فراہم کر دی۔ اس نوع کی چند اور مثالیں ان کے خطوط سے بھی دستیاب ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

"ہمایوں کے مطلوبہ شمارے میرے پاس نہیں ہیں۔ شہر کی دوسری لائبریریوں سے تلاش کیے تو دیال لائبریری سے ۱۹۳۱ء کا پورا فائل مل گیا۔ اس فائل میں حمید نظامی کے جتنے مضامین بھی تھے، ان کے عکس بنوا لیے یہ سب آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔

"نیرنگ خیال" کا اشاریہ بھی مرتب نہیں ہوا، اس کے متفرق شمارے کتب خانوں میں ہیں، مکمل فائل کہیں نہیں۔ میرے پاس جو شمارے ہیں ان میں حمید نظامی کا کوئی مضمون نہیں۔

حامد علی ہیرسٹر کا کتابچہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ میرے کسی اہلکار نے اسے غلط جگہ پر رکھ دیا ہے۔ اگر کوئی کتاب اپنے موضوع کی کتابوں سے الگ رکھی جائے تو اس کے ملنے میں دشواری ہوتی ہے۔ بہر حال آپ اطمینان رکھیے یہ کتابچہ جب بھی دستیاب ہوا بھجوا دوں گا"۔ (مکتوب بنام احمد سعید۔ ۹ جون ۲۰۰۳ء)

مشفق خواجہ لاہور تشریف لائے تو میں نے ذکر کیا کہ میں ان دنوں دلاور فگار (مرحوم) پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ جس کے مواد کے لیے ان کی مدد مجھے درکار تھی۔ خواجہ صاحب نے کراچی پہنچتے ہی خط لکھا:

"لاہور میں مسافر نوازی کے لیے سراپا سپاس ہوں، آپ کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ میں نے یہاں آتے ہی دلاور فگار سے متعلق مطلوبہ چیزوں کی تلاش شروع کر دی۔ سحر انصاری صاحب کو کئی مرتبہ فون کر چکا ہوں۔ مگر وہ "ہاتھ" نہیں آتے۔ ان سے کسی کتاب کا دستیاب ہونا ناممکن ہے کیونکہ جگہ کی کمی کی وجہ سے کتابیں چھت تک ڈھیر کی صورت میں رکھی ہیں۔

سرورق کے لیے تصویر بھیج رہا ہوں۔ یہ غیر مطبوعہ ہے جو میں نے بارہ سال پہلے کھینچی تھی۔ تاریخ اس کی پشت پر درج ہے۔ اگر استعمال کے بعد مجھے یہ تصویر واپس مل جائے تو کرم ہوگا۔

دلاور فگار کی ایک مختصر سوانح عمری کسی رسالے میں چھپی تھی، سحر انصاری کے پاس شاید ہی ہوگی۔ میں تلاش کر رہا ہوں"۔ (مکتوب بنام انور سدید۔ ۲۶ مئی ۱۹۹۸ء)

مشفق خواجہ اپنے دوستوں کی خیریت اور صحت مندی کے بارے میں ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ کسی دوست کی علالت کی خبر ملتی تو تشویش میں مبتلا ہو جاتے اور پھر ان کی عیادت میں تاخیر نہ کرتے۔ "الاسعد" (لاہور) کے مدیر سعید شیخ بیمار ہو گئے اور علالت خطرناک صورت اختیار کر گئی تو خواجہ صاحب نے مجھے لکھا:

"شیخ (سعید) صاحب کی علالت کا سن کر بے حد تشویش ہوئی۔ مجھے ان سے تعلق خاطر ہے۔ شاید

آپ کے علم میں ہو کہ وہ میرے والد مرحوم کے دوستوں میں سے ہیں۔ خدا انہیں صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ ملاقات ہو تو میری طرف سے نیک خواہشات پہنچا دیجیے''۔ (مکتوب بنام انور سدید۔ ۱۲ [illegible] ۲۰۰۲ء)

اپنی زندگی کا ۸۲ واں برس عبور کرنے کے بعد مجھے عمر ضعیفی کے اضمحلال نے شدید طور پر [illegible] کرنا شروع کر دیا تو میں نے ایک خط میں اس کا ذکر خواجہ صاحب سے کیا۔ انہوں نے جواب میں لکھا:

''حضرت! آپ ضعیفی کا کیا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ضعیف تو وہ ہوتے ہیں جو ناکارہ ہوں۔ آپ تو ہر لحظہ حرکت و عمل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لوگ تو نام نہاد جوانی میں بھی اتنا کام نہیں کرتے جتنا آپ مفروضہ ضعیفی میں کر لیتے ہیں۔ آپ کے کام کو دیکھ کر کون ہے جو آپ کو ضعیفوں میں شمار کرے گا۔ آپ جوان ہی ہیں۔ جوان رعنا ہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم کہا کرتے تھے کہ کام کرنے والا انسان چالیس سال کی عمر میں پیدا ہوتا ہے۔ اس حساب سے تو آپ ابھی تیس برس کے ہونے ہیں''۔ (مکتوب بنام انور سدید۔ ۱۴ اپریل ۲۰۰۲ء)

اب فطرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مجھے عزم و ہمت کا حوصلہ دینے والے مشفق خواجہ نومبر ۲۰۰۲ء میں خود بیمار پڑ گئے۔ کچھ عرصہ ہسپتال میں داخل رہنے کے بعد چار ماہ سے زائد عرصہ اپنے بھائی جان کے پاس گزرا۔ یہ مقام ان کے کتب خانے سے دور سمندر کے قریب تھا۔ اس بیماری کا آزار جھیلنے کے بعد جب کچھ صحت مند ہوئے تو ناظم آباد والے گھر میں واپس آ گئے۔ اس کی اطلاع ڈاکٹر انور محمود خالد کو [illegible] لکھا:

''چار ماہ سے زائد کا عرصہ کہیں اور گزارنے کے بعد بالآخر میں وہیں آ گیا ہوں جہاں میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزارا ہے۔ یعنی وہ مکان جو نہ دولت خانہ ہے، نہ غریب خانہ بلکہ ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہے۔ جہاں جگہ کی کمی کے باوجود ایک وسیع دنیا آباد ہے اور میں اسی کی سیاحت میں رہتا ہوں''۔

اپنے سابقہ مسکن استراحت کا ذکر آیا تو ان کا تاثر حسب ذیل تھا:

''جہاں میں نے چار ماہ سے زائد کا عرصہ گزارا، اس شہر کا خوبصورت ترین علاقہ ہے۔ میری قیام گاہ عین سمندر کے کنارے تھی۔ سمندر سے قریب آنے کا تو بارہا اتفاق ہوا ہے لیکن کنار بحر پر اتنے عرصے قیام کا موقع پہلی بار ملا۔ سمندر کی کراماتیں بے شمار ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اس کے پانی کا رنگ بدلتا ہے کبھی نیلا، کبھی سیاہ، کبھی مٹیالا اور کبھی سورج کی کرنوں سے شیشے کی طرح چمکتا ہوا۔ شام کو غروب آفتاب کے وقت تو افق پر علامہ اقبال والے لعل بدخشاں کے ڈھیر اس طرح نظر آتے ہیں جیسے پانی میں آگ لگ گئی ہو اور شعلے بلند ہو رہے ہوں۔ غرض سمندر کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ خصوصاً ان آبی پرندوں کے ساتھ جو اسی ترتیب و تنظیم کے ساتھ پرواز کرتے تھے کہ فضا میں خوبصورت نقش بنتے چلے جاتے تھے...... یہ سارا منظر فطرت اپنی جگہ مگر گھر تو گھر ہے، اسے تو یاد آنا ہی تھا اور یہ شعر بھی یاد آتا رہتا تھا۔

گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن
در بدر ہیں تو یاد آتا ہے

(مکتوب بنام ڈاکٹر انور محمود خالد۔ ۱۴ مارچ ۲۰۰۳ء)

[illegible] علالت کے بعد مشفق خواجہ کی اپنے کتب خانے میں واپسی درحقیقت اپنی کھوئی ہوئی جنت میں واپسی تھی۔ چنانچہ گھر آتے ہی اپنے علمی منصوبوں کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ ادھر لاہور کے دوستوں نے انہیں اس شہر میں بلانے کا تقاضا شروع کر دیا لیکن اب شاید وہ سفر کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اس لیے [illegible] کرنا ناگزیر ہو گیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''لاہور آنے کو جی بہت چاہتا ہے مگر اپنی جسمانی حالت سے ڈرتا ہوں۔ کمزوری اس حد تک ہے [illegible] اور اتارنے میں دقت ہوتی ہے حالانکہ جوتا اپنا ہی ہوتا ہے کسی دوسرے کا نہیں۔ ویسے خدا کا [illegible] بیٹھ کر ۱۲،۱۲ گھنٹے بیٹھ کر بلا تکان کام کرتا ہوں۔ مگر سفر کرنے اور میز پر بیٹھنے میں بڑا فرق [illegible] سے کہتا ہوں ساتھ چلیے تو وہ کہتی ہیں کہ جب تم کسی لائق تھے تو اکیلے سفر کرتے تھے، اب [illegible] تو گھر میں رہو۔ بہر حال خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ بہت سوں سے اچھی زندگی گزار رہا [illegible] (مکتوب بنام جعفر بلوچ۔ ۳۰ دسمبر ۲۰۰۳ء)

[illegible] کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ

''[illegible] سنجیدگی سے وہ (مشفق خواجہ) تحقیق کرتے ہیں، اتنی ہی سنجیدگی سے مذاق بھی کرتے [illegible] ''سنجیدہ مذاق'' کے متعدد نقوش ان کے خطوط میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اور انہیں پڑھتے [illegible] مسکراہٹ ہونٹوں پر ابھر آتی ہے۔ ان کے لاہور کے دو دوستوں میں شکر رنجی پیدا ہو [illegible] اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں جعفر بلوچ صاحب کو لکھا:

[illegible] کے درمیان اختلافات کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ صلح کیوں نہیں کرا دیتے۔ معلوم ہوتا [illegible] کی طرح صلح کل واقع ہوئے ہیں۔ اسلامیہ کالج میں مصطفےٰ زیدی میرے استاد تھے۔ [illegible] تعلقات تھے۔ جس زمانے میں بابائے اردو کا انتقال ہوا، وہ نواب شاہ میں ڈپٹی کمشنر [illegible] کے بعد بابائے اردو کی یاد میں انہوں نے ایک لائبریری قائم کی اور اس کے افتتاح کے [illegible] اور مشاعرہ رکھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا فلاں فلاں ادیب اور شاعر کو لے کر نواب شاہ [illegible] ایک گاڑی میں جوش صاحب اور چند شعرا کو روانہ کیا اور دوسری ریل گاڑی سے شاہد احمد [illegible] دوسرے نثر نگاروں کے ساتھ میں بھی نواب شاہ روانہ ہوا۔ [illegible] جوش اور شاہد [illegible] دوست [illegible] جنگ جاری تھی۔ مصطفےٰ زیدی کو مہمانوں کے استقبال کے لیے دو مرتبہ [illegible] انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ اگر سب مہمان ایک ساتھ آ جاتے تو انہیں [illegible] میں نے عرض کیا ''آپ کو معلوم نہیں جوش صاحب اور شاہد صاحب میں جنگ

ہو رہی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" زیدی نے کہا۔

میں نے جواب دیا "بہت فرق پڑتا ہے۔ دونوں اگر ریل میں ایک ساتھ ایک ہی ڈبے میں آتے اور راستے میں ان دونوں میں صلح ہو جاتی تو کون ذمہ دار ہوتا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی بڑے محتاط ہیں، دونوں میں صلح نہیں ہونے دیتے۔" (مکتوب بنام پروفیسر جعفر بلوچ۔ ۲۲ جولائی ۲۰۰۳ء)

لطافت کی یہ چاشنی ایک خط میں یوں بکھری ہوئی ہے:

"آپ کے خط میں "صدر شعبہ بالفصلی" پڑھ کر میں دیر تک ہنستا رہا۔ برادر عزیز پر اس سے بہتر پھبتی اور اس سے عمدہ تبصرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں "بالفصلی" کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ ایک معنی تو معروف ہیں، یعنی نارنجی اور دوسرے موسم سے متعلق ہیں۔ "بے فصل کا میوہ"۔ ایسا میوہ عموماً نارسیدہ ہوتا ہے مگر موصوف تو نارسیدہ نہیں، رسیدہ ہیں یعنی پہنچے ہوئے ہیں۔ کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں، یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔" (مکتوب بنام جعفر بلوچ۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

پروفیسر جعفر بلوچ کے نام ایک خط کا بہت آفریں اقتباس حسب ذیل ہے:

"کلیات یگانہ پر منظوم تبصرہ لکھنے کے بعد آپ ایسے غائب ہوئے جیسے کوئی غلط کام کرنے کے بعد منہ چھپاتا پھرتا ہے۔ مگر یوں منہ چھپا لینا تو اس کے لیے بھی مناسب نہیں جس نے کلیات یگانہ مرتب کیا ہو۔ یہ بھی نہیں کہ آپ تحسین (فراقی) کی طرح مصروف ہوں۔ وہ تو صدر مشرف کی طرح ماشاءاللہ وردی میں ہیں۔ ملک کی صدارت ہو یا شعبے کی، دونوں ایک ہی جیسے کام ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مشرف کی وردی تو غسال اتاریں گے، تحسین (فراقی) کی وردی اتارنے کے لیے...... ہی کافی ہے اور نگ زیب عالمگیر کی ہمدردیاں تحسین (فراقی) کے ساتھ ہوں گی لیکن کوشش فریق ثانی کے ساتھ۔"

"بہر حال تحسین صاحب کی صدارت کا مجھے یہ نقصان ہوا ہے کہ اب وہ بھول کر بھی خط نہیں لکھتے۔ ٹھیک ہے، وہ مصروف ہیں لیکن بھائی صاحب آپ کو تو شاعری کے علاوہ کوئی کام نہیں، آپ کیوں خط نہیں لکھتے؟ نثر لکھنا اگر شایان شان نہیں تو منظوم خط ہی لکھیے۔ ویسے بھی نظم آپ آسانی اور فراوانی سے لکھ لیتے ہیں۔ نثر کے لیے دروزہ کیوں جھیلا جائے؟" (مکتوب ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

اب ڈاکٹر انور محمود خالد کے نام ایک خط کے دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے، چند اشارے بڑے پر لطف ہیں:

"انیس ناگی کی تازہ ترین کتاب "پاکستانی اردو ادب کی تاریخ" کل ہی موصول ہوئی ہے۔ اسے اگر "کتاب اللطائف" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے۔ اس میں دو تین صفحے "تحقیق" پر بھی ضائع کیے گئے ہیں۔ ایک جگہ یہ دلچسپ جملہ ملتا ہے:

"پاکستان کے کتب خانوں سے قلمی نسخے چوری کر کے ان پر اپنا نام بطور مرتب لکھ کر شائع کرنا پاکستانی محققوں کا شیوہ رہا ہے۔"

انیس ناگی کا بھی جواب نہیں۔ ایک کا کام سارے محققوں کی جھولی میں ڈال دیا۔"

"آج کل کراچی میں سردی اور مہمانوں کی لہر آئی ہوئی ہے۔ ہندوستان سے ڈاکٹر انور معظم، جیلانی بانو اور ڈاکٹر خلیق انجم آئے ہوئے ہیں۔ لاہور سے ڈاکٹر سلیم اختر، ایک رپورٹر ملتان سے بھی آیا تھا، نگار کے جلسے کے لیے۔ وہ لوگ دوسرے دن ہی چلے گئے جیسے نگار کے جلسے میں شرکت کے بعد وہ منہ دکھانے کے لائق نہ رہے ہوں۔" (مکتوب۔ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۴ء)

مندرجہ ذیل دو اقتباسات مکتوب الیہ کا نام صیغۂ راز میں رکھ کر پیش کر رہا ہوں۔ وجہ یہ کہ میں ان اقتباسات کی لطافت و مسرت اپنی ذات تک محدود رکھنے کی بجائے، آپ تک پہنچانے کا آرزومند بھی ہوں:

"دیکھو بالآخر جادو سر چڑھ کر بول ہی پڑا۔ تم ایک عرصے سے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں "دنیائے سخن" میں تمہاری خدائی کا اعلان کر دوں، مگر میں ڈرتا ہوں کہ اس اعلان کو سن کر لوگوں کی رائے تمہارے بارے میں ابھی تو کیا ہوگی، میرے بارے میں ضرور خراب ہو جائے گی۔ بہر حال آج بہت ہمت کر کے تمہیں "خدائے سخن" کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اب تم خوش ہو جاؤ گے اور دعا کرو گے کہ میرا انجام بخیر ہو۔ نمرود کی خدائی میں نمرود کا بھلا ہوا تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ تمہاری خدائی میں کس کس کا خانہ خراب ہوتا ہے۔"

تمہاری کتاب "غزل بے شرط" کو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ البتہ جمال پانی پتی منہ پھلائے پھر رہے ہیں۔ تمہارے بارے میں اور تمہاری کتاب پر اتنا طویل دیباچہ لکھنے کا یہ نتیجہ تو ہونا ہی تھا۔ ادھر شمس الرحمن فاروقی کے برگزیدہ شاعر اعظم ظفر اقبال نے دیباچے کو رجی اور اکتا دینے والی تحریر قرار دے کر تنگ دلی کا جو مظاہرہ کیا ہے اسے میرے جیسے تمہارے طرف داروں نے سخت ناپسند کیا ہے۔ یہ تنگ دلی نہیں تو اور کیا ہے کہ تمہاری کتاب میں صرف ایک بے ضرر سا دیباچہ ہے وہ بھی ظفر اقبال کو پسند نہیں آیا۔ جبکہ اس کے اپنے کلیات "اب تک" کی پہلی جلد میں بیسیوں دیباچے اور دیباچہ نما تحریریں موجود ہیں۔ جو بظاہر تو نثر میں ہیں لیکن مبالغہ آرائی میں قصیدوں سے بڑھ کر ہیں۔ ویسے چپکے سے ایک بات تمہارے کان میں کہہ دوں (چپکے سے اس لیے کہ کہیں ظفر اقبال نہ سن لے) کہ ظالم نے تمہاری کتاب پر مضمون مزے کا لکھا ہے۔ تمہاری برائی ایسے کی ہے جیسے تعریف کر رہا ہو۔ مثلاً وہ تمہیں منفرد شاعر سمجھتا ہے مگر ایسے شعراء کے درمیان جن کی کوئی اہمیت نہیں۔ گویا تم مجھ جیسے اور جمال پانی پتی جیسے شعراء کے درمیان منفرد شاعر ہو اور تمہارا منفرد ہونا ہماری وجہ سے ہے نہ کہ تمہاری اپنی وجہ سے۔" (مکتوب ۱۳ دسمبر ۲۰۰۴ء)

خامہ بگوش نے ''سخن در سخن'' میں بڑی معرکہ آرا کالم نگاری کی تھی۔ کچھ عرصے تک تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس قلمی نام کے پردے میں کون سا منصور چھپا ہوا ہے (ہندوستان میں یہ کالم مجتبیٰ حسین سے منسوب کیا جاتا رہا) لیکن جب حقیقت کھل گئی تو مشفق خواجہ کے خلاف مغلظات نویسی شروع ہو گئی، خواجہ صاحب نے اپنے خلاف لکھنے والوں کو کبھی منہ نہیں لگایا، نہ ان کو کبھی ''جواب آں غزل'' کا موضوع بنایا لیکن جب دوست دریافت کرتے تو خطوط میں حقیقت بیان کر دیتے۔ اس نوع کا ایک انکشاف حسب ذیل ہے:

''کراچی کے جس رسالے میں آپ نے میرا ''ذکر خیر'' پڑھا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ ان صاحب نے میرے بکھ کالم چھاپے۔ میں نے انہیں اس بد دیانتی پر ٹوکا۔ یہ صاحب بلیک میلر ہیں، ایک میں ہی کیا انہوں نے احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، جمیل الدین عالی، انتظار حسین اور مشتاق احمد یوسفی جیسے جید ادیبوں کے بارے میں سخت دشنام طرازی کی ہے، احمد ندیم قاسمی کے خلاف لکھنے کے بعد انہوں نے مجھ سے داد چاہی تو میں نے کہا ''آج آپ قاسمی صاحب کے خلاف لکھ رہے ہیں، کل آپ اپنے والد کے خلاف بھی لکھ کر اپنی ولدیت سے انکار کر سکتے ہیں۔ بس یہ جملہ انہیں کھا گیا۔'' (مکتوب بنام محمد احسن خان۔ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۱ء)

اسی قسم کے ایک اور ''کردار'' کا ذکر انہوں نے پروفیسر جعفر بلوچ کے ایک خط میں بھی کیا اور راز ہائے درون پردہ منکشف کر دیے ہیں، اس اقتباس سے مشفق خواجہ کی دوست داری کا زاویہ بھی سامنے آتا ہے اور یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ اپنے دوستوں کے بارے میں غلط باتیں سن کر ان کی طبیعت منغض ہو جاتی تھی۔ لکھتے ہیں:

''...... صاحب سے آپ کے اتنے گہرے مراسم ہیں تو پھر انہوں نے اپنے رسالے میں ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں ''سارق اعظم'' کے ہذیانی بیانات کیوں شائع کیے...... یہ ''سارق اعظم'' صحیح معنوں میں سٹھیا گیا ہے۔ اب اپنے اور دوسروں کے نام کی ''پرچیاں'' ...... ''خطوط'' کے طور پر شائع کرا رہا ہے۔ یہ ''اخبث'' اسی قسم کے کام کر سکتا ہے۔ ٹھوس علمی کام اس کی قسمت میں نہیں، اور بیٹے ساری زندگی یہ شخص جمیل الدین عالی کی ...... برداری کرتا رہا ہے۔ اپنی کتابیں ان کے نام منسوب کیں، ان پر ایم اے کے طالب علموں سے مقالے لکھوائے لیکن جب اس کی ایک ''پرانی خواہش'' پوری نہ ہوئی تو عالی کے خلاف مضمون لکھ دیا۔ ''پرانی خواہش'' یہ تھی کہ یہ ہر سال عالی سے کہتا تھا کہ مجھے حکومت کا اعزاز ...... ''حسن کارکردگی'' دلوایئے۔ عالی نے دو چار مرتبہ اپنے کالموں میں لکھا کہ یہ اس کا مستحق ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں خود ہی اعزاز لینے سے فرصت نہیں تھی تو وہ کسی دوسرے کو کیا دلواتے۔ اس سال شاید ''سارق اعظم'' کو امید دلا دی گئی تھی اور اسے یقین تھا کہ اعزاز کا زخمی پرندہ اس کے قدموں میں ضرور گرے گا۔ مگر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ قدموں میں زخمی پرندے کی بجائے اپنا ہی دل زخم زخم پڑا ہوا

تھا۔'' (مکتوب بنام پروفیسر جعفر بلوچ۔ ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

میں ابتدا میں ادیبوں کے خطوط کے بارے میں مشفق خواجہ کا موقف لکھ چکا ہوں کہ ''ادیب کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے'' اور مشفق خواجہ کے خطوط تو رازوں کا خزینہ بھی ہیں، جن پردہ نشینوں کے نام وہ اپنے کالم ''سخن در سخن'' میں پردۂ اخفا میں رکھتے تھے، وہ ان خطوط میں بے نقاب نظر آتے ہیں۔ وہ آج کی اردو دنیا کے سب سے زیادہ باخبر ادیب نظر آتے ہیں اور ان کی زندگی کا یہ خصوصی پہلو بھی سامنے آتا ہے جس کا اظہار راشد شیخ صاحب نے اس جملے میں کر دیا ہے کہ:

''خواجہ صاحب نے اپنے قیمتی وقت اور صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے وقف کر دیا تھا۔''

(بحوالہ: ''الحمراء'' مئی ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ محمد عالم مختار حق کے کتب خانے میں
ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ء لاہور

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

خامہ بگوش، خنجر بکف

معاملہ ادب کا ہو یا معاشرے کا، اس حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں کہ ہم مصلحتوں اور منافقتوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ مصلحتیں اور منافقتیں جب ایک حد سے تجاوز کر جاتی ہیں تو ادب اور معاشرے کے جسم میں "کثیر الفاسد" ناسور سر اٹھانے لگتے ہیں۔ ایسے میں کسی ایسے ماہر سرجن کی ضرورت شدت اختیار کر جاتی ہے، جس کے ہاتھ میں بے رحم نشتر اور دوسرے میں چیر پھاڑ کا ایسا ہنر اور سلیقہ ہو کہ معاملہ غالب کے اس شعر کی صورت اختیار کر جائے کہ

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

یہ بات مسلمہ ہے کہ اردو ادب میں ایسے ماہر سرجن کا کردار "خامہ بگوش" نے بہ حسن و خوبی انجام دیا ہے، جن کے کالموں کے دو مجموعے "سخن در سخن" اور "سخن ہائے نا گفتنی" اس وقت ہمارے سامنے ہیں، جو چونتیس چونتیس کالموں کا کڑوا سچ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ کالموں کا انتخاب معروف دانشمند اور نقاد جناب مظفر علی سید نے کیا ہے اور ان کالموں کو کتابی سلیقہ عطا کرنے کی سعادت اکادمی بازیافت کے حصے میں آئی ہے۔ سید صاحب کا ایسا ہی ایک انتخاب قبل ازیں "خامہ بگوش کے قلم سے" کے عنوان سے برعظیم کے ہر دو ممالک سے اشاعت و پذیرائی کے مراحل طے کر چکا ہے۔

اس بات پہ خاصی لے دے ہو چکی ہے کہ اس معیار کے کالموں کو بھلا انتخاب کی کیا ضرورت تھی؟ مزے کی بات یہ کہ اس موقف پہ اردو زبان و ادب کے تمام مخالف دھڑے صاد کیے بیٹھے ہیں۔ بلکہ پہلے انتخاب کی بے پناہ پذیرائی کے بعد تو اس سوال کے سینگ بھی خاصے نوکیلے ہو گئے ہیں کہ ان انتخابات کو بھلا دیباچے کی کیا حاجت تھی؟ لیکن پھر سید صاحب کی شخصیت میں شامل "معروف و مرحوم" کے الفاظ اس کا جواز لیے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔

برعظیم میں اردو صحافت کا آغاز اگرچہ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعاون سے منشی سدا سکھ کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ اخبار "جام جہاں نما" سے ہو چکا تھا لیکن اردو میں شگفتہ کالم نگاری کا ڈول ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین کی زیر صدارت لکھنؤ سے نکلنے والے پرچے "اودھ پنچ" کے ذریعے ڈالا گیا۔ یہ پرچہ اگرچہ لندن سے نکلنے والے "لندن پنچ" کا تتبع تھا، ایک اعتبار سے اسے سر سید تحریک اور ان کے پرچے "تہذیب الاخلاق" ۱۸۷۰ء کا رد عمل بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد تو ہندوستان میں

پنچ اخباروں کا جنگل اگ آیا۔ جن کے ذریعے شگفتہ کالم نگاروں کی ایک فوج ظفر موج تیار ہوتی چلی گئی۔ لیکن ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو یا تو کل وقتی صحافی تھے یا پہلے صحافی اور بعد میں ادیب۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی برعظیم کی سیاست اور صحافت میں کئی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ابو الکلام آزاد، ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، شبلی نعمانی اور حسرت موہانی جیسی شخصیات اردو صحافت میں وارد ہوئیں۔ رفتہ رفتہ اس قافلے میں محفوظ علی بدایونی، عبد الماجد دریا بادی، نصر اللہ خاں عزیز، حاجی لق لق، ملا رموزی، عبد المجید سالک، چراغ حسن حسرت، خواجہ حسن نظامی، شوکت تھانوی اور قاضی عبد الغفار بھی آن شریک ہوئے۔

آزادی کے بعد بھی اردو میں فکاہی کالم نگاری کی روایت خاصی صحت مند اور توانا ہے۔ ہندوستان میں اس روایت کے سب سے بڑے امین فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین ہیں، جبکہ شاہد صدیقی، خواجہ عبد الغفور، یوسف ناظم، ظ۔ انصاری، دلیپ سنگھ، نریش کمار شاد، احمد جمال پاشا، مخلص بھوپالی، حیات اللہ انصاری، نصرت ظہیر اور جعفر عباس وغیرہ بھی اس دھارے میں کسی نہ کسی حد تک شریک رہے ہیں جبکہ پاکستان میں بھی یہ روایت خاصی مستحکم ہے۔ اس کی تفصیل میں جانا چونکہ ہمارے موضوع کا تقاضا نہیں البتہ اختصار کے ساتھ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں فکاہی کالم کی عمارت مجید لاہوری، ابن انشاء، خامہ بگوش اور عطاء الحق قاسمی کی صورت چار ستونوں کے سہارے قائم ہے۔ ان میں مجید لاہوری، ابن انشاء اور عطاء الحق قاسمی کا دائرہ کار ادب، سیاست، صحافت اور سیاحت وغیرہ تک محیط ہے لیکن خامہ بگوش نے شگفتہ کالم نگاری میں خود کو ادبی موضوعات تک محدود رکھا ہے۔ اگر ہمارے ہاں ہونے والے ادبی تبصروں کی بیوست کا خیال نہ ہو تو ان کالموں کو ادبی تبصروں کی ذیل میں بھی رکھا جا سکتا ہے، لیکن یہاں ذہن کی رسائی، قلم کی روانی، استاد لاغر مراد آبادی کی سفاکی اور اسلوب کی بے باکی نے ان ادبی تبصروں کو چیزے دیگر بنا دیا ہے۔

ان ادبی کالموں یا تبصروں نے اردو ادب میں اس لیبارٹری کا کردار ادا کیا ہے، جہاں مختلف ادبی رویوں اور رجحانات کے درجہ حرارت، بلڈ پریشر اور کولیسٹرول کی پڑتال ہوتی ہے۔ ادبی رویوں کی تطہیر کے لیے اردو ادب میں کسی ایسے ہی مستند اور نڈر سرجن کی ضرورت تھی جو نہ صرف چیر پھاڑ کا حوصلہ اور سلیقہ رکھتا ہو بلکہ متاثرہ و مفاسدہ حصوں کو کاٹ پھینکنے کا عزم بھی رکھتا ہو۔ مظفر علی سید ان کی مہارت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "ان کی کاٹ اکثر دو دھاری ہوتی ہے۔ پہلو داری کا کمال ہی یہی ہے کہ ادھر سے ادھر کا پہلو نظر نہ آئے لیکن جب دونوں طرف ہاہا کار مچتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ کون کون زد میں آ گیا۔"(۱)

اردو ادب کے مختلف رجحانات اور جملہ اصناف ان کالموں میں زیر بحث آتی ہیں لیکن ہائیکو، نثری

نظم، انشائیہ، آپ بیتی، سوانح، غیر ذمہ دارانہ تحقیق وتنقید اور علامتی افسانہ جیسی نیم پختہ اصناف کا تذکرہ کرتے ہوئے تو ان کا قلم ترنگ میں آجاتا ہے۔ انداز ملاحظہ ہو۔

''اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا تقریباً ایک تہائی حصہ غیر متعلق باتوں پر مشتمل ہے جن کی وجہ سے کتاب کی دلچسپی میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔'' (۲)

''جو لوگ ناموزونیٔ طبع کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، وہ مزاحیہ شاعری کرتے ہیں یا پھر نثری نظموں سے دل بہلاتے ہیں۔'' (۳)

''کہا جاتا ہے کہ محققوں اور نقادوں کی کوششوں سے غالب کو اس کے گناہوں کی سزا اسی دنیا میں مل گئی۔ اب اس کا داخلہ جنت ہونا یقینی ہے۔ غالب کو جنت میں جانے کے یوں تو بے شمار فائدے ہوں گے لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ محققوں اور نقادوں سے جان چھوٹ جائے گی۔'' (۴)

ناپختہ ادبی رویوں کے ساتھ ساتھ ادب کے نیم حکیموں کی بھی وہ خوب خبر لیتے ہیں۔ ایسے ادباء و شعراء کے خام ادبی شاہپارے اور نابالغ علمی تجربے خامہ بگوش کو خنجر بکف ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پھر وہ انہی خام گوشوں پر اس مہارت سے نشتر زنی کرتے ہیں کہ ''تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو'' کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ برائی کے پردے میں تحسین اور تعریف کی آڑ میں مذمت کا ہنر ان سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ قمر علی عباسی، کشور ناہید، مظہر امام، انیس ناگی، مظفر علی خاں، منظر نظیر صدیقی، عالیہ امام اور ناصر زیدی تو خامہ بگوش کے دل پسند تخلیق کار ہیں ہی ان کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر انور سجاد، ڈاکٹر سید محمد عقیل، فہمیدہ ریاض، واحق جونپوری، ڈاکٹر مبارک علی، لطیف الزماں خاں، شہرت بخاری، سحاب قزلباش، مسلم شمیم، جمیل زبیری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، محسن بھوپالی، ڈاکٹر خلیق انجم، احمد بشیر، خورشید علی خاں، کیفی اعظمی اور حسن رضوی وغیرہ کے قلم سے سرزد ہونے والی تحقیقات وتخلیقات کے لیے بھی مستقل چشم براہ نظر آتے ہیں۔ خامہ بگوش ان احباب کی تحریروں سے نہ صرف خود جی بھر کے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ اپنے قارئین کو بھی اس حظ وانبساط میں شریک کرنا ادبی فریضہ خیال کرتے ہیں۔ انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔

''شہاب صاحب کی دریا دلی کے کیا کہنے! سرکاری خزانے کا صحیح مصرف تو وہی جانتے ہیں یا پھر وہ شخص جس نے یہ ضرب المثل پہلی مرتبہ استعمال کی تھی .... حلوائی کی دکان نانا جی کی فاتحہ'' (۵)

''افتخار عارف نے شہرت کو مسئلہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ اسے بعض مسائل کے حل کا ذریعہ سمجھا ہے یہی وجہ ہے کہ آج شہرت ان کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح پرانے زمانے میں عشاق کے پیچھے رسوائی چلا کرتی تھی۔'' (۶)

''سننے میں آیا ہے کہ اب دلی میں کوئی دوسرا ایسا شخص موجود نہیں جو وہاں کے آثار قدیمہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر خلیق انجم) کے برابر معلومات رکھتا ہو۔ گویا قحط الرجال کی وجہ سے وہ آثار قدیمہ کے ماہر بھی بن گئے ہیں۔'' (۷)

''مظہر امام ہندوستان کے ان نامی گرامی ادیبوں میں سے ہیں جو بیک وقت شاعر اور نقاد ہونے کے باوجود خاصے پڑھے لکھے ہیں لیکن منکسر المزاج اتنے ہیں کہ اپنی تحریروں سے اپنا علم کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔'' (۸)

''ان (انور سجاد) کا ناول ''جنم روپ'' بڑی اہمیت رکھتا ہے، جو انہوں نے بھٹو کی پھانسی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس ناول میں بھٹو تو پھانسی کے تختے پر نظر نہیں آتے، البتہ ناول نگاری کے فن کو پھانسی لگتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔'' (۹)

''انیس ناگی ادب کے جس بلند مقام پر فائز ہیں، اس کا اندازہ ان کی کتابوں سے نہیں باتوں سے ہوتا ہے۔'' (۱۰)

اردو ادب میں ساقی فاروقی، منیر نیازی، جوش ملیح آبادی، قمر جمیل، اختر الایمان اور علی سردار جعفری وغیرہ اپنے رنگا رنگ بیانات، خودستائیوں اور لاف زنیوں کی بنا پر شہرت رکھتے ہیں۔ خامہ بگوش ان شخصیات کی غباروں کے مانند پھولی اناؤں میں ڈھنگ سے سوئی چبھونے کا فن جانتے ہیں، چند مثالیں دیکھیے:

''ساقی تو اپنے قریب کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ اپنے دائیں بائیں بھی اپنے آپ ہی کو بٹھائے رکھتے ہیں۔'' (۱۱)

''جوش کے کلام سے صحت زبان کی سند تو لی جا سکتی ہے، ذہنی صحت مندی کے لیے کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔'' (۱۲)

''یہ نوجوان، جن میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی، قمر جمیل کی سرپرستی میں اپنی ادبی فتوحات کا پرچم لہراتے ہوئے، میر وغالب کی شاعری کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے اور اتنا آگے بڑھ گئے کہ ادبی دنیا کی حدود سے باہر نکل گئے۔'' (۱۳)

پھر اخبارات کے ادبی صفحات پر چھپنے والے شاعروں ادیبوں کے انٹرویو بھی خامہ بگوش کے والوں کی مرغوب غذا ہیں۔ کتابوں پر لکھے جانے والے روایتی قسم کے دیباچے بھی ان کے قلم کو گدگداتے ہیں اور ادب کے نام پر قائم کیے جانے والے ادارے اور اکیڈمیاں بھی اپنی بے برکتیوں کے سبب ان کے ہاں نشانۂ استہزا بنتی ہیں۔ ان تینوں موضوعات کے حوالے سے مشتے از خروارے کے طور پر ایک مثال

''اپنے متعلق جون ایلیا نے کہا ہے کہ میں ایک ناکام شاعر ہوں، گزارش ہے کہ اس

قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ جہاں اہلِ نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرتے ہیں، ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں۔" (۱۴)

"یاد نہیں کہ یہ قول کسی مغربی فلاسفر کا ہے یا خود ہمارا کہ گداگری کو تو ایک سماجی برائی سمجھا جاتا ہے مگر دیباچہ نگاری کا شمار فلاحی کاموں میں ہوتا ہے۔ اب دیباچوں میں رسمی مضامین کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گویا دیباچے نہ ہوئے اقبال صفی پوری کی غزلیں ہو گئیں۔" (۱۵)

"اقبال اکیڈمی کو کراچی بدر کر کے سپردِ لاہور کر دیا گیا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس شہر میں علامہ اقبال کا مزار پہلے سے موجود تھا۔ اقبال اکیڈمی کی وجہ سے ایک ہی شہر میں علامہ کے دو مزار بن گئے۔" (۱۶)

ڈاکٹر اسلم انصاری خامہ بگوش کے کالموں کے موضوعات و مقاصد کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خامہ بگوش کا موضوعِ نظر پوری دنیائے ادب ہے، یعنی اردو کی دنیائے ادب، جس میں کتابیں، مصنف، شاعر، کالم نگار، یہاں تک کہ افسانے، غزلیں، نظمیں، انٹرویو، تبصرے اور فلیپ بھی اس دنیا کا حصہ ہیں۔ ہر وہ غلط یا صحیح بات جو تنقیدی سے اہم ہو خامہ بگوش اس کی تائید یا تردید یا تشریح پر ضرور قلم اٹھاتے ہیں، اور اس سے ان کا مقصود دل آزاری سے کہیں زیادہ ایک حقیقی تنقیدی نقطۂ نظر کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ وہ نقاد، ادیب اور شاعر سب کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ایک ترقی یافتہ اور پختہ تنقیدی شعور کے بغیر نہ اعلیٰ درجے کی تنقید وجود میں آ سکتی ہے اور نہ ہی اعلیٰ درجے کا ادب۔" (۱۷)

خامہ بگوش کا کمال یہ ہے کہ وہ بات سے بات نکالنے ہی کے فن سے آشنا نہیں بلکہ وہ بات میں بات ڈالنے کے گُر سے بھی مکمل طور پر آگاہ ہیں۔ شاعروں، ادیبوں کے انٹرویوز، بیانات اور آپ بیتیاں پڑھ کر تو ان کا قلم کان کے بجائے کمان پر نظر آنے لگتا ہے۔ ذاتی مطمعیں، جھوٹی مروتیں اور راتوں رات شہرت کے حصول کی کوششیں، جب اردو ادب کے جسم پر بدنما پھوڑے پھنسیوں کی صورت نمودار ہونے لگتی ہیں تو خامہ بگوش کا نشترِ صفت قلم حرکت میں آ جاتا ہے۔ اردو ادب کو ان موذی امراض سے محفوظ رکھنے کے لیے یقیناً ایسے ہی کڑوے سچ، کھرے تبصروں اور دبنگ لہجے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لہجے کے لیے خامہ بگوش ہی کے سے وسیع مطالعے، عریض مشاہدے اور طویل ادبی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بعض نازک مقامات پر استاد لاغر مراد آبادی کا کندھا بھی استعمال کرتے ہیں لیکن بالعموم وہ خون دو عالم اپنی گردن پر لیے ہی مشقِ ناز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو ادب میں یہ ایک مشکل ترین کام تھا، جسے خامہ بگوش نے نہایت سہولت سے انجام دیا ہے۔ قارئینِ ادب ان کے بقیہ کالموں کو بھی کتابی روپ میں دیکھنے کے لیے چشم براہ ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں کتابوں سے چند مزید مثالیں:

"وہ دن گئے جب علم محنت سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اب تو یہ چھوت کی بیماری ہے، ذرا سی بے احتیاطی سے کام بگڑ جاتا ہے۔ اسی لیے تو اسلام آباد میں جسے بھی دیکھیے عالمانہ شان سے چلتا نظر آتا ہے، حالانکہ اس کی عمر محبوبانہ شان سے چلنے کی ہوتی ہے۔" (۱۸)

"عروضی غلطی سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آدمی بلا ضرورت شعر کہے۔" (۱۹)

"خورشید صاحب نے یہ کتاب لکھنے کے لیے غزل کی تکنیک سے کام لیا ہے، جو بات جہاں یاد آ گئی لکھ دی۔ اس کا خیال نہیں کیا کہ مطالب میں رابطہ یا تسلسل رہتا ہے یا نہیں۔" (۲۰)

"ڈاکٹر سلیم اختر ان معدودے چند اہلِ قلم میں سے ہیں، جو بیک وقت افسانہ نگار، نقاد اور ادبی مورخ ہیں لیکن تینوں حیثیتیں اتنی مستحکم ہیں کہ کیا مجال کوئی ان کی تنقید کو افسانہ و افسوں کا نام دے سکے یا ان کی ادبی تاریخ کو طبع زاد کہانیوں کا مجموعہ کہہ سکے۔ وہ جب بھی کسی موضوع پر لکھتے ہیں، ڈوب کر لکھتے ہیں بلکہ قاری کو بھی گلے گلے ڈبو دیتے ہیں۔" (۲۱)

"ان (ڈاکٹر عبادت بریلوی) کی جوانی کی تحریریں تو ایسی ہیں کہ ان میں نہ صرف وہ خود بوڑھے نظر آتے ہیں بلکہ ان کے پڑھنے والے بھی کہولت و کسالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔" (۲۲)

"دوسروں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے وہ (انیس ناگی) کسی مصلحت کو اور اپنے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے کسی احتیاط کو خاطر میں نہیں لاتے۔" (۲۳)

حواشی

۱۔ دیباچہ، مظفر علی سید — مشمولہ سخن در سخن و سخن ہائے نا گفتنی، ص ۱۴
۲۔ کالم، جوش اور ان کے مصرع بردار — مشمولہ سخن در سخن، ص ۱۶۹
۳۔ کالم، شگفتہ بیانی یا آشفتہ بیانی — سخن ہائے نا گفتنی، ص ۸۹
۴۔ کالم، غالب شناسی یا گھی — سخن ہائے نا گفتنی، ص ۳۳
۵۔ کالم، سخن ہائے نا گفتنی — سخن ہائے نا گفتنی، ص ۴۳
۶۔ کالم، دستارِ فضیلت یا فضیلت مستعار — سخن ہائے نا گفتنی، ص ۵۱
۷۔ کالم، ادبی تحقیق یا پولیس کی تفتیش — سخن ہائے نا گفتنی، ص ۸۶
۸۔ کالم، دہشت ادب کی سیاحی یا سیاہی — سخن ہائے نا گفتنی، ص ۹۵

۹۔ کالم، اردو ادب کے مہاراج کتھک　　سخن ہائے ناگفتنی، ص ۱۲۰
۱۰۔ کالم، ادیبوں کی جنگ زرگری　　سخن ہائے ناگفتنی، ص ۱۳۳
۱۱۔ کالم، لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر　　سخن در سخن، ص ۵۷
۱۲۔ کالم، جوش اور فتنۂ آخر الزماں　　سخن ہائے ناگفتنی، ص ۶۳
۱۳۔ کالم، نقاد یا گورکن　　سخن در سخن، ص ۱۰۶
۱۴۔ کالم، شاعری یا معجون شباب آور　　سخن در سخن، ص ۷۱
۱۵۔ کالم، دستِ بخیل میں قلم　　سخن در سخن، ص ۱۵۴
۱۶۔ کالم، شگفتہ بیانی یا آشفتہ بیانی　　سخن ہائے ناگفتنی، ص ۹۰
۱۷۔ کالم، مضمون، خامہ بگوش کی ادبی کالم نگاری پر ایک نظر
مطبوعہ ''ادبِ دوست'' جون ۲۰۰۰ء ص ۴۰
۱۸۔ کالم، دستار فضیلت یا فضیلت مستعار　　سخن در سخن، ص ۱۵۱
۱۹۔ کالم، شاعری یا معجون شباب آور　　سخن در سخن، ص ۷۰
۲۰۔ کالم، کیفی اعظمی فن اور شخصیت　　سخن در سخن، ص ۱۱۱
۲۱۔ کالم، نقاد اور لذتِ دشنام یار　　سخن ہائے ناگفتنی، ص ۳۲
۲۲۔ کالم، واقعہ، حادثہ، سانحہ یا لطیفہ　　سخن ہائے ناگفتنی، ص ۶۴
۲۳۔ کالم، ادیبوں کی جنگ زرگری　　سخن ہائے ناگفتنی، ص ۱۳۳

بحوالہ کتابی سلسلہ ''دبستان'' لاہور (فروری۔اپریل ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ مرحوم کی یاد میں

ماہنامہ ''الحمرا'' شمارہ مارچ ۲۰۰۵ء میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے ''مشفق خواجہ کے سانحۂ رحلت پر چند حرف'' کے عنوان سے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان میں سے بعض سے مشفق خواجہ مرحوم کے جاننے والوں کو اختلاف ہوگا۔ ڈاکٹر معین صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''میرے ان کے مراسم ۱۹۵۹ء سے تھے۔ لاہور کی حد تک کم عمروں میں میرے علاوہ ان کا اتنا پرانا جاننے والا، شاید ہی کوئی اور ہو۔'' یہ کم عمری کی شرط بھی خوب ہے۔ معین صاحب اب ۶۲ کے پیٹے میں ہیں۔ ان کے نزدیک کم عمری کی حد کون سی ہے؟ دراصل وہ ڈاکٹر وحید قریشی کو، بائی پاس، کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب عمر میں ان سے کہیں بڑے ہیں اور ان کے مشفق خواجہ مرحوم کے ساتھ مراسم ڈاکٹر معین صاحب سے زیادہ دیرینہ ہیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے مشفق خواجہ مرحوم سے اپنے ۴۵ سالہ مراسم کا دعویٰ کیا ہے لیکن اتنے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے مراسم کے باوجود انہوں نے مرحوم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے ''ہجو ملیح'' ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ان کے ذخیرۂ کتب کی بڑی شہرت رہی۔ قدیم اور جدید ماخذ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس حوالے سے ان کا جو کام سامنے آیا، وہ بہت اچھا ہے، بے حد معیاری لیکن بہت کم۔ بابائے اردو پر ان کے الماریوں میں بڑا قیمتی مال مسالہ موجود تھا لیکن وہ اس موضوع پر سوچتے بہت رہے، کر کچھ نہ پائے۔ ان کے وقت کا بیشتر حصہ ان کے گھر پر آباد رہنے والی مجلس آرائی کی نذر ہوا۔ وہ بڑے بامروت آدمی تھے اور بہت زیادہ دیا دگار علمی کارناموں کے سرانجام دینے کے اہل تھے۔''

مشفق خواجہ مرحوم سے راقم الحروف کے مراسم ۴۵ سالہ تو نہیں البتہ ۳۰ سالہ ضرور تھے۔ میری مرحوم سے نہ صرف باقاعدہ خط و کتابت رہی بلکہ تین مواقع پر، ایک ایک ہفتہ ان کو قریب سے دیکھنے ان کے علمی کاموں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے اور ان کے صرفِ اوقات کے مشاہدے کا موقع ملا۔ یہ ملاقاتیں کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہوئیں۔ ڈاکٹر معین صاحب نے فرمایا ہے کہ ''ان کے ذخیرہ کتب کی بڑی شہرت رہی۔'' کیا معین صاحب کو اتنی طویل دوستی کے باوجود ایک بار بھی ان کے ذاتی کتب خانہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے جناب خالد احمد کے مجلس اور ڈاکٹر معین الدین عقیل کے ذاتی کتب خانے تو نہیں دیکھے، حالانکہ ان کے ذخیرۂ کتب کی بڑی شہرت سنی تھی، لیکن لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، کراچی، ملتان، پشاور اور فیصل آباد وغیرہ میں اپنے بعض احباب کے ذاتی

موضوع پر سوچتے بہت رہے، کر کچھ نہ پائے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ مشفق خواجہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھے جو کتب و رسائل میں پہلے سے شائع شدہ مضامین کو ادھر ادھر سے اٹھا کر نصف درجن نئی کتابیں تیار کر لیتے ہیں اور پھر ان پر بطور مرتب، مولف یا مصنف اپنا نام درج کر کے دل خوش کرتے ہیں۔ مشفق خواجہ ہمیشہ باقاعدہ تحقیقی منصوبہ بندی کر کے اپنا کام کرتے تھے اور پھر اس کی تکمیل کر کے دم لیتے تھے۔ مشفق خواجہ کی بیگم آمنہ صدیقی نے شادی سے پہلے "افکار عبد الحق" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی تھی۔ وہ اردو اور اسلامی تاریخ میں ایم اے کر کے ایک مقامی کالج میں اردو کی لیکچرار بن گئیں۔ وہ چاہتیں تو بابائے اردو مولوی عبد الحق پر پی ایچ ڈی کرتیں ان کے لیے کون سا مشکل کام تھا جبکہ بقول معین صاحب بڑا قیمتی مال مسالہ گھر میں موجود تھا۔ مگر انہوں نے داغ پر پی ایچ ڈی کرنے کو ترجیح دی۔ اگرچہ ان کا ارادہ سرسید اور مولوی عبد الحق پر بھی کام کرنے کا تھا لیکن داغ پر معیاری کام کے فقدان کی وجہ سے ان کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی۔

خود مشفق خواجہ صاحب نے اردو میں ایم اے کیا تھا اور ان کا ایم اے کا تحقیقی مقالہ اردو میں "آپ بیتی" کے موضوع پر تھا۔ یہ مقالہ ابھی تا ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور میرے بار بار اصرار کے باوجود وہ اس کی اشاعت سے گریزاں رہے کیونکہ وہ ان کے اپنے مقرر کردہ تحقیقی معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ چاہتے تو وہ خود بھی بابائے اردو مولوی عبد الحق پر تحقیقی کام کر سکتے تھے کیونکہ جتنا وہ مولوی عبد الحق کے قریب رہے، اتنا اور کون رہا ہوگا؟...... لیکن ان کی دلچسپی کے موضوعات دوسرے تھے اور انہوں نے اپنے پسندیدہ موضوعات کو ہی تحقیق کے لیے منتخب کیا اور ان پہ اعلیٰ پائے کا کام کیا۔ معین صاحب بتائیں کہ ان سمیت، مولوی عبد الحق پر اور کون کون بہت سوچتا رہا ہے اور کون اس موضوع پر وقیع تحقیقی کام کر پایا ہے؟

ڈاکٹر معین الرحمن صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان (مشفق خواجہ) کے وقت کا بیشتر حصہ ان کے گھر پر آباد رہنے والی مجلس آرائی کی نذر رہا۔" امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے نہایت سختی سے اپنا ایک ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا اور اس کے مطابق کام بھی کرتے تھے اور تفریح کی خاطر گپ شپ بھی۔ اس معاملے پر میری بارہا ان سے ٹیلی فون پر بھی گفتگو ہوئی، خطوں میں بھی اس کا ذکر ہوا اور تین برس پہلے جب میں کراچی گیا اور مشفق خواجہ کے در دولت پر تین دن مسلسل (وقت طے کر کے) حاضر ہوتا رہا۔ وہ عموماً صبح دیر سے اٹھتے تھے لیکن دس ساڑھے دس بجے تک ناشتا کر کے اپنے کام میں جٹ جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ ایک گھنٹہ قیلولہ کرتے اور پھر تازہ دم ہو کر اپنے تحقیقی کام میں کھو جاتے۔ رات دس ساڑھے دس بجے وہ رات کا کھانا کھاتے اور پھر نیند آنے تک تازہ آمدہ کتب و رسائل اور خطوط کا مطالعہ کرتے، عموماً ایک دو بجے کے قریب وہ سوتے۔ اتوار کے دن گیارہ بجے کے وقت ان کے دوست احباب ان کے ناظم آباد والے گھر میں جمع ہوتے جو بیک وقت ان کی رہائش گاہ، کتب خانہ اور دار المطالعہ تھا۔ یہ مجلس یاراں دو ڈھائی بجے تک جاری رہتی۔ مجھے بھی اس مجلس میں شرکت کا موقع ملا۔

مقامی اور غیر مقامی، خواتین و حضرات، سکالرز اور ان کے مداح سب یہاں جمع ہوتے تھے اور ادبی گپ شپ ہوتی تھی۔ اڑھائی بجے بعد دوپہر یہ مجلس برخواست ہو جاتی تھی اور اگر کوئی باہر کا مہمان مشفق خواجہ صاحب سے ملنے کے لیے آیا ہوتا تو وہ اسے روک لیتے اور تین چار اور دوستوں کو بھی۔ پھر اپنی پرانی سفید رنگ کی سوزوکی مہران گاڑی میں انہیں لاد کر کسی قریبی ریستوران میں لے جاتے اور پرتکلف کھانا کھلاتے۔ وہ خود بہت کم بلکہ پرہیزی کھانا کھاتے لیکن کھانے کا نفیس ہونا شرط تھی۔ میں نے جب بھی ان کے معمولات زندگی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہی میرا چلن ہے۔ ہفتے میں چھ دن ڈٹ کر کام کرتا ہوں اور اتوار کا دن تفریح کے لیے وقف ہے۔ اس دن شام کو وہ عموماً کلفٹن چلے جاتے اور مشتاق احمد یوسفی اور چند بے تکلف دوستوں کے ساتھ رات گئے ساحل سمندر پر ہلا گلا کرتے۔ ہاں اگر بھارت سے یا کسی یورپی ملک سے کوئی سکالر یا بے تکلف دوست ان سے ملنے کے لیے آ جاتا تو وہ اپنے معمولات میں تبدیلی بھی کر لیتے تھے۔ لیکن عموماً وہ اپنے قیمتی وقت کا بیشتر حصہ اپنے علمی کاموں میں صرف کرتے۔ سوائے مخصوص اوقات کے، وہ ٹیلی فون بھی خود نہیں سنتے تھے بلکہ ان کے دو قریبی عزیز جو انہیں کے پاس رہتے تھے، ان میں سے کوئی فون سنتا اور اگر مشفق خواجہ صاحب اس سے بات کرنا پسند کرتے تو بات کرتے۔ انہوں نے ان لڑکوں کو بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ سوائے چند مخصوص احباب کے باقی فون کرنے والوں کو ساڑھے دس بجے رات کے بعد فون کرنے کی ہدایت کریں۔ یوں میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ مشفق خواجہ صاحب کے وقت کا بیشتر حصہ گھر پر آباد رہنے والی مجلس آرائی کی نذر نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ کام کے وقت صرف اپنے کام کو ترجیح دیتے تھے۔ یوں بھی وہ جس نوعیت کا تحقیقی کام کرنے کے عادی تھے، اس کو وہ کر ہی نہیں سکتے تھے اگر وہ اپنا وقت بے کار قسم کی مجلس آرائی میں برباد کرتے رہتے۔

ڈاکٹر معین صاحب نے اس تعزیت نامے میں ایک اور سخن گسترانہ بات کہی ہے۔ مرحوم مشفق خواجہ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: "واقعی انسان تھے، فرشتہ نہیں تھے۔ انسان، جو بیک وقت کمزوریوں اور خوبیوں کا حامل ہوتا ہے۔ انہیں بہتوں سے شکایتیں تھیں، بہتوں کو ان سے رہتی ہوں گی۔ لیکن سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ کہ وہ اپنے "کرم فرماؤں" سے "دو بدو" نہیں ہوتے تھے۔ یہ کام ان کے چشم و ابرو ہلائے بغیر ان کے نیاز مند انجام دے لیتے تھے۔ وہ انہیں روکتے رہ جاتے تھے اور بعض صورتوں میں اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔"

مشفق خواجہ مرحوم واقعی انسان تھے لیکن ایسے انسان کہ بقول خواجہ میر درد:

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

مجھے گزشتہ ۳۰ برسوں میں بے شمار لوگوں سے مشفق خواجہ کے بارے میں گفتگو کا موقع ملا اور میں برملا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ واحد آدمی ہیں جن کی تعریف میں ہر شخص رطب اللسان تھا۔ میں نے کسی صاحب علم سے ان کی برائی نہیں سنی سوائے ناصر بغدادی مدیر "بادبان" کراچی کے جو اپنے رسالے میں

ان کے بارے میں زہر اگلتے رہتے تھے۔ صرف انہیں کے بارے میں نہیں بلکہ ان کے دوست احباب کے بارے میں بھی (مثلاً جمیل الدین عالی اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ)۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ ان میں کمزوریاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انہیں کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ کوئی ان کے رویے کا شاکی تھا۔ اپنے ادبی کالموں میں البتہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرلیا کرتے تھے (مثلاً نظیر صدیقی، راغب مراد آبادی، ساقی فاروقی وغیرہ) لیکن جن پر وہ چوٹ کرتے تھے وہ بھی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مشفق خواجہ کی سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دل آزاری سے کوسوں دور تھے۔ جو لوگ انہیں پسند نہیں تھے، وہ ان کا ذکر بھی کبھی تحقیر آمیز پیرائے میں نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی گروپ اور وزیر آغا گروپ دونوں کے ساتھ ان کے یکساں دوستانہ مراسم تھے اور وہ بھی ان کی اسی طرح تعریف کرتے تھے۔ کاش ڈاکٹر معین صاحب بھی ان کا نام لیتے۔ صرف ایک دو آدمیوں کا ہی نام لے دیتے جن سے ان کو اور ان سے جن کو شکایتیں تھیں۔ اسی طرح وہ دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر بھی چلانے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی وہ کسی کو چشم و ابرو کا اشارہ کرکے کسی دوسرے پر چڑھ دوڑنے کا بشکارہ دیتے تھے۔ ان کے اپنے ہاتھ میں قلم تھا۔ وہ بات کہنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ وہ کسی کام میں کسی کے محتاج نہ تھے بلکہ دوسرے، ان سے مدد کے ہمیشہ طلبگار رہتے تھے۔ جن باتوں کو وہ غلط سمجھتے تھے، ان کا اظہار، بذریعہ زبان اور بذریعہ قلم کرنے میں انہیں کوئی باک نہ تھا۔ معین صاحب کا اشارہ آخر مشفق خواجہ کے کن نیاز مندوں کی طرف ہے، جو ان کا کام (؟) ان کے چشم و ابرو ہلائے بغیر، انجام دے لیتے تھے کیا ڈاکٹر تحسین فراقی؟ کیا پروفیسر جعفر بلوچ؟ کیا ڈاکٹر عارف ثاقب؟ کیا رفاقت علی شاہد؟ کیا سید قدرت نقوی؟ یا کوئی اور بزرگ شخصیت؟

مشفق خواجہ مرحوم کو اپنے "کرم فرماؤں" سے "دوبدو" ہونے کی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ ان کی کبھی یہ خواہش رہی کہ ان کے نیاز مند، ان کے چشم و ابرو ہلائے بغیر، ان کا کام سرانجام دیں۔ بلکہ خود ڈاکٹر معین الرحمن صاحب جیسے "کرم فرما" مشفق خواجہ صاحب کی چشم التفات کے منتظر رہتے تھے کہ وہ انہیں ان کے مخالفوں کے حملوں سے بچائیں۔ میرے سامنے اس وقت مشفق خواجہ کے نام ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب کا ۳ مارچ ۲۰۰۱ء کا خط پڑا ہے، جس کی نقل (فوٹو سٹیٹ کاپی) مجھے جناب مشفق خواجہ نے ہی عطا فرمائی۔ یہ خط درج ذیل ہے:

برادرم مکرم مشفق خواجہ صاحب:

سلام و احترام!

ہند تا سند، جو گرد اڑائی جا رہی ہے، آپ اس سے بے خبر نہیں، یہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں پہلے بھی اس جانب آپ کی توجہ مبذول کرا چکا۔ آپ ہی اسے روکنے پر قادر ہیں۔

میں کمزور آدمی ہوں، مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں گی لیکن سازش یا سیاست میرے خمیر ہی میں نہیں

بہر طور میں کسی حجاب یا تذبذب کے بغیر معذرت اور معافی کا طالب اور عفو و درگزر کا امیدوار ہوں۔

طبی وجوہ سے شکر مجھ پر حرام ہے اور جو مہم چلائی جا رہی ہے، وہ میرے لیے شدید فشار خون کا باعث ہے جس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ احساس لے کر نہ جاؤں اور یہ تلخ یاد اور یقین میرے مختصر گھرانے کا اثاثہ نہ بنے کہ آپ "بچاؤ" کی صورت پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ آپ کی توجہ اور شفقت سے محروم رہا بلکہ آپ کے اغماض کا شکار ہوا......

اپنے یہ محسوسات برادر گرامی ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے توسط آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں تاکہ لازماً اور جلد تر آپ تک پہنچ جائیں۔ توجہ کا طالب (دستخط) معین الرحمن

نقل برائے مخلصانہ توجہ بخدمت

۱۔ خواجہ گرامی ادا جعفری صاحبہ، کراچی

۲۔ حسین مجروح صاحب، لاہور

۳۔ رشید حسن خاں صاحب، شاہجہانپور

۴۔ کالی داس گپتا رضا، بمبئی

(بحوالہ: "الحمراء" اپریل ۲۰۰۵ء)

آدھا کراچی

اردو ادب میں قدم رکھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کراچی جانے کا قصد کیا۔ ادبی دوستوں نے مشورہ دیا کہ اور کسی سے بے شک نہ ملنا لیکن مشفق خواجہ سے ضرور ملنا کہ وہ "آدھا کراچی" ہیں۔ جو کتاب ان تک پہنچ گئی سمجھو آدھے کراچی تک پہنچ گئی۔ مشفق خواجہ کے لیے "آدھا کراچی" ہونے کا خطاب میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ چونکہ یہ ابھی سنی سنائی بات تھی۔ اس لیے پورا یقین بھی نہیں تھا۔ لیکن جب کراچی جا کر مشفق خواجہ کے گھر پر حاضری دی تو اس بات پر ایمان لانا پڑا۔ ان کی نشست گاہ کا عالم ہی کچھ ایسا تھا۔ سیدھی سیدھی پندرہ بیس سیڑھیاں ختم ہو کر ایک چھوٹے سے کمرے میں کھلتی تھیں جسے استقبالیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھار خود خواجہ صاحب دروازہ کھولتے یا پھر ان کے ملازم خاص صوفی عبدالرشید صاحب یہ فریضہ سرانجام دیتے جن کے حوالے سے وہ برملا کہا کرتے تھے کہ صوفی صاحب کی نظریں ان کے کتب خانے پر لگی ہیں ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی وہ کتابیں ٹھیلے پر لاد کر گلیوں بازاروں میں فروخت کرنے نکل کھڑے ہوں گے۔ خواجہ صاحب کے صوفی صاحب کی طرف سے مشکوک ہونے کی کیا وجوہات رہی ہوں گی، اس بارے میں خواجہ صاحب نے کبھی روشنی نہیں ڈالی۔ صوفی صاحب، خواجہ صاحب کی اس پیش گوئی پر محض مسکرا کر رہ جاتے۔

استقبالیے کے ساتھ ہی ایک سجا سا کمرہ تھا جہاں خواجہ صاحب ہر اتوار کو ادیبوں، شاعروں اور ادب نواز لوگوں سے عام ملاقات کیا کرتے تھے۔ جبکہ ہفتے کے باقی ایام وہ عموماً تنہائی کے عالم میں مطالعے اور تحقیق پر صرف کرتے تھے۔ خواجہ صاحب سے میری فون پر کئی بار گفتگو ہو چکی تھی انہوں نے نام بتانے پر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے استقبال کیا اور وہاں بیٹھے ہوئے دیگر احباب سے میرا تعارف کروایا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے انہیں اپنی کتاب "شہاب نامہ کی حقیقت" ڈاک سے بھجوانے کے ایک دو ماہ بعد عید کے موقعے پر ان کی رائے جاننے کی غرض سے فون کیا تو انہوں نے دعا سلام کے بعد یہ کہتے ہوئے میرا خون سیروں بڑھا دیا۔ "آپ کی کتاب نے مجھے صحت یاب کر دیا (وہ ان دنوں علیل تھے) میں نے آپ کی کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی۔" خواجہ صاحب نے مجھ سے میری آنے والی کتابوں کے حوالے سے پوچھا، جس پر میں نے انہیں اپنے ادبی منصوبے بتائے۔ دوران گفتگو پتہ چلا کہ وہ میری دیگر کتابیں بھی میری طرف سے بھجوائے بغیر ہی خرید کر پڑھ چکے ہیں۔ انہوں نے اسی ملاقات میں یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی ضرورت کی ہر کتاب، کسی نہ کسی طریقے سے حاصل کر لیتے ہیں اور ان کتابوں کا سلسلہ

ہندوستان اور دیگر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ پورے کمرے میں کتابیں ہی کتابیں بھری تھیں اور غالباً یہی حال باقی گھر کا بھی تھا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ بھی لاہوری ہیں۔ وہ حوالے کے ساتھ بات کرنے کے عادی تھے، دوسروں کی طرح مشکوک قسم کی باتیں کرنا ان کی روایت نہیں تھی۔ انہوں نے بے شمار طالب علموں کو اعلیٰ سطح کے مقالے کروانے میں ہر طرح کی مدد کی۔ وہ ایسے طالب علموں کو قیام و طعام کی سہولت تک فراہم کرتے تھے اور طالب علم کی صلاحیت اور جذبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تحقیقی کام میں معاونت کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کا سب سے بڑا پہلو ہر ملاقاتی کو پوری توجہ دینا تھا۔ ادبی سطح پر مجھے ان کا کالم بے حد پسند تھا، جسے وہ "خامہ بگوش" کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک وہ قارئین سے چھپے رہے، لیکن مقبولیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تلاش شروع ہوئی اور لوگ ان سے ملنے کے شائق ہوئے۔ لیکن وہ شہرت پسند آدمی نہیں تھے۔ ورنہ آج کیا ادیب اور کیا صدر اور وزیراعظم بھی میڈیا کے بغیر خود کو اپاہج تصور کرتے ہیں۔ جب ان کے قارئین کی تلاش میں شدت آئی تو انہوں نے اپنے ایک دوست حمزہ فاروقی کو ڈمی بنا کر بطور خامہ بگوش لوگوں کے سامنے پیش کیا لیکن وہ اچھی اداکاری نہ کر سکے اور لوگوں پر یہ بات کھل گئی کہ اصل خامہ بگوش، مشفق خواجہ ہی ہیں۔

ادیبوں کے حوالے سے ان کی معلومات بڑی اپ ٹو ڈیٹ تھیں اور وہ ادیبوں کی ISI کا درجہ رکھتے تھے۔ بیشتر ادیبوں کی تو انہوں نے باقاعدہ فائلیں بنا رکھی تھیں۔ خدا خیر کرے، وہ فائلیں غلط ہاتھوں میں نہ چلی جائیں۔ انہی معلومات کا بھرپور استعمال وہ ادیبوں کے حوالے سے اپنے مشہور کالم لکھتے ہوئے کرتے تھے۔ دو چار خوش قسمت ادیبوں کے سوا کوئی ان کی طنز نگاری سے بچ نہ پایا جس میں بے باکی اور بے لحاظی کا عنصر بڑا نمایاں تھا اور اسی چیز نے انہیں طنز و مزاح نگاروں میں منفرد مقام عطا کر دیا۔

میں نے جب ادیبوں، شاعروں کے حوالے سے اپنی مزاحیہ سیریز "اردو کی آخری مکمل کتاب" شروع کی تو ایک عظیم خاکہ نگار نے اسے مشفق خواجہ کے انداز نگارش میں لکھی ہوئی کتاب قرار دیا جبکہ خود خواجہ صاحب نے اسے ایک حیران کن اسلوب کی ایجاد قرار دیا۔ ادب سے وابستگی نے خواجہ صاحب کا تخلیقی پہلو نسبتاً کم سامنے آنے دیا جبکہ نمایاں تحقیقی پہلو رہا۔ انہوں نے "ابیات" کے نام سے اپنا ایک اردو کلام بھی شائع کیا لیکن وہ خود بھی بطور شاعر اپنی پہچان کروانے کی خواہش نہیں رکھتے تھے چنانچہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی یہ کتاب جن دوستوں کو بطور تحفہ دی تھی کچھ عرصے بعد بہانے بہانے سے واپس لینی شروع کر دی۔ "کلیات یگانہ" کی تدوین کو ان کا سب سے بڑا کارنامہ کہا جاتا ہے لیکن اس کے ٹائٹل پر بھی انہوں نے اپنا نام نہیں دیا جس سے ان کی بے نیازی کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۸۰ء میں "تخلیقی ادب" کے نام سے پانچ شمارے شائع کیے جنہیں اپنی جگہ ایک بڑی ادبی حیثیت حاصل ہے۔ مشفق خواجہ صاحب کا نام سنجیدہ ادب میں بہت بڑا تھا جبکہ پاپولر ادب سے انہیں کوئی علاقہ نہ تھا۔ مخطوطات کا جتنا بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا شاید ہی کسی اور محقق کے پاس ہو۔ انہوں نے "جائزہ مخطوطات اردو" کے نام سے

ایک ضخیم کتاب کی پہلی جلد بھی مرتب کی۔ ان کے اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ نوجوان ادیبوں کو بڑھاوا دینا اور بزرگ ادیبوں کو راہ راست پر لانا ان کا بڑا وصف تھا۔ ان سے ہونے والی چند ملاقاتوں میں سے ایک میں چند اور باتوں کے علاوہ یہ بھی ذکر آیا کہ میں اپنے طویل ناول "نابدان" میں اپنی والدہ کے بچپن کا تذکرہ بھی کر رہا ہوں جنہوں نے یتیم خانے میں پرورش پائی لیکن اس کے باوجود نہ تو کسی احساس کمتری کا شکار ہوئیں بلکہ اولاد کو خود اعتمادی جیسی دولت عطا کی۔ انہوں نے اس حوالے سے کچھ واقعات زبانی سنے اور کہا کہ وہ ناول کا یہ حصہ تو ضرور پڑھنا چاہیں گے اور اگر ممکن ہو تو انہیں اس حصے کی فوٹو کاپی فراہم کر دی جائے۔ افسوس کہ میں ان کی یہ خواہش پوری نہ کر سکا۔

انہوں نے کالم نگاری کے عین عروج پر نہ لکھنے کا اعلان کیا اور اس پر قائم بھی رہے۔ اردو ادب میں غالباً ادبی ریٹائرمنٹ کی یہ واحد مثال ہے۔ خواجہ صاحب کو دلی میں خلیق انجم نے تصاویر کے البم کے بجائے علمی مضامین کا پلندہ پیش کیا تو خواجہ صاحب نے حیرت کے ساتھ ساتھ مایوسی کا بھی اظہار کیا۔ انہوں نے ادبی کالم نگاری کے ذریعے دوستوں سے زیادہ دشمن بنائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو ادب کے قارئین کے لیے یہ کالم تبرک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق لاہور کے ایک علمی خانوادے سے تھا اور "انجمن ترقی اردو" نے ان کے لیے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ لوگ اکثر ان سے ان کے ذرائع آمدنی کے حوالے سے پوچھا کرتے تھے جس کا جواب وہ سیونگ سرٹیفکیٹس تھے جو انہوں نے اپنی نوجوانی ہی میں خریدے تھے کیونکہ انہیں ایک عرصے تک گھر والوں کی طرف سے مالی مدد حاصل رہی تھی۔

مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کے ادبی اثاثے ڈاکٹر سید معین الرحمن اور مشفق خواجہ کے درمیان زیادہ تر تقسیم ہوئے اور دونوں نے ان کی جی جان سے حفاظت بھی کی۔ مشفق خواجہ کی وفات کے بعد یہ بڑے ادبی اداروں کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان ادبی اثاثوں کی حفاظت کے لیے آگے بڑھیں اور اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ بصورت دیگر یہ ایک دوہرا ادبی نقصان ہوگا، جس کی تلافی بھی نہ ہو سکے گی۔

(بحوالہ ماہنامہ "الحمرا" اپریل ۲۰۰۵ء)

وحید الرحمن خان

ایک مشفق محقق کی یاد میں

مشفق خواجہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن ہمارے دلوں میں اور اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ ایک عظیم انسان تھے اور جب ان کے لیے "عظیم" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو یہ قطعاً مبالغہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ ان کی "عظیم المرتبت عظمت" کو بیان کرنے کے لیے اس لفظ میں اتنی وسعت اور معنویت نہیں کہ حق ادا کر سکے۔ خواجہ صاحب کی وفات ایک بہت بڑا قومی اور ادبی المیہ ہے۔ ان کی وفات میرے لیے ذاتی صدمہ اور نقصان ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان کی شفقتیں حاصل رہیں۔ وہ میرے حال پر بہت مشفق اور مہربان تھے۔ دراصل خرد نوازی ان کی شخصیت کا ایک اہم اور قابل قدر پہلو تھا۔ وہ ہمیشہ نوجوان ادیبوں اور طالب علموں کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کیا کرتے اور انہیں علمی و ادبی کاموں کی جانب متوجہ اور ہر دم آمادہ رکھتے۔ مشفق خواجہ صاحب کا کتب خانہ وسیع تھا اور ان کا خانۂ دل کتب خانے سے بھی وسیع تھا۔ ان کے کتب خانے کے دروازے طالب علموں کے لیے کھلے رہتے اور اگر کوئی طالب علم کسی کتاب کے بارے میں ان سے دریافت کرتا تو نہایت فیاضی سے وہ کتاب عنایت کر دیتے۔ ان کی علم دوستی، علم پروری اور بندہ نوازی بے مثال تھی۔ وہ شفیق بھی تھے اور خلیق بھی...... اور یہی وجہ ہے کہ ان کے نیاز مندوں میں بے شمار نوجوان ادیب بھی شامل ہیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ "نیاز مندان مشفق" کا ایک کافی بڑا حلقہ تشکیل پا گیا تھا اور اس حلقے کے افراد صرف کراچی شہر میں نہیں تھے بلکہ ملک کے طول و عرض میں موجود ہیں۔ خواجہ صاحب کے انتقال کے بعد سب "درد کے رشتے" میں منسلک ہو گئے ہیں۔

مشفق خواجہ ذاتی تشہیر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چند برس قبل جب میں نے ایم فل کے لیے "خامہ بگوش" کا موضوع منتخب کیا اور تحقیق کی غرض سے کراچی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کافی کوشش کی۔ بہت سے دوسرے موضوعات بتائے اور ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ لیکن وہ ان محققین میں سے نہیں تھے، جو اپنے دوستوں کو از خود نہ صرف تمام تحقیقی سرمایہ سپرد کر دیتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں مقالہ بھی سپرد قلم کر دیتے ہیں۔ وہ شہرت سے گریزاں تھے اور ان کے انکار میں وضع داری اور شائستگی تھی۔ ان کی ادا سے دلنوازی [illegible] کہ مجھ جیسے عام اور ادنیٰ طالب علم کے لیے انہوں نے ایک ہوٹل میں ٹھہرانے کا اہتمام کیا۔ ان کی انکساری، ادنیٰ کو اعلیٰ کرنے کے ہنر سے آشنا تھی۔ ایک بار وہ میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے

تھے۔ اس روز مجھے اپنا گھر کتنا بے سروساماں نظر آیا تھا۔

مشفق خواجہ کے دولت خانے (علم بڑی دولت ہے تو ملک بھر میں ان کے گھر سے بڑا دولت خانہ
کسی کا نہیں ہو سکتا کہ جہاں پچاس ہزار کے قریب کتابیں موجود ہیں) پر ہر اتوار کو ایک غیر رسمی
محفل منعقد ہوتی جس میں ہر عمر، ہر طبقے اور ہر ذہن کے افراد شریک ہوتے۔ نوجوان ادیبوں کی ایک
تعداد بھی ان محفلوں میں شرکت کرتی اور علم، تہذیب اور شائستگی کے کئی قرینوں سے آشنا ہوتی۔ مجھے بھی ان
محفلوں میں دو تین بار حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور جب میں رخصت ہوا تو میرے ہونٹوں پر یہ
شعر تھا۔

ان کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

مشفق خواجہ ایک سنجیدہ محقق، نقاد اور شاعر تھے لیکن روزمرہ زندگی میں حد درجہ زندہ دل اور [illegible]
مزاج تھے۔ وہ ان ادیبوں میں سے نہیں تھے جن کی افسردہ دلی، انجمن کو افسردہ کر دیتی ہے بلکہ ان کی
موجودگی سے تو محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔ ان کی گفتگو شوخ و شنگ "اقوالِ محال" کا نمونہ تھی۔
ان کی باتوں اور جملوں کی جمع آوری کی جائے تو "شگفتہ ملفوظات" کا ایک مجموعہ ترتیب پا جائے۔
اس موقع پر خواجہ صاحب کی چند مزے مزے کی باتیں یاد آ رہی ہیں جنہیں ایک ہی پیراگراف میں [illegible]
رہا ہوں۔ خواجہ صاحب نے مجھے بتایا۔

"...... نظیر صدیقی کمزور ہو گئے تو میں نے ان سے کہا: "آپ کی صحت تو آپ کی [illegible]
سے بھی زیادہ کمزور ہو گئی ہے" صدیقی صاحب گراں گوش ہیں۔ اب ان کے سامنے کچھ بھی
بولا جا سکتا ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنتے۔ جگن ناتھ آزاد بھی کسی کی نہیں سنتے، کیونکہ وہ خود ہی
بولتے رہتے ہیں۔ جگن ناتھ پاکستان سے واپس جانے لگے تو درجہ سوم کے شاعروں کی
کتابوں کا بھاری بنڈل بھی اپنے ہمراہ انڈیا لے جا رہے تھے، تو میں نے کہا: "اس سے
بری شاعری تو آپ کے اپنے ملک میں ہوتی ہے، یہ کتابیں لے جانے کی کیا ضرورت
ہے؟" "میرے ہم زلف کا نام ذوالفقار ہے، میں انہیں "ہم ذوالفقار" (ہم زلف کار) کہتا
ہوں......"

مشفق خواجہ کی شخصیت کا یہ شوخ پہلو ان کی کالمانہ تحریروں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ [illegible]
اسلوب کا نام ہے تو وہ بجا طور پر اس اصول پر پورا اترتے تھے۔

خواجہ صاحب سگریٹ کے معاملے میں "بلانوش" تھے۔ کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی تو [illegible]
کی میز پر سگریٹ کے دو مختلف برانڈ گولڈ لیف اور رتھمن دکھائی دیے۔ میں نے اس "دورنگی" کے [illegible]
میں استفسار کیا تو فرمانے لگے کہ میں تو بیک وقت سگریٹ کے پانچ مختلف ذائقے آزما لیتا ہوں [illegible]

[illegible] شوق سے پیتا ہوں۔ خالد اختر کے لفظوں کا سہارا لیا جائے تو خواجہ صاحب کے بارے
[illegible] کہا جا سکتا ہے کہ وہ "لیڈی نکوٹین کے سچے غلام" تھے۔

خواجہ صاحب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ زندہ دل اور خندہ نواز تھے۔ ان کی زندہ دلی اور
[illegible] افسردہ دلوں کو زندگی کا پیغام دیتی تھی اور وہ یہ خوشگوار فریضہ اپنی گفتگو اور اپنی کالم نگاری کے
[illegible] انجام دیتے تھے۔ وہ بندہ نواز تھے لیکن اقربا پرور ہرگز نہیں تھے چنانچہ خامہ بگوش کی صورت
[illegible] اپنے دوستوں کی تصانیف اور تخلیقات پر خامہ فرسا ہوتے تو حق گوئی و بیباکی کی لے اور تیز کر
[illegible] صاحب اسلوب کالم نگار تھے کہ تحریر کو ان کے قلم پر سو ناز تھے۔ "قلم گوید کہ من خامہ بگوشم!"

مشفق خواجہ کی زندگی، جستجو، ترتیب اور تنظیم کا حیرت انگیز نمونہ تھی اور یہی خوبیاں ان کے تدوینی و
تحقیقی کاموں میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ وہ بیشۂ تحقیق کے شیر مرد تھے اور اپنے علمی کارناموں کے
[illegible] زندگی میں ہی امر ہو گئے تھے۔ ان کی تصانیف لوحِ ادب پر اور ان کی یاد لوحِ دل پر ہمیشہ نقش رہے

(بحوالہ: ماہنامہ "الحمرا" اپریل ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ

ایک عربی مقولے کے مطابق ایک عالم کی موت ایک عالم یعنی دنیا کی موت کا درجہ رکھتی ہے۔ وطن عزیز میں جو گنتی کے چند لوگ اس معیار پر پورے اترتے ہیں ان میں سے ایک بڑا نام اب حال سے ماضی کے صیغے میں سفر کر گیا ہے۔ مشفق خواجہ یقیناً ہمارے علم و ادب کی ایک ایسی ہی بھاری بھر کم شخصیت تھے، جن کے محفل سے اٹھنے کے بعد بہت سارا علاقہ خالی خالی ہو جاتا ہے۔

عام طور پر نقاد اور محقق بہت سنجیدہ طبع، رکھے رکھے اور خشک قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور ان میں سے کچھ تو باقاعدہ مردم بیزار بلکہ مردم آزار بھی کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے خواجہ صاحب ان تمام "خصوصیات" سے بری ایک انتہائی دلچسپ خوشگوار اور جملہ باز انسان تھے اور چونکہ ان کی ان صفات کے پیچھے ان کا گہرا مطالعہ، تنقیدی شعور اور غیر معمولی تحقیقی محنت اور صلاحیت کارفرما ہوتی تھی اس لیے بڑے بڑے ان کے جملے کا دوسا پانی نہیں مانگتا تھا۔

خواجہ صاحب کا تعلق لاہور کے ایک بڑے مشہور اور معزز خانوادے سے تھا جس کی رشتہ داریوں کا تعلق ایک طرف علامہ اقبال اور دوسری طرف خواجہ خورشید انور سے ملتا تھا اور جن کے چھوٹے بھائی بڑا شد خواجہ الیکٹرانک میڈیا اور فلم اور ٹی وی پروڈکشن کے حوالے سے ایک جانا پہچانا نام ہیں۔ خواجہ صاحب سے ہمارا تعارف تو ان سے بالمشافہ ملاقات سے (جو کم از کم ۲۵ برس پرانی ہے) بھی دس برس پہلے کا ہے کہ ہم انہیں تب سے جانتے ہیں جب وہ باقاعدہ شاعر بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ "ابیات" دیکھ کر اب بھی حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے شاعری کی طرف توجہ کیوں کم کر دی۔

ادبی حلقوں میں ان کی زیادہ تر شہرت ان کے "خامہ بگوش" کے قلمی نام سے لکھے ہوئے کالموں کی وجہ سے ہے۔ لیکن وہ حلقے جہاں ادب کے ساتھ ساتھ علم کو بھی اہمیت دی جاتی ہے انہیں ایک ایسے بے مثال اور منفرد محقق کے طور پر جانتے ہیں جس کا کام لاکھوں میں الگ پہچانا اور مانا جاتا ہے۔ حال ہی میں یاس یگانہ چنگیزی کے کلیات کی تدوین کے حوالے سے جو بیش بہا محنت اور تحقیقی کام انہوں نے کیا ہے اس کی دھوم پوری اردو دنیا میں نہ صرف سنائی دے رہی ہے بلکہ اس کام کو اب ایک "مثال" کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ کراچی میں ان سے زیادہ تر ملاقاتیں ایسی محفلوں میں ہوئیں جن میں مشتاق احمد یوسفی، جمیل الدین عالی اور لطف اللہ خاں موجود ہوتے تھے۔ یہ تینوں حضرات بھی اپنے اپنے میدانوں کے شہسوار ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی ادبی سند کے حوالے سے سب کا روئے سخن مشفق خواجہ کی طرف ہی ہوتا تھا

...والے ان کی بات کو سب حرف آخر کا درجہ دیتے تھے۔

کتابوں کے علاوہ ان کا دوسرا شوق فوٹوگرافی تھا، ادبی برادری میں ہماری معلومات کے مطابق ...دیوانشی اور خاطر غزنوی ہی اس میدان میں ان کے ہم سر ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ علم موسیقی ...کی معلومات اور ذوق غیر معمولی تھا اور اگرچہ گفتگو میں بھی ان کے جملے ذہانت بذلہ ...کا ایک امتزاج تھے مگر تحریر میں تو وہ اس طرح ہنسی ہنسی میں کشتوں کے پشتے لگاتے چلے ...اور زخمی بھی سوائے داد دینے کے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ وہ تحریریں Paradox سے ...لیتے تھے کہ ایک ہی جملے میں Sublime اور Ridiculous کی چہرہ نمائی قاری کو امتحان ...کہ وہ "مضروب" سے ہمدردی کرے یا خواجہ صاحب کی ذکاوت کی داد دے۔ اردو ادب ...بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا ہے اور فی زمانہ تو شاید مشفق خواجہ ہی اس منتخب اور مختصر گروہ کے قافلہ ...کہلائے جا سکتے تھے۔

...انجمن ترقی اردو کے ساتھ ان کی طویل وابستگی نے ان کی تنقید اور تحقیق کی صلاحیت کو ...ایک وقت آیا جب وہ خود ایک "انجمن" کی شکل اختیار کر گئے۔ ٹیلیفون اٹھانے پر گفتگو کا ..."فرمایئے" سے کرتے۔ ان کی آواز گونجیلی اور لہجہ انتہائی مہذب ہوتا صحت لفظی اور تلفظ پر ...حاصل تھا کہ پوری اردو دنیا سے لوگ اختلاف کی صورت میں ان سے فیصلہ لیتے تھے ہم خود کو ...فیض یافتگان کی صف میں شامل کرتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے دور ...کی محبت اور رہبری حاصل تھی۔

مشفق خواجہ ایک ...کے دور سے چھٹی ہوئی دنیا میں ایک مثالی آدمی تھے جو زندگی بھر اپنے ...اس رستے پر چلتے رہے جس کے ارد گرد ترغیبات کا ایک جم غفیر تھا لیکن انہوں نے ...انہیں ذرا بھی نہیں ڈالی یہ بات کہنے میں جتنی آسان ہے کرنے میں مشکل بلکہ بہت ہی ...اس بے توقیری کے عہد میں ناممکن ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہو کہ ان کے ...ایک "آدمی" اٹھ گیا ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشفق خواجہ جیسے چند لوگ ہی اس ...علامت ہیں جن سے صحیح معنوں میں زندگی عبارت ہے اور رہے گی۔

(بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور ۲۴ فروری ۲۰۰۵ء)

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ ہمہ صفت نادر روزگار شخصیت تھے

یقیناً کراچی کے اخبارات نے (مجموعی طور پر) مشفق خواجہ مرحوم کی خبر رحلت نمایاں طریقے سے شائع کی۔ "جنگ" سمیت ایک آدھ نے تو تعزیتی اداریہ بھی لکھا (جبکہ دوسری بڑی اہم ادبی شخصیات کی خبر رحلت اس طرح شائع نہیں کیا کرتے) لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے بھی مشفق خواجہ کا حق ادا نہیں کیا۔ الیکٹرانک میڈیا نے علم و ادب کے معاملے میں بے شرمانہ بے حسی کا مظاہرہ کیا (میں کوئی بھی چینل نہیں دیکھتا مگر تادم تحریر (جمعہ ۲۵ فروری) کسی چینل پر کسی قابل ذکر تعزیتی مذاکرے کی خبر عام نہیں ہوئی ہے میرا احمکنہ سہو معاف، شاید ابھی تیاری کر رہے ہوں۔

حکمراں اور بڑی شخصیات

لیکن ہمارے نام نہاد اہم شعبہ ہائے حیات کی ہر بات پر بیان دینے والے بڑے اور [illegible] مقامی، صوبائی، بین الصوبائی شخصیات پاکستان ہی نہیں پوری دنیائے اردو میں نہایت اہم تسلیم کیے جانے والے مصنف محقق کے اٹھ جانے پر تا حال خاموشی سخت تعجب انگیز ہے۔ مشاہیر کے پیغامات چھپ چکے ہیں لیکن ان کی تعداد تسلی بخش نہیں۔ افسوسناک حد تک کم ہے۔ چونکہ خواجہ صاحب زیادہ ملنے جلنے والے آدمی نہیں تھے۔ اپنے علمی کاموں میں ہی غرق رہتے تھے اس لیے ممکن ہے ہمارے اہم شعبوں کی [illegible] اور سرکاری شخصیات ان کے نام اور کام سے پورے طور پر واقف نہ ہوں لیکن ایسے تمام لوگوں کے [illegible] انہیں مطلع رکھنے والا اسٹاف ہوتا ہے اسے تو اتنا جاہل یا احمق نہیں ہونا چاہیے کہ مشفق خواجہ جیسے شخص کی اچانک جدائی پر اپنے اپنے آقاؤں کو مطلع نہ کرے یا ان کے تعزیتی پیغامات قومی ذرائع ابلاغ کو مہیا کرے۔ میں ان تمام شخصیات اور حکمرانوں سے شدید احتجاج کرتا ہوں اور انہیں پرزور مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے اپنے پی آر اسٹاف کی گوشمالی کریں یا ممکن ہو تو اسے بدل دیں۔ ایسا اسٹاف رکھنے سے ان کی ذات، اداروں اور شعبوں کی اور ان کے محکموں اور وزارتوں کی بدنامی ہوتی ہے۔

اہمیت اور انفرادیت

اخبارات میں ان کی علمی خدمات کے متعلق کچھ نہ کچھ چھپ چکا ہے لیکن دراصل ان کے کام پر مقالے اور کتابیں ہی تفصیلی بات کریں گی۔ وہ ایک منفرد شخصیت تھے۔ میں نے ان کی نوعمری دیکھی ہے۔ وہ کوئی اڑسٹھ کے ہو کر گئے ہیں، مجھ سے بارہ برس چھوٹے۔ انہیں ۵۸۔۱۹۵۷ء سے جانتا تھا۔ [illegible]

[illegible] عبدالحق جنہوں نے انہیں اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو پاکستان میں لے لیا تھا۔ گویا [illegible] برس پہلے عمر بائیس برس وہ ایک اپنے وقت کے عظیم ملی ادارے سے ایک عظیم [illegible] وابستہ ہو گئے تھے۔ جنہیں انجمن کے کتب خانہ خاص بابائے اردو کی صحبت اور بابائے [illegible] ساتھیوں اور ملاقاتیوں کی آنکھیں دیکھنے سے علم سلیقہ سینہ بسینہ اکتساب علم کے جو [illegible] علم کے شوقین نوجوان کے لیے ابدی ذخائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا ان کا باقاعدہ [illegible] جب مجھے رکن منتظمہ پھر اردو کالج اور انجمن کا معتمد اعزازی مقرر کیا گیا۔ اس وقت [illegible] مختلف اوقات میں دیگر کئی قابل ذکر فضلاء بھی کل وقتی مناصب پر فائز رہے ہیں بعد میں [illegible] عہدیدار یعنی جب تک وہ انجمن سے وابستہ رہے بہت سا اور خاصا اہم کام انہی کو [illegible] طرح رفتہ رفتہ ان کی شخصیت اعلیٰ ترین علمی بلندیوں کی طرف ارتقاء پذیر رہی۔ اپنے [illegible] عبدالوحید مرحوم کے انتقال پر انجمن سے تو وہ ۱۹۷۳ء میں خود چلے گئے اور تمام وقت [illegible] کاموں کو دینے لگے لیکن انجمن سے اور مجھ سے مسلسل رابطہ رکھا، انجمن کے متولی اور [illegible] میری ملازمتوں اور مختلف الجہات (میرے لیے بے فیض) مصروفیتوں نے ہماری [illegible] بھی کم کر دی تھیں۔ بیچ بیچ میں شاید میری کوتاہیوں، شاید بعض پیشہ ور چغلی خوروں [illegible] سوء تفہیم نے ہمارے مابین کبھی کبھی کچھ ناگوار وقفے بھی پیدا کیے مگر یہ سب تو لگے [illegible] آتا رہتا ہے۔ ہمارے تعلقات میں فرق نہ آیا۔ ایک زمانے میں وہ ایک ہفتہ [illegible] ادب و ادیب پر خاصے شدید طنزیہ کالم بھی لکھتے تھے (قلمی نام خامہ بگوش سے) اور [illegible] کے بقول کسی کو نہ چھوڑا لیکن بحمداللہ کسی سطر میں مجھ ناچیز کا نام یا اس کی طرف [illegible] جب ہم ان کے جنازے پر جمع تھے اس روز کے حوالے سے مجھ سے [illegible] لطف اللہ خان [illegible] کہا کہ خواجہ صاحب کہتے تھے میں عالی صاحب اور جمیل جالبی کے [illegible] عرض کی خالی صاحب اپنے استثناء کی وجہ جالبی صاحب جانیں، میرے [illegible] معلوم ہے کہ انہوں نے خود کبھی نہیں بتائی۔ پوچھا گیا عرض کی میرے عیوب کی لاانتہا [illegible] واللہ اعلم۔

[illegible]

[illegible] خواجہ خاندانی [illegible] مشفق۔ کارناموں [illegible] کہ مجھ جیسے [illegible] کی نگر [illegible] (اگر وہ صرف شاعری ہی کرتے تب بھی "ابیات" [illegible] ثبوت [illegible] پر توجہ کیجیے تو

اب بھی ہیں)" "غالب اور صفیر بلگرامی" (ایک تحقیقی مطالعہ)، تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا" کی تدوین (بڑی ہی محنت کا کام) جائزۂ مخطوطات اردو (تحقیق و تدوین)، تحقیق نامہ "خامہ بگوش" کے نام سے ادبی طنزیات کے دو مجموعے "سخن در سخن" اور "سخن ہائے ناگفتنی" دراصل ان کے ان طنزیہ سلسلوں کے تین انتخابات ہیں اور یہ بھی غیر معمولی تحقیق و تنقید کی نہیں بڑے بڑے اہل نظر کی رائے ہے کہ معاصرین میں جناب مشتاق احمد یوسفی کا مقام تو گویا ایک بے مثال کرامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلا تکلف خواجہ صاحب کی سی ذکاوت، قدرت تحریر، بلاغت اور کاٹ پاک و ہند دونوں میں کہیں اور نہیں نظر آتی۔ لیکن میری اس عامیانہ سی گزارش کے معنی صرف اس وقت کھلیں گے جب ان کا مطالعہ اور تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ یہ جگہ اس موضوع پر کسی سیر حاصل گفتگو کے لیے نہیں ہے اور سچ کہ میں اس کا اہل بھی نہیں۔ ان طنزیات کے لفظ لفظ سے ان کے انتہائی وسیع مطالعہ ادب (بطور خاص کلاسک کی روشنیاں پھوٹتی ہیں۔ مدتوں، غالباً بیس برس سے کلیات یگانہ کی جمع و تدوین پر کام کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں پوری اردو دنیا میں سیکڑوں خطوط لکھتے پھرتے تھے۔ کتاب آئی تو دنیائے ادب پر ایک عالم حیرت طاری ہو گیا، کس سبب سے؟ مجھ عاجز کی رائے میں اس سے یگانہ مرحوم کا قد تو زیادہ نہیں بڑھا لیکن خواجہ صاحب نے تحقیق اور محنت کی جو اس میدان میں کئی لحاظ سے ایک نئی مثال قائم کر دی اس سے اور بھی ان کا ارادہ یگانہ مرحوم کے کئی پہلوؤں پر کام کرنے کا تھا جانے کتنا کام غیر مطبوعہ بھی چھوڑ گئے ہیں) میں تحقیقی آدمی نہیں محققوں پر محققوں کی آرا سے ضرور واقف رہتا ہوں کہ خصوصاً پاک و ہند لندن کے ان ماہرین کے ارشادات سے جن سے انجمن اور مسلسل مسافرت کے سبب ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ وہ بوجوہ خاہر قاضی عبدالودود اور رشید حسن خان صاحبان پر ان کو تفوق تو نہیں دیتے (سچ کہ ابھی ان کی عمر بھی ایسی نہیں ہوئی تھی) مگر ان کے ساتھ جہاں ضرورت پیش آ جائے خواجہ صاحب کا نام لینے میں تامل نہیں کرتے۔ یہ مقام بھی اتنا بڑا ہے کہ ابھی تک تو ایک آدمی دوسری زبان مثلاً فارسی کے علاوہ کسی دوسری پاکستانی کو حاصل نہیں ہوا۔ اور کھل کر کیوں نہ کہوں کہ قاضی عبدالودود اور رشید حسن خان جیسا بلکہ میرے منہ میں خاک کسی قدر ان بزرگوں سے بھی برتر مقام پاکستان کے مایۂ ناز فرزند مخدومی و معظمی پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن کو حاصل ہے جو بحمد اللہ حیات ہیں (اینگلو عربک کالج دہلی میں ہمارے نوجوان استاد فارسی تھے پاکستان اور ایران میں فارسی تدریس، تحقیق اور تنقید کے اعلیٰ ترین مقامات تک پہنچے، اب جامعہ پنجاب میں پروفیسر ایمریٹس ہیں۔ تحقیقی رہنمائی خرابی صحت کے باوجود جاری ہے) دیکھیے میں اپنے جواز وجود پر کیسی بڑی شخصیت سے اپنے مختصر المیعاد تعلق کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

کتب خانے

خواجہ صاحب نے میدان عمل میں بھی کو نہایت خاموشی کے ساتھ بڑے جوہر دکھا رکھے ہیں، بالم

آباد کراچی کے ایک کونے پر قبلہ فیض صاحب اور محترمہ آمنہ مجید ملک (آمنہ آپا) کی معاونت سے غالب لائبریری جیسی لائبریری قائم کی اور خاصی بے سروسامانی کے باوجود اسے چلایا یہاں تک کہ اسے وسائل بھی میسر آ گئے اور اس کی عمارت بھی اس کے ٹرسٹ کی ملکیت اور ہمارے مقامی بلکہ قومی تناظر (بے حسی) میں ایک اچھی خاصی جگہ بن چکی ہے۔

ان کا ذاتی کتب خانہ ایک طلسمی شہرت اختیار کر چکا ہے۔ میں مدتوں سے ادھر نہیں گیا میرا علم محض شنید تک محدود ہے مگر یہ بات ہر شنید میں مشترک کہ وہ مخطوطات، نوادر اور دواوین کے لحاظ سے پورے پاک و ہند میں ذاتی ملکیت کا منفرد کتب خانہ ہے۔ اس سے ہزاروں اہل جستجو فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور ان شاء اللہ اٹھاتے رہیں گے ان کی کتابوں کے علاوہ یہ دونوں کتب خانے ایک فیض جاریہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس بات کی تردید خود ان کے ایک مطبوعہ خط، بتاریخ دس فروری سے ہو چکی ہے کہ انہوں نے وہ ذاتی کتب خانہ کسی این جی او (یا کسی کو بھی) فروخت نہیں کیا تھا (اگرچہ اپنی ملکیت پر ان کا حق تھا) اس لیے اس وقت میں اس موضوع پر مزید کچھ کہنا پسند نہیں کرتا۔

ذاتی صفات

بے عیب تو خدا کی ذات ہے یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ معصومین ...... مجھے خواجہ صاحب سے حالیہ کم تعلق کے باوجود ایک مدت خاصا گہرا رابطہ رہا ہے ایک محبت جو میرے نظام اقدار میں اہم حیثیت رکھتی ہے مگر ہمارے بڑے بڑے ادیبوں تک پر قبضہ جما لیتا ہے یہ ہے کہ کسی کو زبان یا قلم یا عمل سے آزار پہنچایا جائے (فقرہ بازی، محدود دھڑوں، تمسخر، طعنہ وغیرہ مستثنیٰ) وہ عیب ان میں نہیں تھا یعنی وہ کسی کا برا نہیں چاہتے تھے۔ اہل ضرورت کی کچھ امداد کرنا اور ان کی ضرورت اپنی حدود سے زیادہ تقاضا کرتی ہو تو کسی نہ کسی سے ان کی پچھ نہ کچھ مدد کرا دینا ایک طرح ان کا روزمرہ تھا۔ یہ باتیں ایک دنیا بھر سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی کے لیے بڑی کٹھن ہوتی ہیں مگر وہ ان سے گریز نہیں کرتے تھے۔ میں بحمد اللہ بڑی عمدہ ادبی صفات رکھنے والی شخصیات سے واقف ہوں جو حقیقی اہل غرض کے لیے دوسروں سے رابطہ یا سوال کو اپنی خودداری یا وقار یا انا کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ شاید وہ اپنی جگہ بجا ہوں مگر میں ان کی اس عادت کو پاکستان کے معیشتی اور معاشرتی تناظر میں ایک بڑا المیہ اور انسانی عیب سمجھتا ہوں۔

بحمد اللہ مشفق خواجہ ان لوگوں میں شامل نہیں تھے۔ کاش وہ میری طرف سے اچھے جذبات کے ساتھ گئے ہوں۔ بہر حال میں ان کے لیے سراپا دعا ہوں، ہمیں ان کے انتقال جانے کا تو علم نہیں ہو سکا انتقال کی شب مکالمہ کے مدیر جناب مبین مرزا نے کوئی سوا دس بجے مجھے فون کر کے بتایا کہ وہ اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھے اور اس وقت سانس برقرار رکھنے کی مشین Ventilater پر رکھے

بات ہے اور مشفق خواجہ میں یہ بہت کمیاب صفت بھی موجود تھی۔ علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے ان کی رائے بہت اہمیت کی حامل تھی لیکن خالص علمی اور ادبی محفلوں میں اور ذرائع ابلاغ پر ہونے والے مذاکروں میں شرکت سے انھوں نے گریز کیا۔ اس کی ایک امکانی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے بے لاگ اظہار خیال سے کسی کے جذبات مجروح نہ ہو جائیں اور یہ بھی کہ اس نوعیت کی بعض محفلوں میں شرکت کے بعد یہ بھی توقع ہو جاتی ہے کہ اس قدر وسیع فکر و نظر رکھنے والا پھر ہر محفل میں شریک ہو اور یہ بہت دشوار بات ہے۔ عدم شرکت یا بے لاگ اظہار خیال سے کسی کی دل شکنی نہ ہو، غالباً اسی خیال سے انھوں نے شہرت کے اس بڑے اہم وسیلے سے گریز کیا اور مطمئن بھی رہے۔ مشفق خواجہ نے جو کالم لکھے ان کا انداز ہی بڑا انوکھا اور دلکش تھا۔ ان کالموں میں مشفق خواجہ کی علمی اور شخصی صفات کا عکس بھی انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ ان کالموں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تحقیقی نوعیت کی منفرد کاوشیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ وہ مسلسل کام کرتے رہے اور اردو ادب سے متعلق کتابوں، مخطوطات، خطوط، رسائل وغیرہ کا ایک بہت نادر اور بیش بہا خزانہ انھوں نے چھوڑا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت بڑے مالیاتی ادارے ہیں جو اقتصادی شعبے میں سرگرم عمل ہیں لیکن ان اداروں کے با اختیار لوگوں کو اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ان کے اداروں پر کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی ہیں جس میں پاکستان کی قومی زبان کے علم و ادب کے فروغ میں فرائض کی ادائیگی بھی شامل ہے۔ یہ ہم سب کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ مشفق خواجہ کے چھوڑے ہوئے علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی ورثے کو محفوظ کریں اور ایک ایسا ادارہ قائم کریں جہاں ہماری نئی نسلیں ان سے فیض یاب ہو سکیں۔ رب کریم مشفق خواجہ کی روح پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور بیگم آمنہ مشفق اور دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!

(بحوالہ: روزنامہ "جنگ" لاہور، ۲۸ فروری ۲۰۰۵ء)

تنویر حسین

آہ مشفق خواجہ بھی......

مشفق خواجہ اس دنیا میں نہیں رہے، ادبی دنیا میں ایک سوگ اور دکھ کی فضا گردش کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت عطا کرے۔ ۱۹۷۰ء میں مشفق خواجہ کا ایک تحقیقی معرکہ "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا۔ یہ تذکرہ سعادت خاں ناصر نے لکھا۔ مقدمہ ایسا چشم کشا ہے کہ قاری دور ماضی میں سانس لینے لگتا ہے۔ ناصر نے اپنے تذکرہ کا نام "خوش معرکہ" رکھا۔ میر علی اوسط رشک نے اس نام میں مزید زیبائی شامل کر دی۔

اے رشک پسند آئی، اس نسخے کی زیبائی
تاریخ یہی پائی، خوش معرکہ زیبا

اس تذکرے میں خود نوشت سوانح عمری کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ طنز و مزاح کے رنگ نے اس تذکرے کو بے لطفی اور خشکی سے بچایا ہے۔ عنایت اللہ حجام مرزا سودا کا شاگرد تھا۔ یہ جملہ دیکھیے:

"مرزا سودا کے خط کے بنانے سے اصلاح پذیر ہوا۔"

میاں رمضان جولاں جرات کے شاگرد تھے اور نابینا تھے۔ ان پر یہ جملہ ملاحظہ فرمایئے۔ "چشم اس کی از رست بیکار، گویا استاد کا خاص الخاص یادگار تھا"۔ میر دوست علی زلال کے بڑھاپے کی تصویر کشی یوں کی ہے۔ "اب بہ سبب پیر سالی کے وہ زلال درد ہو گیا ہے۔" شیخ فیض اللہ محو (شاگرد میر) کے بارے میں لکھا ہے "قدم بہ قدم استاد بلکہ ایک دو گام زیادہ۔" سعادت خاں ناصر کے تنقیدی شعور کے بارے میں مشفق خواجہ نے ناصر ہی کے شعر کے حوالے سے یہ واقعہ لکھا ہے۔

ملے نہ رخ سے اگر غازہ عذار ہوں میں
نہ آنے دے مجھے آنکھوں تلک کہ خمار ہوں میں

ناسخ نے گرفت کی کہ "خمار" نشے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، جو کہ غلط ہے۔ ناصر نے جواباً کہا "خمار کے معنی لغت میں کیفیت شراب کے آتے ہیں" اور ساتھ ہی سند کے لیے فارسی شعر کا حوالہ دیا۔ پھر سال ۲۰۰۳ء اس لحاظ سے خوش بخت ٹھہرا کہ مشفق خواجہ صاحب کا ایک اور تحقیقی کارنامہ

''کلیات یگانہ'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ داد کے ڈونگرے برسائے گئے۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں کہ ''یگانہ سے میری دلچسپی کا سبب میرے دو اساتذہ ہیں۔ کالج میں ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی اور کالج سے باہر جناب خلیق ابراہیم نے میرے ادبی ذوق کی تربیت کی۔ تحقیق کے بارے میں ہمارے لوگوں کی زیادہ اچھی رائے نہیں بنتی۔ اس کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں تحقیق پڑھنے سے بندہ جلد بوڑھا ہو جاتا ہے۔ چہرے پر اتنی جھریاں پڑ جاتی ہیں کہ استری کرنے سے بھی دور نہیں ہوتیں۔ مشفق خواجہ نے زندہ دلوں کے لیے زندہ دلی کا سامان بھی وافر مقدار میں مہیا کر دیا۔ جب خواجہ صاحب کا کسی شاعر، ادیب پر خاکہ نما مضمون یا تبصرہ شائع ہوتا تو وہ ادیب یا شاعر گلی گلی مشہور ہو جاتا۔

کشور ناہید کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''کشور ناہید اردو شاعری کی پوری عورت ہونہ ہو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو تنقید کا نصف بہتر ضرور ہیں۔ جناب ظفر اقبال صاحب میں مشفق خواجہ کا جملہ سنیے...... ہم اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ظفر اقبال شاعر اچھے ہیں یا کالم نگار۔ ہم تو کہیں گے کہ ان کی غزل پڑھیں تو ایسا لگتا ہے کالم پڑھ رہے ہیں اور کالم پڑھیں تو اس میں غزل کا مزہ آتا ہے۔

محترمی افتخار عارف صاحب کے بارے میں مشفق خواجہ کہتے ہیں، وہ دن دور نہیں جب موصوف کا نام نامی، قاموس الاغلاط، فرہنگ پیشہ وراں اور لغات اضداد جیسی کتابوں پر بطور مرتب شائع ہونے لگے گا۔ افتخار عارف کو ''قاموس الاغلاط'' ضرور مرتب کرنی چاہیے۔ یہ کام ان کے لیے نسبتاً آسان ہوگا۔ اس کے لیے مثالیں تلاش نہیں کرنا پڑیں گی، اپنے کلام ہی سے مل جائیں گی۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب کی پاکستان میں شہرت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے غالب کے خطوط کئی جلدوں میں مرتب کیے ہیں اور یہ پاکستان میں بھی چھپ گئے ہیں۔ چونکہ غالب سے دلچسپی عام ہے، اس لیے خطوط غالب کے مرتب کو بھی لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''ہمارے عام نقاد اچھی شاعری پر بڑے تنقیدی مضامین لکھتے ہیں لیکن ڈاکٹر انور سدید بری شاعری پر اچھے مضامین لکھنے میں جواب نہیں رکھتے''۔

محترم عطاء الحق قاسمی اور محترم امجد اسلام امجد کے بارے میں مشفق خواجہ کے شفقت آمیز جملے دیکھیے:

''عطا اور امجد میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں۔ دونوں ڈرامہ نگار ہیں۔ کالم نویس ہیں۔ سفر کرتے ہیں اور سفرنامے لکھتے ہیں۔ شاعری کرتے ہیں اور مشاعرے پڑھتے ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ٹی وی کے پروگراموں میں کبھی کمپیئر اور کبھی مہمان خصوصی بنتے ہیں۔ ایک ہی کالج میں استاد ہیں اور کالج بھی ایسا

جس کے بیشتر طالب علم ہر سال پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کی تعلیمی خدمات کتنی وقیع ہیں۔''

شگفتہ تبصرہ نگاری میں مشفق خواجہ کے پیش رو پطرس بخاری تھے۔ مشفق خواجہ کے اس دنیا سے اٹھ جانے سے یہ روایت بھی ختم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ اب لوگ اپنی تعریفیں پسند کرنے لگے ہیں اور انہی تعریفوں کے آئینے میں اپنی پسندیدہ صورت دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مشفق خواجہ کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

(بحوالہ: روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، ۹ مارچ ۲۰۰۵ء)

مبین مرزا

مہرباں سائے مٹتے جاتے ہیں

مشفق خواجہ ۲۱ فروری کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ دنیا فانی ہے اور کوئی بھی یہاں ہمیشہ کے لیے نہیں آیا۔ یہ ہم سب جانتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں۔ وہ لوگ جن سے ہم قریب ہوتے ہیں ان کی جدائی پر دل دکھ ضرور اٹھاتا ہے۔ خواجہ صاحب کے انتقال پر ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ دوست احباب اور ملنے جلنے والے سبھی ملول ہوئے۔ اہلِ ملال کا حلقہ صرف کراچی شہر کی وسعتوں یا پاکستان کے شہروں تک پھیلا ہوا نہیں ہے بلکہ ہندوستان، ایران، برطانیہ، امریکہ، ہالینڈ، دبئی اور سعودی عرب تک سے لوگوں نے فون کر کے پہلے بادلِ ناخواستہ اس خبر کی تصدیق کی اور پھر بادیدۂ تر تعزیتی کلمات کہے۔ یہ سب تو میں ذاتی حوالے سے لکھ رہا ہوں۔ خواجہ صاحب کے اہلِ خانہ کے پاس تو نہ جانے کہاں کہاں سے اور کتنے لوگوں نے رابطہ کیا ہوگا۔ عجیب بات ہے کہ زندگی کے آخری تیس بتیس برس مشفق خواجہ صاحب نے ایک کمرے میں اور صرف اپنی کتابوں کے ساتھ گزارے لیکن اس کے باوجود ان کا حلقۂ احباب و قارئین یہاں سے وہاں، دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک وسیع تھا اور جو لوگ حلقۂ احباب میں تھے، ان سے خواجہ صاحب کے مراسم محض رسمی یا سرسری نوعیت کے نہیں تھے۔ بلکہ ان میں محبت و اخلاص کی گرمی و گرمجوشی اور تعلق کی گہرائی اور وضع داری بھی تھی۔ ان مراسم میں دوسروں کی سرگرمی بھی ضرور اہمیت کی حامل ہوگی لیکن پچھلے سولہ سترہ برس کا تو میں بھی گواہ ہوں۔ اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ پرجوش تعلق خواجہ صاحب کی دل آویز اور دل دار شخصیت کا ذاتی کرشمہ تھا۔ ان سے تعلق بنے اور رسم و راہِ محبت کی استواری میں وقت تو ضرور لگتا کہ خواجہ صاحب بہ ظاہر نہ سہی لیکن بہ باطن قدرے کم آمیز آدمی تھے لیکن اگر ایک بار دوستی کا رشتہ قائم ہو جاتا تو پھر وہ اسے نبھانے کا ہنر خوب جانتے تھے۔

فی زمانہ انسانی مراسم اور سماجی روابط پہ ابتلا یہ گزری ہے کہ اب ان کی بنیاد میں کوئی نہ کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ کم لوگ ایسے ہوں گے جو آج بے لوث مراسم پر یقین رکھتے اور انہیں بے غرضی سے نبھاتے ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب ایسے ہی لوگوں میں تھے۔ ان کے قریبی دوستوں میں کیسے کیسے منصب دار نہ تھے لیکن مجال ہے جو کبھی خواجہ صاحب کو کسی سے کوئی فرمائش یا خواہش کرتے سنا ہو۔ خود کوئی فرمائش کرنا تو دور کی بات ہے وہ تو اس پر آمادہ نہ ہوتے کہ کوئی دوست از خود ان کے لیے کسی فائدے یا منفعت کا سبب بنے۔ یہاں انہیں ولی کامل ثابت کرنا مقصود نہیں صرف ان کی درویشی مذکور ہے۔ صوفی

کی طرح یہ بات صاحبِ علم پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر اس کی طبیعت میں قناعت و استغنا نہ ہو تو وہ شرحِ صدر کے مرحلے سے نہیں گزرتا اور اگر یہ مرحلہ سر نہ ہو تو سالک کی طرح وہ بھی مقامات میں کھو جاتا ہے منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ مشفق خواجہ صاحب تارک الدنیا صوفی نہیں تھے انہیں دنیا سے علاقہ تھا لیکن وہ اس کی طلب یا ہوس میں مبتلا نہ تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے کاموں میں مگن اور انہی کے لیے زندہ رہے۔ رہی بات ان کی علمی اور تحقیقی کاموں کی تو ان کے اصل قدر دان تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس شعبے سے تعلق رکھتے ہیں تاہم اتنی بات تو ہم ایسے طالب علموں کے کانوں میں بھی پڑتی رہی ہے کہ وہ اپنے شعبے کے ان لوگوں میں تھے جنہیں سند سمجھا جاتا ہے۔

خواجہ صاحب ادبی تقریبات اور مشاعروں وغیرہ میں قطعاً شریک نہ ہوتے تھے۔ ایک روز میں نے دریافت کیا آپ خود کو اس کمرے میں محصور رکھتے ہیں تقریبات وغیرہ میں نہیں جاتے اس سے آپ کا جی نہیں اوبتا؟ مسکرا دیے۔ پھر بولے اجی اسی کمرے میں مجھے سب کچھ مہیا ہو جاتا ہے میں اسے چھوڑ کیوں جاؤں؟ وہ لوگ جنہیں خواجہ سے قربت رہی اور جن کا آنا جانا ان کے یہاں رہا وہ اس امر کی گواہی دیں گے کہ واقعی انہیں جو کچھ درکار ہوتا وہ اسی کمرے میں ان تک پہنچ جاتا۔ کتابیں، رسائل و جرائد، ادب اور ادیبوں کا تازہ ترین احوال اور بس۔ سو اردو کی جو نئی کتابیں چھپتیں اکثر و بیشتر ان تک پہنچ جاتیں اور اگر ان کے موضوعات یا دلچسپی کی کوئی کتاب نہ پہنچ پاتی تو وہ قیمتاً حاصل کر لیتے۔ اب رہیں ادب اور ادیبوں کی خبریں تو اس حوالے سے ہم عصر اردو ادیبوں میں کوئی ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد کے ادب اور ادیبوں ہی کی بات نہیں ہندوستان برطانیہ کینیڈا اور امریکا تک میں مقیم یا وہاں جانے والے ادیبوں کی ادبی اور غیر ادبی کارگزاریوں کی بابت جتنے باخبر خواجہ صاحب تھے اتنا شاید ہی کوئی دوسرا آدمی ہو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خبریں ان تک برقیاتی رفتار اور تیز ترین ذرائع سے پہنچا کرتی تھیں۔ ادھر کوئی کام یا ذکر یا واقعہ رونما ہوا اور ادھر خواجہ صاحب کو اس کی خبر ہوئی۔ اصل میں ادب اور ادب ہی خواجہ صاحب کی ہمہ وقت مشغولیت کا عنوان تھے۔ ادب کی دنیا ہی ان کے لیے حقیقی دنیا تھی باقی سب کچھ تو جیسے ان کے نزدیک زندگی کی ضمنیات میں شامل تھا۔

خواجہ صاحب ہماری خالص علمی روایت کے ایک بڑے آدمی تھے۔ ہمارا زمانہ تو خیر اکبرے پن کی ترویج و تنظیم سے عبارت ہے لیکن خواجہ صاحب اس علم و روایت کا تسلسل تھے جس نے ہمہ جہت لوگ پیدا کیے۔ وہ بلند پایہ محقق، نکتہ رس نقاد، اور منفرد مزاح نگار تھے۔ ان کی مزاح نگاری ان کے وسیع مطالعے، گہرے تدبر اور اعلیٰ تنقیدی شعور کے عناصر سے مرکب تھی۔ یہی نہیں وہ خوش خیال شاعر بھی تھے۔ گویا وہ جو ہماری علمی اور ادبی روایت ہشت پہلو شخصیات پیش کرتی آئی ہے مشفق خواجہ صاحب اسی کا نمونہ تھے۔ انہوں نے خود تو بڑے بڑے تحقیقی کارنامے سرانجام دیے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتنے ہی لوگوں کی معاونت بھی کی۔ وہ اگر ایک بار یہ باور کر لیتے کہ جو شخص ان سے کسی علمی و تحقیقی کام میں تعاون چاہتا ہے وہ

اس کام کی استعداد رکھتا ہے اور اپنے کام کے بارے میں قطعی سنجیدہ ہے تو ہر ممکن اس کی مدد کی کوشش کرتے۔ مآخذات کی تلاش، مواد کی فراہمی، حوالوں پر گفتگو غرض پھر تو ان سے جو کچھ بن پڑتا اس میں کوئی سر اٹھا نہ رکھتے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ انفرادی ملکیت کے عظیم الشان کتب خانوں میں سے ایک ہے اور ایسا منظم و مرتب کہ آپ اس میں موجود مواد کتاب اور حوالے تک مختصر ترین وقت میں پہنچ سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا کتب خانہ کس درجہ مرتب اور کس حد تک ان کی گرفت میں تھا اس کا اندازہ یوں لگا لیجئے کہ ناظم آباد کے جس مکان میں ان کی رہائش تھی اس کی نچلی اور پہلی منزل پر کل ملا کر غالباً دس کمرے تھے اور ایک کمرہ دوسری منزل پر بنا ہوا تھا۔ اس مکان میں صرف ایک کمرہ رہائش کے لیے تھا باقی سب میں کتابیں تھیں۔ اب کسی آنے والے نے ان سے اپنے موضوع کی کتابیں دیکھنے کی فرمائش کی تو خواجہ صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے اسے بتا دیا کہ فلاں کمرے کی فلاں الماری میں اس کی مطلوبہ کتاب رکھی ہے۔ ہم نے ان کے کتب خانے کی اس خوش انتظامی اور خواجہ صاحب کے حافظے کی مثالی [illegible] سے کتنے ہی لوگوں کو فیض پاتے دیکھا۔ خود میں جب ایک صدی کے شخصی خاکوں کا انتخاب مرتب کر رہا تھا تو سب سے زیادہ انہی کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔ خاکہ نگاری خواجہ صاحب کے دلچسپی کے شعبوں میں تھی۔ اس لیے ان کے پاس خاکوں کے اس وقت اڑھائی سو سے زیادہ مجموعے تھے اور سبحان اللہ کیا کیا ان کے حافظے میں روشن تھا۔ اس سارے کام کے دوران وہ کمال شفقت کے ساتھ متوجہ رہے اور محبت سے میری دلدہی کا سامان کرتے رہے۔ اپنے کام کی بابت تو سبھی سنجیدہ ہوتے ہیں اور کام کی لگن بھی بہت سوں میں ہوتی ہے۔ لیکن دوسروں کے کام میں ایسی دل چسپی تو باید و شاید ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

خواجہ صاحب فرشتہ نہیں، انسان تھے۔ دوسرے انسانوں کی طرح ان پر رنج و ملال کی کیفیتیں بھی گزرتیں اور ان کی طرف سے غم و غصے کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ اس حوالے سے بھی ان کے یہاں ایک عجیب مستقل مزاجی پائی جاتی تھی۔ اگر کسی شخص پر انہوں نے ایک بار اپنے دل کے دروازے بند کر لیے تو پھر اسے دوبارہ ان کی محبت و قربت کے مہربان سائے میسر نہ آئے۔ کراچی میں کچھ لوگوں نے ان سے اپنے اپنے زمانے میں فیض پایا، لیکن تعلق نہ نبھایا، دن پھرے تو آنکھیں پھیر لیں اور یار سے اغیار ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے ان کی طرف سے دھیان ہٹایا اور دل پر پتھر رکھ لیا۔ آگے چل کر یہ ہوا کہ آنکھیں پھیرنے والوں میں سے کسی کو اپنی غلطی یا بے وفائی کا احساس ہوا اور اس نے سلسلہ جنبانی کی لیکن اب ادھر واپسی کا راستہ ہی کب تھا۔ یہ تو انسان کا فطری ردعمل ہے کہ جن سے تکلیف پہنچے ان سے کھنچاؤ آتا ہے، لاتعلقی ہو جاتی ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ اکادمی ادبیات یا پی سی آئی سے وظیفہ لگوانے، امداد دلوانے یا علاج معالجے کا بندوبست کرانے میں خواجہ صاحب نے ایسے لوگوں کے لیے بھی کبھی کوتاہی نہیں کی۔ خاص بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے انہوں نے جب بھی کچھ کیا، پس پردہ رہ کر کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا کوئی ایک آدھ واقعہ نہیں ہے، کئی ایک کے ساتھ ان کا یہ معاملہ رہا۔ محبت و نفرت اور پسند و ناپسند

کے معاملے میں خواجہ صاحب کے یہاں ایک قطعیت پائی جاتی تھی۔ جن سے انہیں قربت و موافقت ہوتی، ان کے لیے وہ اختلافی حوالوں کو نظر انداز ہی نہ کرتے بلکہ خود سے عذر خواہ بھی ہوتے۔ محبت و نفرت دونوں ہی انسانی زندگی کی سچائیاں ہیں۔ ان میں آدمی بناوٹ سے کام نہیں لے سکتا۔ جو اندر ہو وہ چھپ نہیں پاتا۔ ظاہر ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب کے یہاں تو ان دونوں ہی معاملوں میں مطلق تکلف نہ تھا۔

خواجہ صاحب کے یہاں اتوار کے روز باقاعدگی سے محفل جمتی تھی۔ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو تو وہ ملنے کے لیے درمیان میں بھی بلا لیتے لیکن ہفتے کا یہ ایک دن ایسا تھا، جب کوئی بھی ان کے یہاں بغیر پیشگی اطلاع کے آ سکتا تھا۔ اس روز صبح ساڑھے دس گیارہ سے تین ساڑھے تین بجے سہ پہر تک آنے جانے والوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ خواجہ صاحب ہر شخص کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے۔ آنے والوں کی تواضع نہایت عمدہ بسکٹوں اور تازہ نمک پاروں سے کی جاتی۔ چائے کا مستقل دور چلتا۔ اب تو خیر چند برسوں سے اس کام کے لیے خواجہ صاحب نے ایک اور لڑکا رکھ لیا تھا لیکن پہلے ان کے پاس اتوار کو اس کام کے لیے صوفی صاحب آیا کرتے تھے۔ صوفی صاحب تاریخی آدمی ہیں، وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں، ان کے خدمت گار رہے ہیں۔ صوفی صاحب چائے پیش تو بہت اہتمام سے کرتے لیکن وہ ہوتی بہت خراب تھی، جیسے شیو بنانے والے مگ میں دودھ اور پتی ڈال کر رکھ دی جائے۔ پہلی بار تو ہر شخص کے لیے فوراً یہ چائے آ جاتی پھر بعد میں دوسرا دور چلتا اور خواجہ صاحب ایک ایک سے یہ اصرار دریافت کرتے۔ مستقل حاضر باشوں میں جو لوگ اچھی چائے کے رسیا تھے۔ جیسے عباس رضوی انوار ہاشم، رفیق نقش، رؤف پاریکھ اور میں، ہم سب کچھ عرصے تو شرما حضوری میں چائے کے دوسرے تیسرے دور میں بھی شریک ہوتے رہے۔ لیکن دل ہی دل میں ہم خواجہ صاحب کے محبت بھرے اصرار پر نازاں لیکن صوفی صاحب کی چائے سے نالاں رہتے تھے۔ ایک روز محفل برخاست ہوئی تو گھر سے باہر آ کر انوار ہاشم نے دو بے حد سنجیدہ سوال اٹھائے ایک یہ کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت کے ساتھ چائے کہاں پیش کی جاتی ہے؟ اور دوسرے یہ کہ دنیا میں سب سے بری چائے کہاں ملتی ہے؟ شاید کسی اور کے لیے ان سوالوں کا جواب آسان نہ ہو لیکن ہم سب کے لیے یہ معاملہ عیاں را چہ بیاں کا تھا۔ دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب تھا خواجہ صاحب کے یہاں اور اس جواب پر اجماع امت تھا۔

محققین کے بارے میں عام تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ خشک مزاج اور [illegible] طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ہم نے خواجہ صاحب کو اس کے بالکل برعکس پایا۔ وہ بے حد زندہ دل، خوش مزاج، بذلہ سنج اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ احباب کی محفل میں ان کی جولانی طبع خوب بہار دکھاتی۔ عام سے عام بات میں بھی وہ شوخی طبع کی گنجائش پیدا کر لیتے۔ جس زمانے میں نظیر صدیقی صاحب کراچی میں مقیم تھے جمعے کے روز (ان دنوں ہفتہ وار تعطیل جمعے کو ہوتی تھی) وہ اور میں دوپہر کا کھانا خواجہ صاحب کے ساتھ کھاتے تھے۔ گاہے گاہے ذوالفقار مصطفیٰ صاحب اور بعض دوسرے احباب بھی شریک ہوتے رہتے۔ نظیر صدیقی

صاحب کو نچلی منزل کے کمروں میں خواجہ صاحب کا کتب خانہ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ انہوں نے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا۔ خواجہ صاحب نے کہا کسی دن میں خود آپ کو دکھاؤں گا۔ بات ٹلتی رہی۔ ایک روز میں نیچے کمرے میں کچھ کتابیں تلاش کر رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا نظیر صدیقی صاحب آ گئے وہ بھی کتابیں دیکھنے لگے۔ وہاں بیٹھنے کا کچھ ایسا معقول انتظام نہیں تھا گرد میں اتی ایک آدھ کرسی رکھی تھی۔ نظیر صدیقی صاحب مختلف الماریوں میں کتابیں دیکھتے رہے۔ جب ہم اوپر پہنچے تو انہوں نے قدرے شوخ چشمی سے کہا خواجہ صاحب آپ نے تو اپنا کتب خانہ مجھے دکھایا نہیں لیکن آج مجھے موقع مل گیا اور میں نے خود ہی آپ کا پورا کتب خانہ دیکھ لیا بلکہ وہاں کھڑے کھڑے دو کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔ خواجہ صاحب نے فوراً فقرہ لوٹایا اجی آپ نے ساری عمر کھڑے کھڑے ہی پڑھا ہے اسی لیے تو پڑھنے پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ صرف دوسروں پر نہیں خواجہ صاحب خود پر بھی فقرہ چست کرنے میں چوکتے نہ تھے۔ ایک بار ہندوستان سے ایک خاتون اور ان کے شوہر ملنے کے لیے آئے۔ دونوں تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور پہلی بار خواجہ صاحب سے مل رہے تھے۔ تھوڑی دیر تو فضا میں اجنبیت اور تکلف کا تاثر سا رہا لیکن اس کے بعد خاتون نے ذرا بے تکلفی اختیار کرتے ہوئے کہا خواجہ صاحب ہم تو آپ کے پاس آتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے دریافت کیا کیوں؟ خاتون بولیں ہم نے تو سنا کہ آپ پنجابی ہیں لیکن آپ سے مل کر اطمینان ہوا۔ آپ کے لب و لہجے مزاج اور لباس سے کسی طرح ایسا نہیں لگتا۔ خواجہ صاحب نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا۔ "اجی بس تھوڑی دیر دیکھیے میری حرکتوں سے معلوم ہو جائے گا"۔

پچھلے سولہ سترہ برسوں کی نجانے کیا باتیں اس وقت ذہن میں امڈ رہی ہیں لیکن طبیعت حاضر نہیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے بے ترتیبی اور بے قاعدہ ہی گفتگو کر رہا ہوں۔ مسلسل بے دھیانی سی ہے۔ کسی عزیز و مہرباں ہستی سے بچھڑنے کے بعد گزرے زمانوں کے سارے ہی روشن لمحوں کی چکا چوند سے احساس خیرہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ذہن آسانی سے مرتب نہیں ہوتا۔ خیر اس وقت تو صرف مشفق خواجہ صاحب کے بارے میں ایک تاثر بیان کرنا مقصود ہے زندگی بخیر آئندہ کسی وقت بالتفصیل کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

خواجہ صاحب انتقال سے بیالیس تینتالیس گھنٹے پہلے آغا خان اسپتال پہنچے۔ یہ شب عاشور تھی ان کی طبیعت رات ۹ بجے سے خراب ہو رہی تھی لیکن وہ رات ایک بجے کے بعد اسپتال پہنچے۔ ایمرجنسی میں داخل کیے گئے۔ طبیعت نے ذرا سا سنبھالا لیا انہوں نے ہمت سے کام لیا۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب بتا رہے تھے کہ صبح نو بجے ڈاکٹر عائشہ وہاں پہنچیں تو انہیں آئی سی یو میں لے جایا گیا۔ ایمرجنسی وارڈ سے آئی سی یو لے جاتے ہوئے ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے الیکٹرک شاک سے ریوائیو کیا۔ معلوم ہوا ایسا آئی سی یو میں لانے کے بعد بھی ہوا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب کوما میں چلے گئے۔ یوسفی صاحب، زہرہ آپا اور الیس یوخاں صاحب ہو کر جا چکے تھے۔ ہم لوگ شام میں پہنچے۔ خواجہ صاحب کی حالت اچھی نہیں تھی اور ڈاکٹر ان کے بارے میں کچھ پرامید بھی نظر نہیں آتے تھے۔ میں ڈاکٹروں سے اجازت لے کر آئی سی

یو میں گیا۔ خواجہ صاحب کو وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا۔ دیکھ کر شدید دھچکا لگا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا وہ جا رہے ہیں۔ میں جب اسپتال کے لیے دفتر سے اٹھ رہا تھا تو ساقی فاروقی کا لندن سے فون آیا۔ پوچھا تم اسپتال ہو آئے ہو؟ میں نے کہا بس جا رہا ہوں کہنے لگے میرا ایک کام کر دینا۔ خواجہ صاحب کے بائیں کان میں جا کر کہنا "ساقی کہتا ہے یار تم بعد میں جانا پہلے مجھے جانے دو اور اگر تم پہلے چلے گئے تو میں بہت برا مانوں گا"۔ جب میں خواجہ صاحب کے پاس کھڑا تھا تو یہ بات میرے ذہن میں تھی لیکن میں نے کہی نہیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اس بات کو ماننے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ سوچا، وہ ایک دوست کی بات نہیں رکھ پائیں گے تو دکھی ہو جائیں گے اور ساقی صاحب کا منہ بھی خالی جائے گا۔ اس لیے ساقی صاحب کی فرمائش پوری نہ کی۔ میں وہاں موجود ڈاکٹر سے کچھ دیر بات کرتا رہا۔ خواجہ صاحب کو ہم نے ہمیشہ رونق افروز دیکھا تھا۔ یوں خاموش اور بے سدھ دیکھنا سخت تکلیف دہ تھا میں باہر آ گیا۔ بھابی صاحب آئی سی یو کے دروازے پر ملیں۔ پریشان تھیں، آبدیدہ ہو گئیں۔ کہنے لگیں کل اخبار میں دعائے صحت کی خبر چھپوا دو، کیا معلوم کس کی دعا لگ جائے۔ میں نے ہامی بھری۔ اگلے دن خبر تو اخباروں میں چھپی لیکن دعائے صحت کی نہیں، نماز جنازہ کی۔ خواجہ صاحب کے بھائی، بہن اور دوسرے اعزہ آئی سی یو کے باہر موجود تھے، وہیں ذوالفقار مصطفی صاحب بھی تھے۔ میں ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں مشتاق احمد یوسفی صاحب اور الیس یوخان صاحب بھی پہنچ گئے۔ ہم سب لوگ کسی معجزے کے انتظار میں تھے۔ کچھ دیر بعد آئی سی یو کے دروازے پر آ کر ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "مریض کے بھائی کو بلائیے" اتفاق دیکھیے خواجہ صاحب کے دونوں بھائی چند منٹ پہلے کہیں گئے تھے۔ وہاں موجود دوسرے عزیزوں نے بھابی صاحبہ (بیگم مشفق خواجہ) سے کہا، آپ دیکھیے، کیا کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا، ان کے ساتھ کوئی مرد بھی آ جائے۔ یوسفی صاحب اور الیس یوخان صاحب ساتھ چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں پہلے بھابی باہر آئیں سخت پریشان تھیں۔ پھر یوسفی صاحب اور الیس یوخان صاحب ایک ڈاکٹر سے بات کرتے ہوئے نکلے۔ میں آگے بڑھا۔ یوسفی صاحب نے مایوسی سے گردن ہلائی، دھیرے سے بولے، ڈاکٹر کہتے ہیں ان کا دماغ سو گیا ہے "مائنڈ از ڈیڈ" کلینیکلی ڈیڈ ہو چکے تھے اور پھر رات گیارہ بجے سناؤنی آ گئی۔ تدفین اگلے روز عصر کی نماز کے بعد رکھی گئی تھی۔ نماز جنازہ کے لیے وضو کر کے آتے ہوئے میں نے دو آدمیوں کو گفتگو کرتے سنا۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا "یار! اگر اب کچھ پوچھنا ہو تو کس کے پاس جائیں گے؟" میں نے رک کر دیکھا، دونوں حضرات کی عمر باون پچپن سے متجاوز ہوگی۔ گویا کوئی نوجوان کسی جذباتی دباؤ میں بات نہیں کر رہے تھے۔ دو پختہ عمر لوگ ایک بے حد سنجیدہ مسئلے سے دوچار تھے۔ میں نے سوچا، ایک آدمی کے جانے سے یوں شہر خالی محسوس ہوتا ہے۔ اللہ اللہ۔ اسی کو کہتے ہیں موت العالِم موت العالَم۔

(بحوالہ: "جنگ سنڈے میگزین" ۹ مارچ ۲۰۰۵ء)

علمی اثاثے، ایٹمی اثاثوں سے قیمتی ہیں

مرحوم محقق، شاعر اور ادیب مشفق خواجہ کے لیے ایک دوست نے کہا۔ ”ایسے زندہ تر شخص کے لیے خیال ہی نہیں آتا کہ وہ مر بھی سکتا ہے۔“ ”تحقیق اور تخلیق کے سارے رشتوں کو مربوط اور مضبوط کرنے والا ایسا شخص شاید اس زمانے میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ نامور شاعر اور ادیب جمیل الدین عالی نے مشفق خواجہ کو بہت خوبصورت خراج عقیدت پیش کیا جس میں احتجاج بھی تھا۔ تخلیقی احتجاج میں التجا بھی ہوتی ہے۔ عالی جی نے دردمندی اور جرات مندی سے بات کی۔ ایک عالم کی موت پورے عالم کی موت ہوتی ہے۔ مگر ہم عالمی سیاست میں اتنے پھنسے ہوئے ہیں کہ قومی سانحے بھی ہماری توجہ اپنی طرف مائل نہیں کر سکتے۔ علمی اثاثوں کی حفاظت ایٹمی اثاثوں کی حفاظت سے زیادہ ضروری ہے۔

ڈاکٹر قدیر ایٹم بم سے زیادہ اہم ہے۔ ادیب، شاعر کی توقیر اور فلاح کے لیے لکھنے والے جمیل الدین عالی نے لکھا ہے کہ ہمارے حکمران ہر بات پر بیان جاری کرتے رہتے ہیں مگر بین الاقوامی طور پر معروف شخصیت مشفق خواجہ کو پورے دنیائے اردو کے ایک اہم اور اعلیٰ مصنف اور محقق کے دنیا سے جانے پر سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر افسوسناک خاموشی بہت تعجب انگیز ہے۔ مشاہیر کے پیغام آئے ہوئے ہیں مگر یہ صورت حال تسلی بخش نہیں۔ وہ علمی کاموں میں غرق رہتے تھے ممکن ہے سرکاری لوگ ان کے نام اور کام سے آشنا نہ ہوں۔ ایسے کام ان کے کس کام کے ہیں۔ مگر ان کے پاس ایسا سٹاف تو ہوتا ہے جو صاحب کے بارے میں خبریں لگواتا اور رکواتا رہتا ہے۔ انہیں اتنا جاہل یا احمق نہیں ہونا چاہیے کہ مشفق خواجہ جیسے شخص کی ایسی اچانک جدائی پر اپنے آقاؤں کو مطلع نہ کرے یا ان کی طرف سے تعزیتی پیغام خود جاری کر دے۔ عالی جی نے تو ایسے پی آر کو بدل دینے کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے اداروں، محکموں اور وزارتوں کے لیے بدنامی کا باعث ہوتے ہیں۔

ڈی جی پی آر پنجاب شعیب بن عزیز خود ایک اچھے شاعر ہیں اور وہ شعر و ادب سے متعلق لوگوں کے لیے اپنی طرف سے اور اپنے وزیر اعلیٰ کی طرف سے مستحق اور محروم اور مرحوم لکھنے والوں کے لیے کچھ کرتے رہتے ہیں۔ شعیب نے میرے ساتھ مل کر مشفق خواجہ کو یاد کیا تو پھر چوہدری پرویز الٰہی کو کون یاد نہ دلایا کہ وہ ایک بے بہا اور بے پناہ آدمی تھا، جس نے تحقیق کو تخلیق کے راستوں سے جا ملایا اور وہ پنجاب سے کراچی گیا تھا۔ کراچی والوں نے دل و جان سے اسے تسلیم کیا۔ ایک پنجابی کو اردو والوں تک نے اپنا پیر مان لیا۔

”نوائے وقت“ کے سجاد میر نے پہلے پہل خواجہ صاحب کے لیے اپنے کالم میں توقیر اور تاثیر اپنے لفظوں میں بھر دی۔ سجاد میر نے لکھا کہ ”میں ۳ جولائی ۱۹۷۳ء کو چند دنوں کے لیے کراچی آیا تھا اور اب ۳۰ برس ہو گئے ہیں۔ یہاں میرے اپنوں کی ہڈیاں دفن ہیں۔ لگتا ہے کہ مجھے بھی اس شہر کی مٹی [illegible] کراچی میں جو پیارے ہیں ان سے میر صاحب کا خون کا رشتہ نہیں۔ کتاب اور خواب کا رشتہ [illegible] اطہر نفیس، عزیز ہاشمی، سلیم احمد اور اب مشفق خواجہ جن کی قبر پر حاضری دینا جیسے اپنے قلب میں [illegible] کی طرح ہو گیا ہے۔

خواجہ صاحب کی سرکاری طرف سے تعزیت نہ سہی مگر سندھ کی حکومت نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ ارباب [illegible] وزیر [illegible] امتیاز شیخ کے ساتھ سیاسی دھینگا مشتی سے فرصت ہی نہیں جسے امین فہیم نے نورا کشتی کہا [illegible] پارٹی کی صوبائی اور مرکزی قیادت کی طرف سے بھی کوئی تعزیت نہیں آئی۔ کراچی کے پرنٹ [illegible] خواجہ صاحب مرحوم کے لیے محبت کا ثبوت دیا ہے مگر الیکٹرانک میڈیا نے پرواہ نہیں کی۔ لاہور [illegible] ادبیات کے قاضی جاوید نے مشفق خواجہ کے لیے ایک تعزیتی ریفرنس کیا جس میں شہر کے ان [illegible] شرکت کی جو قاضی جاوید کے دوست ہیں۔ مشفق سے محبت کرنے والے بھی موجود تھے۔

مشفق خواجہ کے لیے سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ کتاب اور خواب کے آدمی تھے۔ [illegible] میں کسی شخص کی ذاتی لائبریری ایسی نہ تھی۔ خواجہ صاحب کا پورا گھر ہی کتب خانہ تھا۔ کہا گیا [illegible] گھروں کی طرح ہوتی ہیں، ان میں رہنا چاہیے۔ مشفق خواجہ نے ساری عمر اسی گھر میں گزاری [illegible] کا لطف بھی اٹھایا۔ مشفق خواجہ کے کچن میں بھی کتابیں پڑی تھیں۔ ہمارے ہاں گھروں میں [illegible] دسترخوان، کچن وغیرہ سب کچھ ہوتا ہے، صرف اسٹڈی روم نہیں ہوتا۔ ہم اسٹڈی کرتے ہی [illegible] Habit [illegible] نہیں رہی۔ ہم پڑھنے کی عادت بھلا بیٹھے ہیں۔ ہمیں صرف ایٹنگ ہیبٹ یعنی [illegible] کی عادت ہے۔ کھانے اور پینے کو الگ الگ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ہمارے محاورے اور [illegible] کھانے سے منسوب ہیں۔ قسم کھانا، غم کھانا، گرمی کھانا، وغیرہ وغیرہ۔ ہم اپنے شہروں [illegible]

[illegible] لاہور کے ساتھ مربوط کرنے کے لیے [illegible] کتاب اور خواب سے کیا [illegible]

کراچی میں مشفق خواجہ کے چلے جانے کا [illegible] خواجہ صاحب مرحوم [illegible] نہیں کیا۔ [illegible] جاری ہیں۔

ان میں اپنی خواتین کتنی ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک سے امید ہے کہ ایک شاندار تقریب مشفق خواجہ کے لیے اسلام آباد میں منعقد کریں۔ مشفق خواجہ انتقال سے چند دن پہلے ڈیفنس لائبریری کے ہال میں جو تقریب ہوئی اس میں جمیل الدین عالی نے اس سازش کی طرف اشارہ کیا کہ اردو لغت کو مقتدرہ میں ضم کیا جا رہا ہے اور وہاں موجود لائبریری کو اسلام آباد منتقل کر دیا جائے گا۔ یہ بھی کسی بہت بڑے کے انتقال سے کم خبر نہ تھی۔ اس پر سرکاری اور غیر سرکاری آدمیوں نے بہت زوردار باتیں کیں۔ باتیں ہوتی رہتی ہیں اور جو ہونا ہوتا ہے ہو جاتا ہے۔ اردو لغت کی لائبریری کی طرح اب مشفق خواجہ کی لائبریری کی فکر کرنا چاہیے۔ اس کے حوالے سے جمیل الدین عالی اور مجاہد بریلوی کو مل کر کچھ کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ خود کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کتاب گھر کی بجائے کباب گھر کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسلام آباد والوں کو فائلیں پڑھنے سے فرصت نہیں، کتابوں کا وہاں کیا کام ہے۔ شہر اپنی تہذیبی، تخلیقی اور تحقیقی روایت میں اپنی حکایت بناتے ہیں۔

شہر بھی ہوتے ہیں تاریخ بنانے والے۔ اس حوالے سے کراچی، لاہور، پشاور اور ملتان جیسے شہروں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ بہت چھوٹے شہروں اور گمنام گھروں میں بھی خواب اور کتاب کے درمیان ٹوٹے پھوٹے دلوں والے لوگ ہوتے ہیں۔ کالم بھی لکھے مشفق خواجہ نے اور کالم نگاری کو سالم نگاری بنا دیا۔ ادبی کالم میں کلام جیسی محبوبیت خواجہ صاحب ہی لے کے آئے۔ ان کے جملے لوگ ایک دوسرے کو ایسے سناتے تھے جیسے اشعار سنائے جاتے ہیں۔ شہرت سے دور آدمی نے کبھی کالم پر اپنے نام کی اشاعت مناسب نہ سمجھی۔ ہم جیسوں کا نام مرروز چھپتا ہے ممکن ہے کچھ لوگ ہمیں جانتے ہوں۔ مگر مشفق خواجہ کو تو لوگ مانتے ہیں۔ کچھ کالم نگاروں کا نام لوگوں کی زبان پر آ جاتا ہوگا مگر "سر راہے" کے مرحوم محمد سلیم تو لوگوں کے دلوں میں رہتے تھے۔ یہی حال مشفق خواجہ کا تھا۔ ردی میں بکنے والی کتابیں بھی شائع ہوں تو خوشی ہوتی ہے۔ ایک جملہ مشفق خواجہ کا "نجانے اس طرح کی کتابیں کس طرح کے لوگ پڑھتے ہیں" ایک جملہ میری طرف سے مشفق خواجہ کے لیے "نجانے اس طرح کے آدمی کس طرح مر جاتے ہیں؟"

(بحوالہ: روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، ۱۰ مارچ ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ بھی گزر گئے

دراصل مرحوم کا اصل نام خواجہ عبدالحئی تھا مگر انہوں نے اپنے لیے مشفق خواجہ کا ادبی نام منتخب کیا اور یہی نام انہیں زیب دیتا تھا۔ چونکہ ان میں شفقت اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یوں تو خواجہ صاحب شاعر اور ادیب بھی تھے مگر انہوں نے پاکستان اور ہندوستان میں اردو تحقیق و تنقید میں منفرد مقام حاصل کر لیا تھا۔ میری ان سے پہلی ملاقات اپنے برادر نسبتی میجر (ر) ابن الحسن مرحوم کے ساتھ ہوئی تھی اور پھر وقتاً فوقتاً کسی ادبی تقریب میں ان کا دیدار ہو جاتا تھا۔ وہ "جنگ" اخبار اور پھر "نوائے وقت" میں میرا کالم بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور اپنی رائے کا اظہار بھی فرماتے تھے۔ انہوں نے میری پولیس ملازمت کی داستان "چھتیس برس" کی داد دی تھی اور جب یہ کتاب کراچی میں ناپید ہو گئی تو میری اجازت سے راولپنڈی میں اسے چھپوایا۔

کچھ عرصے سے خواجہ صاحب نے کہیں آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ ان کے زبردست حافظے کی داد دینی پڑتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مجھے کسی شعر کا دوسرا مصرع نہ یاد آ رہا ہو اور میں نے ان سے رجوع کیا ہو تو انہوں نے بلا توقف نہ صرف وہ پورا شعر سنا دیا ہو بلکہ اس غزل یا قصیدے کے اگلے اور پچھلے چند اشعار بھی میرے گوش گزار کر دیے ہوں۔ انہیں اپنے طالب علمی کے دور سے ہی مضمون نگاری کا ذوق تھا اور انہوں نے ابن انشاء کے تعاون سے کراچی یونیورسٹی کی اولین میگزین شائع کی تھی۔ خواجہ صاحب کو علم و تحقیق وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد بزرگوار خواجہ عبدالوحید اسلامیات اور اقبالیات کے منفرد عالم تھے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نگاہ انتخاب جب خواجہ صاحب پر پڑی تو انہوں نے انہیں ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو سے منسلک کر لیا اور وہ وہاں پر ۱۹۷۳ء تک سہ ماہی رسالہ "اردو" اور ماہنامہ "قومی زبان" کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے اور اردو مطبوعات کی قاموس کی ادارت بھی ان کے سپرد تھی اور ان کی زیر نگرانی جملہ مطبوعات ترتیب دی جا رہی تھیں اور موصوف دیگر تحقیقاتی سرگرمیوں کے بھی نگران تھے۔

خواجہ صاحب نے سعادت خان ناصر کی تصنیف "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" کی دو جلدیں بھی اصلاح و ترمیم کے بعد "مجلس ترقی ادب" کے ذریعہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۲ء میں شائع کروائیں۔ پھر ۱۹۷۸ء میں خواجہ صاحب کے منتخب کلام کا مجموعہ "ابیات" کے حریہ عنوان شائع ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں یونیسکو کے ایما پر اردو زبان کے قدیم خطی نسخوں کا ایک جائزہ شائع ہوا جسے خواجہ صاحب نے بڑی تحقیق اور عرق

ریزی کے بعد ترتیب دیا تھا۔ یہ تصنیف ۱۴۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور سے "جائزہ مخطوطات اردو" کا نام دیا گیا ہے۔ مرحوم نے احمد دین کی کتاب "اقبال" کو بھی اصلاح اور ترمیم کے بعد شائع کیا تھا۔ یہ تصنیف جب ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آئی تو اس پر بڑے اعتراضات کیے گئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۸۱ء میں ایک کتاب "غالب اور صفیر بلگرامی" کے متعلق شائع کی۔ پھر ان کے تحقیقی مقالے کتاب کی صورت میں منظر عام پر آئے۔ اس مجموعے کو "تحقیقی نامہ" کا نام دیا گیا تھا۔ ۲۰۰۳ء میں خواجہ صاحب نے یاس یگانہ چنگیزی کے کلام کا مجموعہ "کلیات یگانہ" اور اس پر تبصرہ شائع کر کے ایک بہت بڑا معرکہ سر کیا تھا اور اپنی لیاقت کا بین ثبوت پیش کیا۔ مرحوم کے متعلق یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(بحوالہ: روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، ۱۰ مارچ ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ...... عظیم محقق، عمدہ کالم نگار

مشفق خواجہ جن کا اصل نام عبدالحئی تھا، ۲۱ فروری کو رات دس بجے کراچی کے ایک اسپتال میں انتقال کر گئے۔ کچھ عرصہ پہلے انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ تقریباً ایک مہینہ زیر علاج رہے تھے۔ اگرچہ ان کی صحت جزوی طور پر بحال ہو گئی تھی اور انہوں نے علمی و ادبی سرگرمیوں میں شریک ہونا شروع کر دیا تھا لیکن چونکہ وہ فشار خون اور ذیابیطس کا شکار تھے اور ان کے گردے متاثر ہو چکے تھے اس لیے ان کی صحت کے بارے میں ان کے مداحین کو تشویش تھی۔ ان کے پاس کتب، رسائل، مخطوطات، دستاویزات اور تصاویر وغیرہ کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے کسی دوسرے نجی کتب خانے میں نہیں ہوگا۔ اس ذخیرے میں نادر و نایاب اشیاء بکثرت تھیں۔ خدا کرے یہ ذخیرہ کہیں محفوظ ہو جائے۔

خواجہ صاحب ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کشمیر سے آ کر لاہور میں بس گئے تھے۔ لاہور میں ان کے خاندان کے بہت سے افراد علوم و فنون میں بہت ممتاز ہوئے۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید بچپن میں علامہ اقبال سے متعارف ہوئے۔ جوانی میں ان سے برابر ملتے رہے اور آٹھ دس سال تک روزانہ ان سے ملاقات کے لیے جاتے رہے۔ یہ سلسلہ وفات اقبال تک جاری رہا۔ انہوں نے علامہ اقبال سے ملاقاتوں کی یادداشتیں روزنامچے کی شکل میں مسلسل قلمبند کی ہیں۔ وفات سے چند روز پہلے مشفق خواجہ نے اس روزنامچے کو حواشی اور تعلیقات کے ساتھ اشاعت کے لیے مکمل کر لیا تھا۔ خواجہ عبدالمجید (مرتب جامع اللغات)، مولوی احمد دین (سرگزشت الفاظ) اور اقبال پر پہلی تصنیف "اقبال" کے مصنف، ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید (مشہور محقق) اور پیرسٹر خواجہ فیروز الدین (علامہ اقبال کے عزیز دوست اور مشہور ماہر موسیقی خواجہ خورشید انور کے والد) ان کے نہایت قریبی عزیز تھے۔ مشفق خواجہ کے کچھ عزیز کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید بھی قیام پاکستان کے چند سال بعد کراچی چلے گئے۔ مشفق خواجہ اس وقت نوجوان تھے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ اردو کالج کراچی سے ایم اے (اردو) کی سند حاصل کی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ ان کی وفات تک انجمن ترقی اردو میں کام کرتے رہے۔ بعد ازاں بھی کئی سال انجمن سے وابستگی جاری رکھی اور سالہا سال تک رسالہ "اردو" اور "قومی زبان" کے مدیر رہے۔ کئی سال سے کوئی ملازمت نہیں کرتے تھے اور ہمہ وقت ادبی تحقیقی اور تصنیفی سرگرمیوں میں منہمک رہتے تھے۔

وہ محقق ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر اور نہایت عمدہ کالم نگار تھے۔ شاعری کا ایک مجموعہ

''ابیات'' ۱۹۷۸ء میں شائع کرایا۔ ان کے کالموں سے انتخاب کر کے مظفر علی سید نے تین مجموعے ''خامہ بگوش کے قلم سے'' ۱۹۹۵ء، سخن ہائے ناگفتنی اور سخن در سخن ۲۰۰۳ء ترتیب دیے جو ادبی کالم نگاری اور طنز و مزاح کے بہت اعلیٰ نمونے ہیں۔ علاوہ ازیں خواجہ صاحب نے ''تحقیقی ادب'' کے نام سے معیاری ادب کے پانچ مجموعے بھی مرتب کیے ان کا تحقیقی کام نہایت معیاری ہے۔ برصغیر کے محققین میں وہ صف اول کے چند گنے چنے لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ تحقیق نامہ ۱۹۹۱ء، جائزہ مخطوطات اردو ۱۹۷۹ء، غالب اور صفیر بلگرامی ۱۹۸۱ء، اقبال از مولوی احمد دین کی تدوین ۱۹۷۹ء، تدوین خوش معرکہ زیبا از سعادت خان ناصر (جلد اول ۱۹۷۰ء، جلد دوم ۱۹۷۲ء) اور تدوین کلیات یگانہ ۲۰۰۳ء ان کے معرکہ آرا تحقیق اور تدوینی کام ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے اور تحقیق و تدوین کرنے والوں کے لیے ایک معیاری ''ماڈل'' کا کام دیتے رہیں گے۔ اعلیٰ درجے کی تحقیق و تدوین نہایت مشکل ہوتی ہے۔ ایک ایک کتاب پر برسوں صرف کرنے پڑتے ہیں جب جا کر ایک معیاری کتاب تیار ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب نے زندگی بھر ان کتابوں پر خون جگر صرف کیا ہے اور ایسا معیار حاصل کیا ہے جو محققین کے لیے قابل رشک ہے۔ معیاری تحقیق و تدوین کا کام اتنا دشوار ہے اور اس کی جزئیات اتنی توجہ طلب ہیں کہ کوئی شخص اس قسم کا کام تیز رفتاری سے نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نامور محققین نے زندگی بھر میں بمشکل چند کتابیں مکمل کی ہیں۔ تحقیق و تدوین کے کام کی باریکیوں کے پیش نظر خواجہ صاحب کے کام کی مقدار تسلی بخش ہے اور معیار نہایت اعلیٰ ہے۔

خواجہ صاحب بڑے بذلہ سنج، خوش ذوق اور خوش لباس تھے۔ وہ عام محققوں کے برعکس بڑے دلکش اور خوش گفتار تھے۔ ان کی محفلوں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن انھوں نے محفل آرائیوں کو ہفتے میں ایک آدھ دن تک محدود رکھا ہوا تھا۔ باقی دنوں میں وہ صبح سے نصف شب تک بڑی محنت سے تحقیقی کام کرتے تھے حالانکہ محققین عموماً اپنے خزانے کے سانپ ہوتے ہیں۔

مشفق خواجہ ناظم آباد کراچی میں رہائش پذیر تھے اور ان کا پورا گھر فرش سے چھت تک کتابوں اور رسالوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ بے انتہا قیمتی خزانہ ہے۔ حکومت سندھ اور حکومت پاکستان کو چاہیے کہ ان کے گھر کو ''میوزیم'' قرار دے کر معاوضے کے طور پر ان کی بیگم کو مناسب رقم ادا کر کے اور ان کے اس نہایت قیمتی ذخیرے کو اسی انداز میں محفوظ کرے کہ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشفق خواجہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی بیگم، عزیز و اقارب اور مداحین کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ (آمین)

(بحوالہ: روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، ۱۷ مارچ ۲۰۰۵ء)

محمد احمد سبزواری

مشفق خواجہ لائبریری

کتاب خریدنا بہت مشکل، مستعار لینا آسان اور چرانا بہت سہل اور اس کو دوست احباب اور دیمک سے بچانا سب سے زیادہ دشوار ہے۔ روپیہ پیسہ ضائع یا چوری ہو جانے کے بعد پھر جمع کیا جا سکتا ہے مگر ضائع ہو جانے والی کتاب کا دوبارہ حصول ناممکن۔ حکیم سعید شہید کی تحقیق کے مطابق مسلمانوں کے مخطوطات اور کتابوں کی تعداد تین ملین سے زائد ہے، ان کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے اور تاریخ کے صفحات میں صرف ان کے نام ہی ملتے ہیں، حتیٰ کہ قدیم الہامی کتابیں ''صحائف ابراہیم''...... ''زبور'' ''توریت'' اور ''انجیل'' تک محفوظ نہ رہ سکیں۔ بعد میں ان کو یادداشتوں وغیرہ سے مدون کیا گیا۔ یہ فخر صرف قرآن پاک کو حاصل ہے کہ وہ آج پندرہ سو سال تک بلا کم و کاست زیر زبر کے پوری طرح محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔

بڑی محنت اور محبت سے کتابیں جمع کر کے کتب خانے بنتے ہیں، خدا بخش لائبریری، انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ خاص، غالب لائبریری ایک دن میں نہیں بنیں۔ ان میں خدا بخش مرحوم، مولوی عبدالحق، مظفر الحسن مرحوم کی بے لاگ کاوشوں کو بڑا دخل تھا۔ راقم نے کئی لائبریریوں کو بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے۔ بھوپال میں میاں فوجدار محمد خان کا کتب خانہ جس میں غالب کا وہ قلمی نسخہ شامل تھا جس سے نسخہ حمیدیہ مرتب ہوا ان کے بیٹے کی وفات کے بعد اولاً حمیدیہ لائبریری اور بعد ازاں سنٹرل لائبریری میں ضم ہو کر اپنی آدھی سے زیادہ کتابوں سے محروم ہو گیا۔ نواب سلطان جہاں کی ذاتی لائبریری بھی ان کے انتقال کے بعد تتر بتر ہو گئی۔ میرے اسکول کے ایک ساتھی محمد اسماعیل نے کتاب گھر قائم کیا۔ بقول مولوی عبدالحق ''کتاب گھر میں بعض نادر کتابیں بھی ہیں، میں محمد اسماعیل صاحب کی ہمت پر آفریں کرتا ہوں''۔

اسماعیل صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اور آخر عمر میں اپنی طویل علالت کی بنا پر کچھ کتابوں کو بیچ دیا اور باقی ان کی وفات کے بعد غتر بود ہو گئیں۔ میرے والد صاحب کے پاس پانچ چھ سو کتابیں اور مصور نادر تصویریں تھیں۔ کتابوں میں بھوپال کی سرکاری اور غیر سرکاری مطبوعات کا ہر اسپیے تذکرہ خوشیہ، تاریخ ملک پور، ماسٹر ولی محمد کے اندلس، مصر اور اقصائے عرب کے باتصاویر سفرنامے، انسائیکلوپیڈیا ہمیہ کی طباعت جنوبی افریقہ میں چھپی ہوئی ضخیم مذہبی کتابیں، نیلی چھتری وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھوپال کے والی خاندانوں کی تقاریب، جارج پنجم کے ۱۹۱۲ء کے دہلی دربار کی تصویریں جن میں شہنشاہ اور ملکہ

بہت اونچی زر دوزی کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور نیچے ایک بہت بڑا قالین بچھا ہے۔ نظام حیدر آباد، بیگم
بھوپال، مہاراجہ میسور، راجگان پنجاب قالین کے وسطی پھول سے بھی پیچھے کھڑے ہوئے شہنشاہ معظم کو
سلامی دے رہے ہیں، پرنس آف ویلز کے بھوپال، میسور اور نیپال کی شکار کی تصویریں، بھوپال میں
مختلف وائسرایوں اور اعلیٰ برطانوی حکام کی آمد اور خاندانی تصویریں شامل تھیں۔ والدہ صاحبہ ان کو خود ہر
سال برسات کے بعد دھوپ دیا کرتے تھے، یہ دیواروں کے اندر بنی ہوئی الماریوں میں رکھی رہتی تھیں۔
ان کی وفات کے بعد پاکستان میں آ گیا اور دوسرے بھائیوں نے توجہ نہ دی اور چند سال بعد سارے
اثاثے کو دیمک چاٹ گئی، خود میری اپنی کتابیں جو گھر کی الماریوں میں تھیں میرے پاکستان آنے کے
بعد کچھ غائب ہو گئیں اور باقی سو، سوا سو کتابیں میں نے سٹی کالج (جو اب یونیورسٹی بن چکا ہے) کو عطیہ
کر دیں۔ دوسری مرتبہ کی جمع کردہ کتابیں بیت الحکمت کو دے دیں اور اب کوئی ہزار کے قریب کتابیں
موجود ہیں جن میں بعض مثلاً پاکستان اکنامک سروے کا پچاس سالہ سیٹ شامل ہے جس کی حفاظت ایک
مسئلہ بنی ہوئی ہے۔

خود انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوا اور ابھی پورے طرح جمنے بھی نہ پایا
تھا کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں لوٹ اور آتشزدگی کا شکار ہوا، بچا کھچا ذخیرہ مولوی صاحب کے ایک شاگرد
محمد رفیق اور زاہد حسن مرحوم پاکستان کے ہائی کمشنر کی معاونت سے بوریوں میں بھر بھر کر کراچی منتقل
مولوی صاحب کی آخری زندگی میں جب ان کے قریبی ساتھیوں نے (میں جان بوجھ کر نام نہیں لکھ رہا)
ان کو انجمن اور کتب خانے سے بے دست و پا کر کے چوتھی منزل پر پہنچا دیا تو کتب خانے کی بہت سی
کتابیں غائب ہو گئیں، جن کا پتہ اس وقت چلا جب ڈاکٹر اسلم فرخی نے چغتائی صاحب کو کتابوں کے
جائزے پر مامور کیا۔ پرانے لوگوں خصوصاً حیدر آبادیوں اور جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں کو خصوصاً حیدر آ
کے کافی دنوں بعد ۱۸، اگست کی تاریخ یاد ہوگی جب رات کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں آگ لگ گئی
چار سو کے قریب علوم و فنون کے وہ تمام تراجم راکھ ہو گئے جو برصغیر کے اعلیٰ دماغوں کی کاوشوں کا نتیجہ
اور جن پر لاکھوں روپے صرف ہوئے تھے۔ (راقم کا بھی ایک ترجمہ اس میں شامل تھا)

قیام پاکستان کے وقت خالق دینا ہال میں ایک لائبریری تھی، کسی طرح محمود علی خان جامعی اس
اعزازی سیکرٹری بن گئے اور انہوں نے مجھے بھی انتظامیہ کا رکن بنا لیا، میں سرکاری مصروفیات کے
وہاں زیادہ نہیں جا سکا۔ ایک ملاقات میں خان صاحب نے بتایا کہ انچارج صاحب لاپتہ ہیں۔ ہم لوگ
وہاں گئے، رجسٹر میں میرے نام پر کوئی دس بارہ کتابوں کا اجراء درج تھا اور کئی ناموں کے آگے بھی کتابیں
لکھی ہوئی تھیں۔ گو غالب لائبریری میں فیض صاحب کا نام بطور سرپرست درج تھا مگر اس کا سہرا اصل
پر مرزا اظفر الحسن کے سر ہے جس نے ابتدا میں رسائل جمع کرنا شروع کیے، خود میرے پاس سے
"معاشیات" کا پورا سیٹ اٹھا لے گئے، ان کے انتقال کے بعد مختار زمن، ڈاکٹر فرمان فتح پوری،

انصاری اور مشفق خواجہ وغیرہ اس کے رکن ہوئے مگر کوئی بھی اتنا وقت نہیں دے سکا جیسا مرزا مرحوم دیا
کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی چیزیں غائب ہو گئیں۔

۱۹۷۸/۷۹ء میں راقم اپنی زکوٰۃ کی کتاب کی تیاری میں لیاقت نیشنل لائبریری جایا کرتا تھا، اس
زمانے میں یہ "کھلی" (اوپن) لائبریری تھی مثلاً ڈکشنریاں، انسائیکلوپیڈیا، حوالوں کی دوسری کتابیں بڑے
ہال کے چاروں طرف کھلی الماریوں میں رکھی رہتی تھیں۔ لوگ آتے اور اپنی ضرورت کی کتاب خود نکال
لیتے تھے، چند ماہ پہلے مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ہال میں کوئی کتاب نہیں تھی، ساری کتابیں اندر
منتقل ہو چکی تھیں اور ان کو پرچیوں کے ذریعے نکلوایا جاتا تھا، اس تبدیلی کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ یار لوگوں
نے بہت سی کتابیں غائب کر دی ہیں، مجھے اندر کمروں میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کتابیں کسمپرسی کی
حالت میں پڑی ہیں، بعضوں پر گرد کی تہ جمی ہوئی ہے، جلدیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔

مرحوم مشفق خواجہ سے میرے روابط اس وقت سے تھے جب وہ انجمن سے متعلق تھے اور میں نے
۱۹۴۹ء میں انجمن کے رسالہ "معاشیات" کی ابتدا کی۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے میں شام کو دفتر کے بعد
وہاں جاتا تھا اور دو سال اردو کالج میں معاشیات کی ایم اے اور آنرز کی شام کی کلاسوں میں جز وقتی
پروفیسر کی حیثیت سے جانا ہوتا تھا، وہاں اکثر شام کو خواجہ صاحب سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی، اسی
زمانے میں میں نے "علم معاشیات پر اردو کتابیں اور ترجمے" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا اور چھپے
ہوئے ان کی سنہ وار تفصیل بھی دی تھی۔ مولوی الیاس برنی مرحوم اور دوسرے اصحاب نے اس کی بڑی تعریف
کی۔ اس کی اشاعت کے دو ڈھائی سال بعد خواجہ صاحب نے بتایا کہ انہوں نے علامہ اقبال کی کتاب
"علم الاقتصاد" پر تحقیق کرتے ہوئے معاشیات کی چند ابتدائی کتب کا پتہ چلایا اور اولاً ان کی یہ تحریر انجمن
کے رسالے اردو میں شائع ہوئی اور ۱۹۷۷ء میں جب "اقبال نمبر" کو دوبارہ شائع کیا گیا تو اس کو ضمیمے میں
شامل کر لیا گیا۔

مرحوم کو فوٹو گرافی سے دلچسپی تھی اور وہ اپنے پاس آنے والے دانشوروں، شاعروں، ادیبوں کے
فوٹو بھی کھینچا کرتے تھے، راقم کی بھی اس طرح دو مرتبہ عزت افزائی فرمائی، ان تصویروں کے علاوہ
موصوف کے پاس کتابوں اور بعض مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو غالباً کراچی میں کسی کے پاس نہ ہوگا،
انتقال سے چار ہفتے قبل میری مرحوم سے ان کے فلیٹ پر ملاقات ہوئی تھی، میں نے ان کی لکھنے کی پوری
جگہ دیکھی اور ملاقات کے کمروں کے علاوہ بالائی منزل پر چاروں طرف کتابوں سے الماریاں بھری ہوئی
تھیں، کتابیں اتنی زیادہ تھیں کہ بعض کونوں میں زمین پر ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ انتظام کر
رکھا تھا کہ بھارت میں جو علمی اور ادبی کتاب شائع ہو اس کا ایک نسخہ ان تک پہنچ جائے پھر ہر ماہ درجنوں
کتابیں تحفوں میں وصول ہوتی تھیں۔ محترمہ آمنہ مشفق یا ان کا کوئی عزیز اتنے بڑے ذخیرے کی دیکھ بھال نہیں
کر سکتا اس لیے میری گزارش ہے کہ محترم جمیل الدین عالی، محترم ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری،

ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر سحر انصاری جیسے اصحاب گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کو اس طرف متوجہ کریں۔ پھر گورنر صاحب خود شاعر اور علم دوست اور ادیب نواز شخصیت ہیں کہ فی الحال کسی سرکاری عمارت میں اس ذخیرے کو منتقل کرائیں اور پھر ایک معقول عمارت بنا کر مشفق خواجہ لائبریری کا تحفہ اہالیان کراچی کو مرحمت کریں۔ یہ سارا کام ایک فرصے کے سپرد ہو مگر اس کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ لائبریرین یا منتظم کسی سخت مزاج فرد کو بنایا جائے جو عملے کی نگرانی کرے اور کتابوں کی خورد برد کو ناممکن بنا دے۔ بقول عالی صاحب اس ''طلسمی کتب خانے'' کو بچانے کا ذمہ قوم پر عائد ہوتا ہے۔

(بحوالہ: روزنامہ ''جنگ'' لاہور، ۷ امارچ ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

مشفق خواجہ علم وادب کا خزینہ تھے

دنیائے ادب کے نامور محقق، عبدالحئی مشفق خواجہ سب کے شفیق تھے۔ یہ ایک عمومی تصور ہے کہ تحقیق وتدوین اور شعر وسخن سے وابستہ لوگوں کو ان کے انتقال کے بعد پذیرائی ملتی ہے لیکن مشفق خواجہ میدان ادب کے وہ منفرد انسان تھے جن کی صلاحیتوں کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی ہوتا ہے۔ محققین کی فہرست میں زیادہ وہ لوگ ہیں جو خشک مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مشفق خواجہ عظیم محقق ہونے کے باوجود شگفتگی، پیار، خلوص اور انسان دوستی کے جذبوں سے ہم آہنگ تھے۔ میری ان سے مولانا اخگر سرحدی کی زندگی میں ہی خط وکتابت شروع ہوگئی تھی لیکن پی ایچ ڈی کی تکمیل کے دوران ان سے نا صرف مراسلاتی رابطہ رہا بلکہ ٹیلیفون سے بھی ہماری گفتگو ہوتی رہی۔ جب بھی ان کا نمبر ڈائل کرتا تو نہایت دھیمی آواز میں ''فرمائیے'' اور لہجہ دل میں اتر جانے والا ہوتا۔

۱۹۹۳ء میں ایم فل ''اقبالیات'' کے سلسلہ میں ان کے مشورے شامل رہے۔ ''اقبال بحیثیت ادبی نقاد''..... موضوع کو نہ صرف ڈاکٹر وزیر آغا نے سراہا بلکہ مشفق خواجہ نے بھی اسے پسند کیا۔ ابراہیم جلیس فن اور شخصیت پر وہ مواصلاتی طور پر تو مشورے دیتے ہی رہے لیکن ۳ دسمبر ۱۹۹۹ء بروز جمعۃ المبارک کو اپنے مقالہ کی تکمیل کے سلسلے میں ان کی دست بوسی کے لیے کراچی پہنچا، میں ابراہیم جلیس مرحوم کے سلسلہ میں کئی دوستوں سے ملنے کا خواہش مند تھا لیکن مشفق خواجہ کی شفقت تھی کہ انہوں نے اپنے در دولت D-3-9/26 ناظم آباد کراچی میں ان احباب کو جنہیں میں ملنے کا خواہش مند تھا ایک ہی جگہ اکٹھا کرلیا۔ مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے میں نے جہاز سے ہی ان سے رابطہ کیا تو وہی مسحور کن آواز ''تبسم صاحب، فرمائیے، ہم منتظر بیٹھے ہیں'' کانوں سے ٹکرائی۔ مشہور ماہر قانون دان ڈاکٹر ایم آر ضیاء رانا اور ان کے شاگرد رشید اختر نواز کی معیتوں سے میں ناظم آباد پہنچا۔ کتابوں میں گھرے مشفق خواجہ صوفے پر براجمان تھے۔ ہاتھ میں سگریٹ تھامے بڑی محبت سے ملے۔ ابراہیم جلیس کے فرزند شہر یار جلیس، معروف دانشور، ڈاکٹر مشرف احمد، ڈاکٹر ایم آر ضیاء رانا اور دیگر احباب کی موجودگی میں تقریباً دو گھنٹے مشفق خواجہ کی صحبت میں گزرے۔

تیرہ کمروں پر مشتمل ان کی ذاتی لائبریری علم وادب کا خزینہ رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی خرچ پر دو کتابوں کی فوٹو اسٹیٹ مہیا کی اور اپنے قیمتی مشوروں اور دعاؤں سے نوازا۔ ان کی ہدایت پر میں ۴، دسمبر ۱۹۹۹ء بروز ہفتہ انجمن ترقی اردو میں امراؤ طارق سے رابطہ کے لیے عازم سفر ہوا۔ سماجی رہنما الحاج

میاں محمد انور کے فرزند میاں محمد علی کے شوروم سے مہیا ہونے والی کار نے کراچی کے فاصلے سمیٹنے کا فریضہ انجام دیا۔ بابائے قوم محمد علی جناح کے مزار پر حاضری دینے کے بعد انجمن ترقی اردو شعبہ تحقیق ڈی ۱۵۹، بلاک ۲ گلشن اقبال کراچی حاضر ہوا تو امراؤ طارق تک مشفق خواجہ کا پیغام پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ ادیب سہیل اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے نائب معتمد امراؤ طارق کی خصوصی شفقت سے ابراہیم جلیس کے بارے میں چند کتب دستیاب ہو گئیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان قومی زبان کے فروغ کے لیے ہمہ تن مصروف عمل ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ۱۹۶۱ء میں انتقال کر گئے تھے۔ ۱۹۶۲ء سے جمیل الدین عالی، انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد اعزازی مقرر ہوئے۔ ماہنامہ ''قومی زبان'' کا اجراء اس انجمن کا خاص کارنامہ ہے۔ قومی زبان کے ادارہ تحریر میں ادا جعفری، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، ادیب سہیل، اور امراؤ طارق ایسے احباب کی خدمات سنہری حروف کا درجہ رکھتی ہیں۔

عبدالحئی مشفق خواجہ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء بروز پیر بمطابق ۱۱ محرم ۱۴۲۶ھ کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ ایک عالم کی موت، درحقیقت ایک عالم کا نقصان ہے۔ مشفق خواجہ کے بارے میں جس صاحب علم سے بات ہوئی اس نے مشفق خواجہ کی ادبی خدمات کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ ۲۶ فروری ۲۰۰۵ء بروز ہفتہ لاہور سے ڈاکٹر خورشید الحسن رضوی سرگودھا تشریف لائے تو پروفیسر غلام جیلانی کی رہائشگاہ پر منعقدہ ایک ادبی ریفرنس میں انہوں نے مشفق خواجہ کی تحقیق کے میدان میں خدمات کے بارے میں مفصل بتایا۔ اپنی ملاقاتوں اور ان کی شخصی محبتوں کا تذکرہ کیا۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے ان کے ادبی خطوط کے حوالے دیئے۔ پروفیسر عبدالحمید چودھری نے ان کی قومی زبان سے گہری محبت کو خراج تحسین پیش کیا۔ میاں ایم ڈی شاہ ایڈووکیٹ نے ڈاکٹر وزیر آغا اور مشفق خواجہ کے درمیان ادبی رابطوں کا تذکرہ کیا۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ عبدالحئی مشفق خواجہ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے والد گرامی خواجہ عبدالوحید بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے متعدد کتب پر نظرثانی کر کے اپنے ادبی رجحانات کا اظہار کیا ہے۔ مشفق خواجہ ادبی حوالوں سے سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے چشمہ فیض سے ملک بھر کے ادیبوں اور شاعروں نے فیض حاصل کیا۔

مثل مشہور ہے کہ بڑے آدمی کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی اس کی عظمت ثابت کر دیتی ہیں۔ مشفق خواجہ بھی اپنے رکھ رکھاؤ، محبت بھرے انداز اور ٹھہرے ہوئے لہجے کے ساتھ بے مثل انسان تھے۔ وہ ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء سے کراچی میں قیام پذیر تھے۔ بی اے آنرز ۱۹۵۷ء میں جامعہ کراچی سے کیا اور ۱۹۵۸ء میں یہیں سے ایم اے اردو اعزازی نمبروں میں پاس کیا۔ انہوں نے ابن انشاء (شیر خان قیصر) کی معاونت سے جامعہ کراچی کا پہلا میگزین شائع کیا۔ ان میں مخفی صلاحیتوں کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھانپ لیا۔ ۱۹۵۷ء میں اپنے دست راست کے طور پر انجمن ترقی اردو میں شامل کر لیا۔ انہوں نے اس انجمن میں سولہ سال خدمات انجام دیں اور ۱۹۷۳ء تک اس سے وابستہ رہے۔

ادب کے افق پر ان کا نام دانشور، محقق، شاعر، کالم نویس اور ناقد کی حیثیت سے ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ ان کی تمام ''کاوشیں'' انہیں امر کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ ''خوش معرکہ زیبا'' ان کی مرتب کی ہوئی پہلی کتاب ہے۔ اس میں مختلف شعراء کرام کے تذکرے ہیں۔ سعادت خان ناصر کی تصنیف کو وہ از سر نو اپنے نایاب مقدمے کے ہمراہ دو جلدوں میں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر لائے۔ ایسے شعراء جو نادر خیالات اور اچھوتے اسلوب کے باوجود گمنامی و اندھیرے میں ڈوب چکے تھے اور آج سے پہلے ان پر کسی نے نہیں لکھا تھا۔ مشفق خواجہ ''پرانے شاعر نیا کلام'' کے عنوان سے انہیں سامنے لائے۔

بحیثیت شاعر ان کی ایک منفرد پہچان تھی۔ ان کا مجموعہ کلام ''ابیات'' ایسے انمول آبگینوں سے بھرا ہوا ہے کہ بے اختیار آنکھیں اور ذہن ان کے نور سے چکاچوند ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے انہوں نے ایک اور بے مثل کارنامہ انجام دیا۔ احمد دین کی لکھی ہوئی نایاب کتاب ''اقبال'' جو علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوئی تھی مگر بعض وجوہات کی بنا پر اس کے تمام نسخے ختم کر دیے گئے۔ اس محقق بے بدل نے اس کتاب کو تاریخ کے دبیز پردوں سے ڈھونڈ نکالا اور تمام تفصیلات و حواشی کے ساتھ شائع کیا۔

اپنی زندگی میں انہوں نے سہ ماہی ''اردو'' ماہنامہ ''قومی زبان'' ..... ''قاموس الکتب'' اور تحقیقی و تنقیدی مطبوعات کی نگرانی فرمائی۔ مشفق خواجہ عبدالحئی درحقیقت ہر ادبی حوالے سے بے مثل تھے لیکن تنقید میں ان کا جتنا نام معتبر ہے، اتنا ہی تمام حلقوں میں مانا ہوا بھی ہے۔ اپنے خاص قلم کی نوک سے انہوں نے کبھی سوچے سمجھے بغیر کسی پروا نہیں کیا اور جب بھی لکھا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ۔ البتہ ان کے قلم کی کاٹ بڑی گہری چوٹ کھانے والا جہاں اپنے گھاؤ پر تڑپے بغیر نہیں رہ سکتا تھا وہیں وہ ان کے انمول انداز تنقید پر داد دیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ خود ناقد کی چوٹ لگاتے تو مسیحائی بھی اپنے ہی ہاتھوں سے کر دیتے۔ یوں وہ متعدد تخلیق کار ان کے پاس اپنی تصانیف لاتے اور مقدمے لکھوا کر اپنی ''بھول چوک'' پر خود ہی ماہی بے آب کی طرح لوٹتے اور پھر اگلی بار دوبارہ مشفق خواجہ کے قلم کا ''امرت'' لینے پہنچ جاتے۔ وہ عام روایت سے ہٹ کر رہنے والے ناقد تھے۔ انہوں نے کبھی روایتی ناقدین جیسا خشک، بیزار اور نفرین کسی کے ساتھ نہیں رکھا بلکہ اس کی نسبت وہ انتہائی بذلہ سنج، ہنس مکھ اور حاضر جواب تھے۔ شگفتہ مزاجی ان کے اخلاق کا حصہ تھی۔ ان کے ذاتی کتب خانے (لائبریری) کو [illegible] کتب کا سب سے بڑا ذاتی [illegible] دلوں کا جس سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے اسکالر فیض حاصل کرتے تھے۔ میری پی ایچ ڈی کی تکمیل (۹ نومبر ۲۰۰۲ء) ''ابراہیم جلیس علمی و ادبی خدمات'' میں ان کا کردار [illegible] وہ خود بھی [illegible] کا مکمل انسائیکلوپیڈیا تھے۔ ہر موضوع پر گرفت رکھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ ایک ہی وقت [illegible] شخصیات کے کوائف اور ادبی خدمات ان کے ذہنی کمپیوٹر میں محفوظ تھیں۔ وہ نام ہی کے نہیں بلکہ [illegible] بھی نہایت شفیق اور ہمدرد انسان تھے۔

اردو ادب میں ان جیسی قد آور ہستی روز روز پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان کا انتقال دراصل ایک عہد کا نقصان ہے۔ قومی زبان کو عدالتی، تعلیمی اور دفتری درجہ دلوانے کے لیے انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد سرگرمی سے کام کیا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ پندرہ سال بعد یعنی ۱۹۸۸ء تک اردو کو ملک کی سرکاری زبان کی حیثیت دے دی جائے گی لیکن ہمارے حکمرانوں نے قومی زبان کی قدر تو کیا آئین کی قدر بھی نہ کی۔ اللہ کرے ہماری قوم کو "زبان" مل جائے۔

(بحوالہ: خبریں سنڈے میگزین، ۲۰ مارچ ۲۰۰۵ء)

اظہر حسن صدیقی

مشفق خواجہ لائبریری

یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ دوسروں کو خوش کرنے والا اور ان کے لیے اسباب خوشی کا انتظام کرنے والا اس قدر جلدی دنیا کو چھوڑ جائے گا اور اس کے بزرگ دوست اور احباب اس کے لیے ماتم کناں ہوں گے۔ وہ زمانہ بھی خوب تھا شہر میں صرف دو تین کالج تھے اور اسلامیہ کالج ابھی نیا نیا قائم ہوا تھا۔ میں اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی تقریباً ایک ساتھ ہی کالج میں داخل ہوئے تھے اور کچھ عرصہ بعد حسنین کاظمی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور پھر ابن انشاء سے ملاقات ہوئی اور مشفق خواجہ بھی آئے۔ قریشی صاحب مرحوم نے نیا نیا اسلامیہ کالج بنایا تھا مولوی صاحب ہمارے پرنسپل تھے اور اساتذہ میں ایک سے ایک لائق اور قابل استاد موجود تھے جن کی محنت اور مشقت کی وجہ سے امتحانات کے نتائج بھی اور کالجوں سے اکثر بہتر ہوتے تھے۔

مشفق خواجہ جنہیں مرحوم کہتے ہوئے دل دکھتا ہے اور یقین نہیں آتا کہ ایسا خوش مزاج اور ایسی اچھی طبیعت کا مالک اور سب کو خوش رکھنے والا یوں آسانی سے لقمہ اجل بن گیا۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف (مشفق)
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

محترم مشفق خواجہ ہم لوگوں کے تو جونیئر تھے اور اس کا لحاظ بھی بہت رکھتے تھے مگر بحث اور گفتگو میں اور خاص طور پر ایسی گفتگو میں جس سے طنز و مزاح کا پہلو زیادہ نکلتا ہو اس میں سب سے آگے رہتے تھے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اس قسم کے بہت سے معرکے ہم نے کالج اور اسکے بعد کے زمانے میں بھی بارہا دیکھے ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی اس سے لطف اٹھاتے تھے جو اس کا نشانہ بنتے تھے کیونکہ ان کی گفتگو میں دل آزاری کا کوئی پہلو نہیں ہوتا تھا اور جب کبھی خواجہ صاحب اس موڈ میں نہیں ہوتے تھے تو ایسے حضرات چھیڑ چھاڑ کر ان کو اس موڈ میں لانے کی کوشش کرتے تھے اور جب وہ موڈ میں آجاتے تھے تو محفل زعفران زار بن جاتی تھی اور ان کی محفل سے اٹھ کر جانے کا قطعی موڈ نہیں رہتا تھا مگر جب سے وہ تحقیق اور لکھنے پڑھنے کے کام کی طرف راغب ہوئے تو دوست احباب اور محفلوں سے کنارہ کش ہوتے چلے گئے ورنہ تو ہم نے ایک زمانہ وہ بھی دیکھا ہے کہ دوست احباب کی ہر محفل میں نہ صرف ان کو ہمیشہ پایا بلکہ ماشاءاللہ دلچسپ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ جب ان کے پی ای ای ایف فلیٹ میں ہر تھوڑے عرصے کے بعد کوئی نہ کوئی دعوت ہوتی

رہتی تھی جب بھی کوئی ادیب، شاعر، اہل قلم بیرون ملک سے یا لاہور، اسلام آباد وغیرہ سے آتے اور ان کی دعوت کرتے تو ہمیں ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ ہم نے تو اکثر انہی کے طفیل بیرون ملک سے آنے والے شعراء کرام ادیبوں اور اہل علم کو نہ صرف دیکھا بلکہ ان کا کلام بھی سنا اور ان سے گفتگو بھی کی بلکہ بعض اہل قلم، ادیبوں اور شاعروں سے تو پہلی ہی بار ان کی دعوت میں نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ ان کو سنا بھی۔

جب سے تحقیق و تالیف کے کاموں میں زیادہ مصروف ہوئے ملاقاتیں بھی کم ہو گئی تھیں لیکن گاہے بگاہے فون پر گفتگو ہو جاتی تھی یا پھر کسی تقریب میں اتفاقاً ملاقات ہو جاتی تھی ویسے بھی وہ عام تقریبات میں بہت کم ہی جاتے تھے زیادہ تر ہماری گفتگو فون پر ہوتی تھی ایسے مصروف آدمی کے لیے وہ بھی غنیمت تھی۔

یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ مشفق خواجہ صاحب رسالوں اور کبھی کبھار اخبارات کے لیے بھی کالم لکھا کرتے تھے جن میں اکثر ان کے تبصرے اور بعض اوقات دیگر مضامین بھی چھپتے رہتے تھے ہمیں بھی اس کا پتہ جب چلا جب انہوں نے ہماری پہلی کتاب پر تبصرہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا عنوان بھی بڑا دلچسپ رکھا "ظاہر و باطن کا فرق انسانوں ہی میں نہیں کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔" ان کے اس جملے سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ان کا فرمایا ہوا سر آنکھوں پر ان کی عنایت اور کرم تھا کہ نہ صرف انہوں نے اس کتاب کو پوری طرح پڑھا بلکہ اس پر تفصیل سے تبصرہ بھی کیا اور پڑھنے کے بعد ہماری پہلی کتاب چھپنے پر مبارکباد بھی دی کہ نیشنل بک کونسل کی انعام یافتہ کتاب کہلائی۔ کتاب چھپ تو گئی مگر آگے لکھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اگر ان جیسے کرم فرما لوگ ہمت نہ بندھاتے۔ مشفق خواجہ مرحوم جنہیں مرحوم کہتے ہوئے دل دکھتا ہے تحقیق اور تالیف میں مستقل لگے رہے ان کے کتب خانے کو ہمیں بھی کئی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور بہت سی بے بہا کتابیں ان کے اس خزانے میں محفوظ تھیں وہ خود بھی ریسرچ کے آدمی تھے انہیں اس خزانے کو محفوظ رکھنے اور اس کو ریسرچ اسکالرز کے لیے استعمال کرنے کی بڑی آرزو تھی کئی بار اس سلسلہ میں مختلف لوگوں اور اداروں سے گفت و شنید بھی ہوئی مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے اس سلسلے میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ خدا کرے ایسا ہوا ہو۔ وہ خود بھی ریسرچ کے خواہاں تھے اور اس سلسلے میں بڑی محنت اور تحقیق کرنے کے عادی تھے ان کا زیادہ وقت انہی کاموں میں صرف ہوتا تھا اور وقت کے ساتھ انہوں نے کافی عرصے سے بہت زیادہ آنا جانا کم کر دیا تھا، بات چیت بھی فون پر اتنی نہیں ہوتی تھی جتنی پہلے ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنی محنت اور لگن سے کئی اہم اور بہت لائق تحسین تحقیق کے کام کیے ہیں جن میں "کلیات یگانہ" "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" اور جائزہ اردو مخطوطات .... اس کے علاوہ بھی وہ اور کئی کتابوں پر ریسرچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور خاص طور پر ایک بہت بڑی لائبریری بنانا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں ہماری گفتگو بھی کئی دفعہ ہوتی رہی تھی مگر افسوس زندگی نے مہلت ہی نہیں دی اور ان کا وہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور غریق رحمت کرے اور

پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ ان کے دوست احباب اور مداحوں کو چاہیے جن میں ہم خود بھی شامل ہیں کہ ایک بڑی اور شاندار لائبریری بنائیں جیسی وہ بنانا چاہتے تھے اور جو ان کا خواب تھا وہ پورا ہو سکے۔ پاکستان میں بڑی بڑی اور اہم کتنی ہی لائبریریوں کا جو حال ہوا ہے وہ نہ ہو۔ ویسے بھی آج کل مختلف تعلیمی اداروں میں اکثر لائبریریوں کی حالت بہت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ہندوستان سے ہجرت کرنے والے اکثر لوگ جو اپنے ساتھ یہ اہم اثاثے لائے تھے وہ بھی اسے صحیح طور پر نہ رکھ سکے کیونکہ وہ اس قابل نہ تھے، اور ان کے صحیح طور پر استعمال کے باوجود وہ اور ترقی یافتہ طریقہ سے استعمال کر سکے۔ بہت اہم اور قیمتی مخطوطات اس طرح ضائع ہو گئے ابھی بھی خاص طور پر سندھ میں بہت سے لوگوں کے پاس اس قسم کی دستاویزات ہیں جن کو بچایا جا سکتا ہے اور صحیح طریقہ سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں جو مختلف کام وہ کر رہے تھے انہیں بھی پورا کیا جا سکتا ہے اور یہی خراج تحسین ان کے دوست احباب ان کے لیے پیش کر سکتے ہیں۔

(بحوالہ: روزنامہ "جنگ" لاہور، ۲۹ مارچ ۲۰۰۵ء)

ملک نواز احمد اعوان

خواجۂ من

محترم مشفق خواجہ صاحب کو ہم سے جدا ہوئے دو ڈھائی برس ہو گئے ہیں۔ ہر وقت ان کی شبیہ آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی ہے۔ ان کے علم و ادب سے مملو شگفتہ باتیں کانوں میں گونجتی رہتی ہیں۔ انسان چلے جاتے ہیں ان کی یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ ہمارے لیے تو علم کا ایک دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ عجیب تو باغ و بہار شخصیت تھی نہ رہی۔ موت ایک حقیقت ہے۔ جس کو ہر کوئی جانتا ہے لیکن کم ہی اسے پہچانتے ہیں۔ افسردگی سے طبیعت بندی ہو گئی ہے کئی دفعہ ان پر کچھ لکھنے کو قلم اٹھایا لیکن لکھا نہ گیا۔ بہرحال یہ فرض تو ادا کرنا ہی ہے۔

خواجہ عبدالحئی المعروف بہ مشفق خواجہ صاحب کا نام تو عرصے سے سننے میں آتا تھا لیکن ملاقات کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کے چھوٹے بھائی جناب عبدالسلام عارف ہمارے دوست ہیں تقریباً روزانہ ان سے ملاقات ہوتی تھی ایک دن فرمانے لگے بھائی جان بھی آپ کی طرح کتابوں کے بڑے شوقین ہیں۔ ایک عظیم کتب خانہ انہوں نے جمع کیا ہوا ہے میں آپ کو ان کے ہاں لے جاؤں گا، میں نے ان سے پوچھا حضرت کا نام کیا ہے۔ فرمانے لگے، مشفق خواجہ۔ میں نے کہا، زندہ باد...... کل ہی چلتے ہیں۔ وقت طے ہو گیا۔ ہم دوسرے روز تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ خواجہ عارف صاحب کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ یہ قصہ بیس بائیس سال پرانا ہے۔ دو چار مہینے بعد پھر پروگرام بنتا پھر کسی نہ کسی وجہ سے اس پر عمل نہ ہوتا۔ اس طرح سالہا سال گزر گئے پھر ہمارا تعارف جناب محمد ظفر جنجوعہ صاحب سے ہوا۔ انہوں نے فرمایا میں آپ کو خواجہ صاحب کے ہاں لے کر جاؤں گا آپ اتوار کو تیار رہیں غرض اتوار آئی اور ہم ان کے ہمراہ خواجہ صاحب کی زیارت کو ان کے ہاں حاضر ہو گئے۔ یہ پانچ سات سال پہلے کی بات ہے۔ جنجوعہ صاحب نے تعارف کرایا کہ یہ ملک نواز احمد اعوان ہیں۔ خواجہ صاحب نے فوراً فرمایا، آج کا دن بڑا بابرکت ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میں بیس پچیس سال سے آپ کا ذکر سن رہا تھا اور میری بڑی خواہش تھی کہ آپ سے ملاقات ہو۔ اب حیران ہونے کی میری باری تھی میں نے کہا، حضرت میں تو گمنام آدمی ہوں۔ آپ کن سے میرا ذکر سن رہے تھے؟ میرا تو حلقۂ تعارف بھی مختصر ہے۔ علمی و ادبی محفلوں میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ تحریر سے بھی میرا تعلق نہیں ہے۔

فرمانے لگے میرے پاس لوگ اپنی تحقیق کے سلسلے میں مطلوبہ کتاب کی تلاش میں آتے تھے، کتاب میرے پاس نہ ہوتی تو معذرت کر دیتا کیونکہ کتاب نایاب ہوتی۔ کچھ عرصے بعد ان سے ملاقات

ہوتی تو میں ان سے کتاب کا پوچھتا کہ کتاب دستیاب ہوئی کہ نہیں تو ان کی زبانی معلوم ہوتا کہ وہ کتاب آپ کے ہاں سے ان کو مل گئی بلکہ آپ نے ان کو ہدیہ بھی کر دی۔ میں بڑا حیران ہوتا کہ یہ کون کتابوں کا حاتم پیدا ہوا ہے جو ایسی نایاب کتب اس آسانی سے بانٹ دیتا ہے، وہ بھی اجنبیوں کو۔ غرض اس پہلی ملاقات کے بعد بارہا ان کے ہاں حاضری دینے کی سعادت ہوئی اور ان سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کے ہاں کی نشست ہماری تہذیبی روایت کی روشن مثال تھی جہاں ان اصحاب سے جن کے نام ہی ہم پڑھتے تھے اور لکھی ہوئی چیزوں سے استفادہ کرتے تھے، ملاقات اور بالمشافہ گفتگو کے مواقع میسر آئے۔ علمی نکات، ماضی کی داستانیں، شخصیات اور ان کی زندگی ان کی محنت اور علم دوستی کی روشن مثالیں زیر بحث آئیں۔ یہ سب ہماری تربیت میں ممد و معاون ہوتیں۔

پاکستان اور ہندوستان سے ان کے ہاں روزانہ کتابیں رسائل آتے تھے اور نشست گاہ ان کے کتب خانے کا ہی ایک کمرہ تھا جس کے تین طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں، ایک میز ان کے سامنے رکھی رہتی تھی، جس پر نو آمدہ کتب کا ڈھیر لگا رہتا تھا جو ہماری دلچسپی کا خاص مرکز تھا۔ میں خاص طور پر ان تمام کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ لیتا۔ اگر کوئی کتاب پسند آ جاتی تو اس کو ان کی اجازت سے ساتھ لے آتا اور پڑھ کر فوٹو اسٹیٹ کروا کر دوسرے ہفتے ان کو واپس کر دیتا۔ ایسی بہت سی کتابیں فوٹو اسٹیٹ کی شکل میں میرے پاس موجود ہیں۔

جب بھی کسی قسم کی بھی معلومات کی ضرورت پیش آتی میں فون پر ان سے معلوم کر لیتا، وہ فوراً تفصیل سے بیان کر دیتے مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے کبھی فرمایا ہو کہ میں کتاب دیکھ کر یا سوچ کر بتاؤں گا ہر چیز ان کے دماغ میں حاضر رہتی تھی۔

کبھی کبھی وہ نادر مخطوطات، تصاویر، خطوط بھی دکھا دیتے تھے چونکہ میرا ایک موضوع خطاطی بھی ہے اور ان کے بے شمار موضوعات میں خطاطی بھی شامل تھی اس لیے خطاطی پر کبھی کبھی گفتگو ہوتی پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتے اور اس کا قلمی نسخہ یا اصلی اٹھا لاتے اور مجھے دیکھنے کو عنایت کرتے۔ وفات سے پہلے انہوں نے ہدایت اللہ زریں رقم کی ایک وصلی دکھائی جو نہایت حسین و جمیل اور مذہب تھی۔ ہدایت اللہ زریں رقم اورنگزیب عالمگیر کے زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ کئی شہزادوں کے استاد خوش نویس تھے۔ ۱۱۱۸ھ میں بمقام احمد نگر ان کا انتقال ہوا۔ ان کی ایک وصلی دہلی میوزیم میں بھی محفوظ ہے۔ ایک اور مخطوطہ اسرار الخط بھی ان کے پاس تھا جو انہوں نے مجھے دکھایا نہایت عمدہ اور روشن خط میں لکھا ہوا تھا۔ ایسا ہی ایک مخطوطہ دہلی میوزیم میں بھی ہے جس پر ایک تفصیلی مضمون [illegible] جرنل میں شائع ہوا تھا اور اسی مخطوطے پر ایک مضمون انگریزی میں کوارٹرلی اسلامک کلچر میں شائع ہوا تھا۔ خواجہ صاحب کے پاس جو مخطوطہ تھا وہ زیادہ مکمل تھا۔ عارف نوشاہی صاحب کی تحقیق اور توسط سے تہران [illegible] چھپنے کے لیے بھیجا ہوا ہے۔

اردو زبان و ادب پر بڑی گہری نظر تھی اور اردو کی تقریباً تمام امہات کتب ان کے ہاں موجود تھیں۔ محقق تھے اور بڑی باریک بینی سے کھوج لگاتے جس کی تحسین اہل علم بڑی خوشدلی سے کرتے۔ ہر عالم محقق نہیں ہوتا، لیکن ہر محقق عالم ہوتا ہے اور خواجہ صاحب ایسے ہی عالم تھے۔ عموماً محقق تخلیقی ادب کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن خواجہ صاحب اس میدان کے بھی شہسوار تھے اور ان کی اس میدان میں بھی مقبول عام کتب تھیں اس کے ساتھ ہی وہ شاعر بھی تھے اور بہت عمدہ شاعر۔ گو انہوں نے اس صنف ادب کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔ اس کے ساتھ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنی دینی اور ادبی روایت کے امین بھی تھے۔ اپنے معاشرے کے تمام مکاتب فکر سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے ان میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ باصلاحیت افراد کو ہمیشہ آگے بڑھانے میں مددگار ہوتے تھے اور ان کو دامے درمے سخنے ہر طرح کی مدد فراہم کرتے تھے۔ گوشہ نشین، قناعت پسند اور محنت کے خوگر تھے، اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے مسلسل مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔

ایک دن مجھے فون پر بیدل کا یہ شعر سنایا، جو ان کے حسب حال تھا۔

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

یعنی اگر مجھے دنیا بھی دیں تو بھی میں اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں ہوں کیونکہ میں نے قناعت کی مہندی اپنے پاؤں پر لگا رکھی ہے۔

لیکن موت کے آہنی ہاتھ سب کو اپنی جگہ سے ہلا دیتے ہیں اور انسان اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے لیکن کم ہی ہیں جو اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو جاتے ہیں۔

صاحب آں ہمہ گفتار امروز
سائل فاتحہ و یٰسین است

الحی القیوم سے دعا ہے کہ وہ اپنے بندے عبدالحئی کی مغفرت فرمائے اور ان کی خطاؤں سے صرف نظر فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

(بحوالہ: فرائیڈے اسپیشل، ۱۸ مارچ ۲۰۰۵ء)

اردو کے نامور محقق سے ایک یادگار ملاقات

اردو زبان وادب کے نامور محقق مشفق خواجہ اب ہم میں نہیں رہے لیکن جب تک اردو زبان وادب زندہ رہیں گے، مشفق خواجہ بھی زندہ رہیں گے اور ان کی وفات اس دن ہوگی جب اردو زبان اور تحقیق کا جنازہ اٹھ رہا ہوگا۔

مشفق خواجہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ وہ دوستی کے تو قائل تھے لیکن ان کی اولین ترجیح تحقیق کی دنیا تھی، اپنا کام انہیں دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھا، اسی لیے تو وہ عمر بھر تقریباً گوشہ نشین رہے اور ناظم آباد کراچی میں ریلوے لائن کے ساتھ ایک چھوٹی سی گلی میں واقع مکان میں عمر گزاری۔

ملاقات کے خواہاں لوگوں کے لیے گھر کی چوکھٹ پر ایک چٹ لگا رکھی تھی۔ جس پر یہ لکھا ہوا تھا۔

"ملاقات سے قبل پیشگی اجازت حاصل فرمائیں۔"

ان سے ملاقات کا طریقہ دراصل یہ ہوتا کہ پہلے آپ انہیں فون کیجیے، اگر وہ آپ سے ملنا پسند فرمائیں گے تو اپنی مصروفیات کے شیڈول میں جگہ بنا کر آپ کو ایک خاص تاریخ اور خاص وقت دے دیں گے۔ ورنہ چھٹی کے ان کا انکار کیجیے۔ دوسری صورت نہایت صبر آزما تھی۔ سہ منزلہ مکان کی سیڑھیاں طے کیجیے، مندرجہ بالا چٹ پڑھیے اور دروازے پر دستک دے کر مشفق خواجہ کا انتظار کیجیے، پھر جب وہ تشریف لے آئیں اور کہیں "فرمائیے" تو آپ ان سے کہیے کہ مشفق خواجہ صاحب، کیا میں دو چار روز میں حاضر ہو سکتا ہوں؟ اگر آپ کی خوش قسمتی عروج پر ہوگی تو وہ دو چار دنوں میں سے کوئی دن دے دیں گے، ورنہ کہہ دیں گے دو چار دن بعد حاضر ہو کر معلوم کیجیے۔

مشفق خواجہ کی ملاقات سے متعلق یہ ساری باتیں سن رکھی تھیں۔ جب راقم کا جی چاہا کہ ان سے ملا جائے، میں نے انہیں فون کیا اور انٹرویو دینے کے لیے درخواست کی، دراصل نامور ادیبوں کے انٹرویوز پر مبنی ایک کتاب ترتیب دینا چاہتا تھا۔ انہوں نے یہ شرط عائد کی کہ پہلے تو میں ان کے پاس آ کر یہ بتاؤں کہ آخر میں ان سے کیوں انٹرویو کرنا چاہتا ہوں جبکہ شہر میں بہت سے اہل اور بڑے لوگ موجود ہیں اور پھر انہوں نے ایک خاص تاریخ اور وقت مرحمت فرما دیا۔ اپنا انٹرویو دینے سے قبل مشفق خواجہ نے تقریباً نصف گھنٹہ تو راقم کا انٹرویو لیا، پھر کہیں جا کر ان سے باقاعدہ گفتگو ہونے لگی اور وہ سوالات کے جوابات دینے لگے۔

● آپ کی سب سے اہم مصروفیت بہر حال تحقیق ہے، لیکن ظاہر ہے، تحقیق کے اس کام سے زندگی تو نہیں بسر کی جاسکتی، کیا آپ مالی طور پر ایک مستحکم شخص ہیں یا پنشن وغیرہ ہیں؟

- یہ تو بالکل ظاہری بات ہے کہ میں اگر خدا نخواستہ مالی مسائل میں مبتلا ہوتا اور مالی طور پر مستحکم نہ ہوتا تو یوں دنیا ترک کر کے نہ بیٹھا ہوتا۔ یہ جو تحقیق کا کام ہوتا ہے، اس کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو آدمی کے پاس وقت ہونا چاہیے اور بہت ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اس میں خرچ بہت ہوتا ہے تو پیسہ ہونا چاہیے۔ یہ مکان جو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ تین منزلہ ہے، اس میں گیارہ کمرے ہیں، ان میں دس کمروں میں میری لائبریری ہے۔ اب جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں، یہ میرا ورکشاپ ہے اور اس میں تیس ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسالے ہیں۔ میری ضرورت کی ہر کتاب یہاں موجود ہے اور مجھے کہیں دوسری جگہ نہیں جانا پڑتا، اس طرح میرے وقت کی بچت ہوتی ہے۔
- یہ جو آپ کو مالی آسودگی حاصل ہے، کیا یہ سب کچھ اسی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ پھر تو یہ بڑے کام کی چیز ہے۔
- نہیں نہیں۔۔۔ اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ تحقیق کے کام میں بھلا مالی منفعت کہاں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ مجھے مالی استحکام کے مواقع نصیب ہوئے اور مجھے روزگار کی فکر نہیں، کوئی بڑی پریشانی نہیں ہوئی اور میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں۔
- ہمارے ہاں زندگی کے ہر سنجیدہ کام میں مزاح یا تمسخر کا پہلو نکال لیا جاتا ہے۔ تحقیق جیسے انتہائی سنجیدہ بلکہ خشک کام کو بھی معاف نہیں کیا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ اگر کسی ایک کتاب سے کوئی مواد لے لیا جائے تو یہ چربہ کہلاتا ہے لیکن اگر بہت ساری کتابوں سے لے لیا جائے تو وہ تحقیق ہو جاتی ہے؟
- نہیں، یہ تو دراصل وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں پتہ ہی نہیں کہ تحقیق کیا ہے۔ تحقیق تو بازیافت کا نام ہے اور بازیافت کسی فرد کی بھی ہو سکتی ہے، کسی کتاب کی بھی اور کسی عہد کی بھی۔ میں نے خود اپنے کالموں میں تحقیق کے بارے میں اتنی باتیں لکھی ہیں اور اتنا مذاق اڑایا ہے کہ کم لوگوں نے اڑایا ہو گا اور اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو ایک چھوٹی سی کتاب بن سکتی ہے۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ کوئی تحقیق کو پڑھتا نہیں ہے اور تحقیق ہی کیا، یہاں کون سی چیز پڑھی جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ تحقیق بہت سی کتابوں سے لے کر کی جاتی ہے، احمقانہ بات ہے، کیونکہ بہت سے ایسے موضوعات پر بھی تحقیق کی جاتی ہے، جن پر کتابیں ہی نہیں ملتیں تو اسے آپ کیا کہیے گا۔
- تحقیق کا کام بذات خود کیا ہے، کیا اسے ہم ادب کہیں یا جزو ادب، آپ بتائیے۔
- جی نہیں، تحقیق کا ادب سے کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہیں ہے اور تحقیق کسی بھی حوالے سے ادب کی کوئی صنف نہیں ہے کیونکہ ادب تو تخلیق ہوتا ہے، یعنی شاعری ادب ہے، افسانہ ادب ہے، ناول اور ڈرامہ ادب ہے، یعنی انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار جس فن میں ہے، اسے ادب کہیں گے

چنانچہ تحقیق میں تو ایسا کچھ نہیں ہوتا اور یوں تحقیق بذات خود تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار نہیں ہے۔ تحقیق تو دراصل ادب کے بارے میں ایک علم ہے، ادب سے آشنائی کا، ادب سے واقفیت کا، ادبی تاریخ سے آگاہی اور معلومات حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے، یہ بذات ادب نہیں ہے۔

- آپ بیک وقت بہت سے کام کرتے ہیں۔ شاعری، کالم نگاری، مختلف پرچوں کی ادارت کے فرائض، لاتعداد ادیبوں سے خط و کتابت جس میں ظاہر ہے وقت صرف ہوتا ہے اور مغز لگتا ہے۔ تو کیا یہ بہتر بات نہ ہوتی کہ آپ صرف اور صرف یہ ایک کام "تحقیق" ہی کرتے۔ مشہور ہے کہ کئی چیزیں، کئی چیزوں کو کھا جاتی ہیں۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟
- نہیں، میرے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ آدمی بہت سے کام ایسے کرتا ہے جو محض تفریح طبع کے لیے ہوتے ہیں، مثلاً مجھے دیکھیے، مجھے فوٹو گرافی سے بے حد دلچسپی ہے، اب اگر میں فوٹو گرافی چھوڑ دوں اور کوئی یہ سمجھے کہ اس طرح میری تحقیق کا معیار بلند ہو جائے گا تو ایسی بات نہیں ہے۔ اس طرح میں نے جن ادبی پرچوں کی ایڈیٹری کی، وہ بھی عصری ادب سے واقفیت کے حصول کے لیے کی تھی مگر بعد میں وقت ضائع ہونے کے سبب یہ کام چھوڑ دیا۔
- مشفق خواجہ صاحب! ابھی آپ نے فرمایا کہ تحقیق بذات خود ادب نہیں ہے۔ لیکن دوسری جانب یہ واقعہ ہے کہ آپ کی شناخت تو تحقیق ہے مگر آپ معروف بہر حال ایک ادیب کے طور پر ہیں اور سوائے ادیبوں کے آپ کو کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آپ خود کو کہاں محسوس کرتے ہیں؟
- بات یہ ہے کہ ادیب تو بہر حال تخلیق کرنے والے ہی کو کہتے ہیں۔ "رائٹر" کا لفظ انگریزی زبان میں ہر اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کچھ لکھے (یعنی کچھ بھی لکھے) لیکن ادیب تو وہی ہوتا ہے جو ادب تخلیق کرے۔ اب رہا میرا معاملہ تو میں ایک ادیب سے زیادہ خود کو محقق کہلانا پسند کروں گا۔ ہاں، یہ اور بات ہے کہ میں نے کچھ دوسرے کام بھی کیے ہیں۔ تھوڑا بہت طنز و مزاح لکھا ہے، شاعری بھی کی ہے، چنانچہ اگر اس طرح کوئی مجھے اردو ادب میں شامل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔
- جو لوگ تحقیق سے کسی بھی حوالے سے نسبت رکھتے ہیں وہ آپ سے محبت کرتے ہیں مگر خود آپ کو اپنا تحقیقی کام کیسا معلوم ہوتا ہے، کیا آپ خود اطمینان محسوس کرتے ہیں؟
- ابھی کہاں، اطمینان تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ بھلا کام سے اطمینان کہاں ہوتا ہے۔ البتہ خود کام کرنا باعث اطمینان ہوتا ہے۔ میں تحقیق کے میدان کا بس ایک طالب علم ہوں لیکن جب میں دوسروں کا کام کرتا دیکھتا ہوں تو اپنے کام پر شرم آتی ہے۔
- ایسے کون سے لوگ ہیں جن کا کام آپ کو شرمسار کرتا ہے، یہ تو بڑی بات ہے؟

- بہت ہیں بھئی، کوئی ایک دو تھوڑا ہی ہیں۔ ایک طویل قطار ہے ایسے لوگوں کی۔ قاضی عبدالودود ہیں۔ حافظ محمود شیرانی، مالک رام، امتیاز علی عرشی، کئی لوگ ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کا کام دیکھنے کے بعد شرم آتی ہے کہ ہم نے بھلا کیا کام کیا ہے۔ یہی بات ہے بڑی شرم آتی ہے۔
- لیکن شہرت آپ کی سب سے زیادہ ہے۔
- بس شہرت ہے، مگر شہرت سے کیا ہوتا ہے، شہرت کچھ نہیں ہوتی۔
- جو بھی ہو، کم از کم کام کے حوالے سے بھی آپ کا ایک کام بے پناہ سراہا جاتا ہے، بلکہ بعض تو اسے تحقیقی کارنامہ بھی قرار دیتے ہیں، میری مراد "جائزہ مخطوطات اردو" سے ہے۔
- (مسکراتے ہوئے) ہاں، اسے لوگوں نے پسند کیا ہے، کیونکہ یہ اپنی نوعیت کا الگ ہی کام ہے۔ اس پر میری حوصلہ افزائی کی گئی ہے لیکن یہ بھی کوئی ایسا کام نہیں ہے، کوئی بھی محنت کر سکتا تھا۔
- خواجہ صاحب! آپ نہ کسی ادبی تقریب میں نظر آتے ہیں، نہ کسی مشاعرے میں جاتے ہیں اور نہ ٹیلیویژن کے کسی پروگرام میں شرکت ہوتے ہیں۔
- اجی چھوڑیے، کیا رکھا ہے ان تقریبات میں، میرے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا، کیونکہ آدمی کہیں جاتا ہے تو آنے جانے میں وقت لگتا ہے، پھر وہاں بیٹھنا پڑتا ہے تو دن تو ضائع ہو گیا اور میں اپنا دن کیوں ضائع کروں لیکن میں شادیوں اور جنازوں میں چلا جاتا ہوں، جن تقریبات میں مجھے جانا ہوتا ہے وہاں بہرحال جاتا ہوں۔
- آپ کا کوئی تو حلقہ احباب ہوگا؟
- حلقہ میرا بہت وسیع ہے۔ ایک زمانے میں تو میں ہندوستان بھی جایا کرتا تھا، جبکہ پاکستان میں خاص کر لاہور جاتا ہوں لیکن اب تو وہاں بہت سے لوگ ہی نہیں رہے، میں چن چن کر بزرگوں سے ملتا تھا، کراچی میں مجنوں گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری سے ضرور ملتا تھا۔ ملنا ملانا بہت رہا ہے۔ ہاں، تعداد کم ہے ...... یہ اور بات ہے۔
- سلیم احمد اور ابن انشاء سے بھی ملاقاتیں رہیں؟
- ابن انشاء سے تو بہت گہری دوستی رہی۔ ہم نو سال تک آمنے سامنے رہے۔ بعد میں ہم ہر روز ٹیلیفون پر بات کرتے تھے، ہاں ان سترہ برسوں میں ملاقاتیں البتہ سترہ بھی نہیں ہوئیں۔ سلیم احمد سے البتہ میل جول نہیں رہا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں کسی ایسے شخص سے نہیں ملتا تھا، جس کے ہاں مجمع لگا رہتا ہو۔ ہاں، ٹیلیفون پر اکثر بات چیت رہتی تھی، عام زندگی میں تین چار بار ہی ملاقات ہوئی ہو گی۔
- جمیل الدین عالی سے؟
- عالی صاحب سے زیادہ تر ملاقاتیں دعوتوں میں ہوتی ہیں، اگر ان کے ہاں دعوت ہو تو میں چلا جاتا

ہوں، میرے ہاں ہو تو وہ میرے ہاں آجاتے ہیں۔
- خواجہ صاحب، آپ نے مولوی عبدالحق کے ساتھ بھی کام کیا ہے، وہ اپنی ذات میں کیسے شخص تھے۔ میں لاہور گیا تو وہاں ایک صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب اردو زبان کے حوالے سے جتنے بھی قد آور ہوں مگر وہ پنجابی زبان اور پنجابیوں کے لیے نہایت تعصب رکھتے تھے، بلکہ انہیں ڈھور ڈنگر کہا کرتے تھے۔ آپ کا کیا مشاہدہ رہا ہے؟
- یہ بات جس نے بھی کہی، جھوٹ اور لغو ہے۔ مولوی صاحب جیسے شخص تھے ان کے ہاں تو اس قسم کی باتوں کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ان کے تو بہترین دوست ہی پنجابی تھے۔ مثلاً ڈاکٹر مظفر الدین قریشی، عبدالقادر، علامہ اقبال وغیرہ۔
- کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ کی بے پناہ شہرت کی وجہ آپ کی کالم نگاری ہے جبکہ بہ حیثیت محقق آپ کو اتنے ہی لوگ جانتے ہیں جس قدر تحقیق سے وابستہ حلقہ ہے اور وہ کس قدر ہے، اس کا اندازہ آپ کو بھی ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ نے کالم نگاری کا آغاز کن محرکات کے تحت کیا؟
- کالم نگاری کا قصہ کچھ یوں ہے کہ میں بہت سی کتابیں پڑھتا تھا تو مجھے افسوس ہوتا تھا کہ ان میں فلاں بات نہیں ہے، یا بہت سے علمی، ادبی مسائل ہوتے تھے۔ جن پر اظہار خیال کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اب بہرحال اس کے دو ذریعے تھے کہ یا تو میں سنجیدہ نوع کے کالم لکھنا شروع کر دوں یا پھر یہ انداز (طنز و مزاح کا) اختیار کروں۔ مجھے یہ انداز زیادہ پسند آیا کہ اس میں بات بھی کہہ دی جاتی ہے اور سننے والے کو ناگوار بھی نہیں گزرتی۔ میں نے بعض بہت ہی خراب کتابوں پہ بھی کالم لکھے اور ان کے انہی پہلوؤں کو نمایاں کیا تو میرے یہ کالم ایک طرح سے تنقیدی کالم بھی ثابت ہوئے۔
- لیکن بہرحال آپ کے کالموں سے تنازعات تو جنم لیتے تھے اور پھر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا؟
- میں نے کبھی کسی کے بارے میں غلط بات نہیں لکھی۔ یعنی جو بات لکھی ہے، وہ دلائل کے ساتھ لکھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی کو ستانے کے لیے کوئی بات لکھی ہو، چھیڑ چھاڑ البتہ ہو سکتی ہے۔ میرے ہاں بہرحال آپ کو کسی کی تضحیک کا پہلو نہیں ملے گا، بلکہ شاید آپ کو تعجب ہو کہ لوگ مجھ سے براہ راست رابطہ کرتے اور کہتے کہ خواجہ صاحب آپ ہمارے خلاف لکھیے مگر لکھیے ضرور ...... اور بعض لوگ تو اس پر ناراض بھی ہو گئے کہ میں نے ان پر نہیں لکھا اور میرے ایک دوست ہیں نذیر صدیقی، میں نے کوئی بیس کالم ان کے خلاف لکھے مگر وہ کبھی ناراض نہیں ہوئے۔ میں الفاظ احتیاط سے استعمال کر رہا ہوں۔
- کبھی کسی نے برا بھی مانا، کیونکہ آپ کے کالم کی دھار تو بے حد نوکیلی ہوا کرتی تھی، لوگ خفا تو ضرور ہوں گے۔

- زیادہ نہیں، ہاں دو مثالیں ہیں اور جب انہوں نے برا مانا تو پھر میں نے کبھی ان پر دوبارہ نہیں لکھا کیونکہ میں کسی کو ناراض کرنے یا آزار پہنچانے کے لیے تو لکھتا ہی نہیں۔
- کالم "خامہ بگوش" کے قلمی نام سے لکھنے کی کوئی خاص وجہ؟
- خامہ بگوش کے نام سے کالم نگاری کی وجہ یہ تھی کہ میں کالم نویسی کو تفریح سمجھتا ہوں۔
- تفریح سمجھتے ہیں یا اسے نسبتاً چھوٹا کام سمجھتے ہیں؟
- نہیں نہیں..... محض تفریح۔ بس اللہ اللہ خیر صلا، پھر جناب نام میں رکھا کیا ہے!
- طنز و مزاح تو آپ کا خاصہ ہے، کبھی آپ نے ادبی نگاہ پر کوئی سنجیدہ کالم بھی لکھا؟
- یہ واقعہ صرف ایک بار پیش آیا جب سلیم احمد انتقال کر گئے تو میں نے ان پر کالم لکھا تھا اور یہ سنجیدہ کالم تھا۔
- یہ بتایئے، زندگی میں کبھی پچھتاوا بھی ہوا؟
- نہیں کبھی نہیں، مجھے اپنے کسی عمل پر پچھتاوا نہیں ہوا اور میں سمجھتا ہوں، میں نے کبھی کوئی کام بغیر سوچے کیا ہی نہیں ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے جو کام ہوتے ہیں آدمی ان ہی پر پچھتاتا ہے۔
- کوئی شخص جسے آپ دو منٹ بھی برداشت نہ کر سکیں؟
- نام لوں؟........ بہت لوگ ہیں۔ مشاعرے کے شاعر جب شعر سناتے ہیں، میں برداشت نہیں کرتا۔ دو منٹ تو بہت زیادہ ہوتے ہیں میں تو دو سیکنڈ برداشت نہیں کرتا۔
- آپ نے زندگی کے کسی حصے میں محبت کی؟
- آپ جو بھی معنی لے لیں، میں نے ویسے ہر معنوں میں محبت کی ہے۔
- عورت سے، کسی لڑکی سے؟
- یہ کوئی عیب تھوڑا ہی ہے، کوئی غیر لڑکی یا عورت جس سے محبت بلکہ عشق فسق و فجور میں مبتلا نہ کرے اور معاملات پاکیزہ ہوں تو کیا مضائقہ ہے، مجھے تو اس میں عیب کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔
- آپ کی شاعری کے بارے میں اگرچہ جید شعراء کی رائے یہ ہے کہ اگر آپ تحقیق اور ادبی کالم نگاری سے غیر متعلق بھی ہوتے تو شاعری ہی وجہ شہرت بن جاتی اور آپ کا شمار عصر حاضر کے اہم ترین شعراء میں ہوتا؟
- میری رائے میں میری شاعری قابل ذکر ہی نہیں ہے۔ اور اس کے بارے میں میری کوئی اچھی رائے نہیں ہے تاہم میرے اندر کا جو شاعر ہے، وہ مرا نہیں ہے، زندہ ہے۔ لیکن میری مصروفیات کے سبب اسے اظہار کا راستہ نہیں ملتا۔ میرا جو ایک مجموعہ شائع ہوا ہے تو اعلیٰ شاعری کے معیار کے حوالے سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ البتہ وہ میرے کچھ ذاتی تجربات ہیں اور محسوسات ہیں تو بس ان کے حوالے سے وہ مجھے پسند ہے۔

- کوئی خاص کام جو آپ کرنا چاہتے ہوں؟
- کام تو بہت ہے اور صورت یہ ہے کہ یہ جو کاغذات کا پلندہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ دراصل موصول ہونے والے خطوط ہیں جن کے جوابات دینے ہیں، پھر کئی کتابیں ہیں جو ابھی باقی ہیں یعنی ایڈٹ کرنی ہیں، کئی کی اشاعت باقی ہے، ڈھیروں فائلیں بندھی رکھی ہیں، پرانے شعراء پر کام کرنا ہے، بس میری یہ خواہش ہے کہ کسی طرح یہ سب کام........ اور سب کام ہو جائے۔

(بحوالہ: روزنامہ "ایکسپریس" لاہور، ۵ مئی ۲۰۰۵ء)

ادیب سہیل (مدیر قومی زبان)

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ کے ادبی و تحریری عمل میں دو دھارے: شاعری اور تحقیق شروع سے شانہ بہ شانہ رواں تھے۔ بنیادی حیثیت شاعری کی تھی اور "ابیات" ان کا اول و آخر شعری مجموعہ۔ لیکن تحقیق کی جانب ان کے مزاج کی لپک نے انہیں شاعری کی شاخ سے اچک لیا اور پھر وہ آخر دم تک لیلیٰ تحقیق کی زلف کے اسیر رہے۔ اور تحقیق ہی ان کی تمام تر پہچان بنی۔

خواجہ صاحب ایک طرح سے کراچی اور کراچی کے باہر ریسرچ طلبہ کے لیے چھتر چھاؤں بنے رہے۔ جو شخص خواہ اس کا ادب کے کسی بھی شعبے سے تعلق ہو لینے دو لینے کے لیے اس چھاؤں میں آیا، مستفید و بامراد ہوا اور طمانیت قلب کے ساتھ لوٹا۔

اردو ادب اور بالخصوص تحقیق میں مشفق خواجہ ایک مرکزی و محوری حیثیت رکھتے تھے۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ انہیں یہ مان سمان صرف پاکستان ہی میں نہیں پاکستان سے باہر اردو دنیا، بشمول یورپ و امریکا و عرب ممالک میں بھی حاصل تھا ہندوستان میں اردو کا وسیع و عریض حلقہ ان کی بڑائی کو قدر دانی اور قدر افزائی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ خواجہ صاحب کی تصانیف "اقبال از احمد دین"، "غالب اور صفیر بلگرامی"، جائزہ مخطوطات اردو"، "تحقیق نامہ" وغیرہ کو دنیائے تحقیق میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔

خواجہ صاحب کا آخری مثالی ادبی کام "کلیات یگانہ" ہے، اس کی تحقیق و تیاری میں انہوں نے عمر عزیز کے تقریباً ڈیڑھ دہائی جگ صرف صرف کیے۔ انہوں نے اسے منفرد مقام دلانے اور نو بہ نو مواد سے اس کی گود بھرنے کے لیے پاک و ہند کے ہر ممکنہ ادبی دروازے پر دستک دی۔ اور "کلیات یگانہ" کو مکمل کر کے دم لیا۔ سر دست خواجہ صاحب کا یہ کام حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ تا حال یگانہ پر اتنا قد آور کام نہیں ہوا۔ اور مستقبل قریب میں اس نوع کے تحقیقی کام کا امکان کم نظر آتا ہے۔ یہ واقعی ایک جو کھم کا عمل تھا، جو کھم کا عمل وہی شخص ثابت قدمی سے انجام دے سکتا ہے جس کی قوت ارادی پختہ اور ان تھک ہو، اللہ نے خواجہ صاحب کو یہ قوت وافر عطا کی تھی۔

افسوس کہ خواجہ صاحب اب ہم میں نہیں رہے۔ یہ خانہ خالی ہے فی الوقت ایک ڈھنڈار کی سی کیفیت ہے۔ یوں بھی کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو اس جگہ پر عین مین اس جیسا آدمی نہیں آتا، ہر شخص کی ایک اپنی انفرادیت ہوتی ہے خواجہ صاحب حقیقی معنوں میں اپنے گونا گوں محاسن کار کی وجہ سے ایسی ہی ایک

انفرادی سطح رکھتے تھے۔ ان کے غیاب میں اس کی خانہ پری بڑی مشکل سے ہو سکے گی۔ ایسے ہی فرد خاص کے لیے کہا گیا ہے:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

(اداریہ: قومی زبان، مارچ ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ، محمد عالم مختار حق کے کتب خانے میں
ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر وحید قریشی، محمد عالم مختار حق، محبوب عالم کے ساتھ (لاہور، ۱۳ دسمبر ۱۹۹۵ء)

چند آہیں، چند آنسو

میری نظر میں مشفق خواجہ کی وفات اکیسویں صدی کا سب سے بڑا ادبی سانحہ ہے۔ وہ
خواجہ صرف ادیب، محقق، نقاد، شاعر، کالم نگار اور دانشور ہی نہیں، وہ اپنی ذات میں ایک ایسی انجمن
سے گزشتہ چار عشروں کے دوران صدہا ادیبوں نے بلاواسطہ اور بالواسطہ استفادہ کیا۔ وہ
ایک مجسم انسائیکلوپیڈیا تھے جن کے دماغ کا معلومات کا خزینہ بے دریغ تقسیم ہوتا رہا۔ وہ بظاہر
شخصیت تھے لیکن ان کا رابطہ پوری دنیا کے اردو ادیبوں سے تھا اور ادبی دنیا کے تمام گوشوں
کی خبریں ان تک پہنچتی رہتی تھیں اور وہ اردو ادب کی سب سے باخبر اور فعال شخصیت شمار ہوتے
۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کی شب کو کراچی کے ایک ہسپتال میں انہوں نے زندگی کا آخری سانس
ساتھ ہی اردو ادب کا ایک آفتاب غروب ہو گیا جو مثال خورشید اب کبھی طلوع نہیں ہو گا
دنیا اپنی محرومی پر ہمیشہ ماتم کناں رہے گی۔

مشفق خواجہ کا تعلق لاہور کے اس علمی خاندان سے تھا جس کے ایک فرد جلیل مشفق خواجہ
گرامی خواجہ عبدالوحید تھے۔ وہ اکاؤنٹینٹ جنرل پنجاب لاہور میں آزادی سے پہلے ایک اعلیٰ عہدے
فائز تھے۔ دفتری اوقات کے بعد ان کا تمام وقت اسلامیات، اقبالیات اور جدوجہد پاکستان کی
کے لیے وقف تھا اور وہ ایک رسالہ جس کا نام "مسلم آؤٹ لک" تھا، بھی نکالتے تھے۔ اس خاندان
ایک رکن مولوی احمد دین نے علامہ اقبال کی زندگی میں اعلیٰ پائے کی پہلی تنقیدی کتاب لکھی
خاندان کی ایک اور نامور شخصیت خواجہ عبدالرشید تھے۔ انہوں نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد
مسلمانوں کی بہبود تعلیم کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنی وفات تک دیال سنگھ لائبریری لاہور کے
رہے۔

مشفق خواجہ جن کا اصلی نام خواجہ عبدالحی تھا، ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے
امتحان ۱۹۵۲ء میں پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی اور
کے ساتھ مل کر کراچی یونیورسٹی کا پہلا "میگزین" نکالا۔ تعلیم کے آخری دور میں ہی ان کی ادبی
بابائے اردو مولوی عبدالحق نے پہچان لیا اور وہ انہیں ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو میں اپنے معاون
پر لے آئے، جہاں انہوں نے ۱۹۷۳ء تک خدمات انجام دیں۔ میرا قیاس ہے کہ مولوی عبدالحق
کے ساتھ وابستگی کے دور میں ہی مشفق خواجہ تحقیق ادب کی طرف ملتفت ہو گئے تھے۔ اس دور

"اردو" کی ادارت کے علاوہ ماہنامہ "قومی زبان" کی تدوین کے فرائض بھی انجام دیے۔
سعادت خان ناصر کا "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" دو جلدوں میں ایڈٹ کیا اور اس کے انکشاف
۱۹۷۸ء میں ان کی شاعری کا مجموعہ "ابیات" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یونیسکو کے تحت
"جائزہ مخطوطات اردو" کے نام سے ۱۲۲۸ صفحات پر مشتمل "سروے" پیش کیا جو اب تحقیق
کے لیے بہترین معاون کتاب شمار ہوتی ہے۔ مولوی احمد دین کی کتاب علامہ اقبال کی زندگی
آراستہ تو ہو گئی تھی لیکن بوجوہ اس کی اشاعت روک لی گئی تھی اور اس کے تمام نسخے ضائع
گئے تھے۔ مشفق خواجہ نے اس نادر تاریخی کتاب کو بازیافت کیا اور اسے اپنے مقدمے اور حواشی
۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔ ان کا ایک اور تحقیقی کارنامہ "غالب اور صفیر بلگرامی" ہے، جو ۱۹۸۱ء میں
ان کے چند تحقیقی مضامین "تحقیق نامہ" کے عنوان سے ڈاکٹر وحید قریشی نے ۱۹۹۲ء میں
اردو اکادمی سے شائع کیے۔ انجمن ترقی اردو سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ یگانہ
کے دیوان اور ان کے حالات حیات کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہو گئے۔ ان کی یہ کتاب
اکادمی بازیافت کراچی سے شائع ہوئی۔ مشفق خواجہ کو نادر و نایاب کتابوں کے علاوہ نئی اور
جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔

ان کے کتب خانے میں موجود کتابوں اور مخطوطات کی تعداد کا صحیح اندازہ تو نہیں ہے۔
پچاس ہزار بتاتے ہیں) لیکن اسے دنیا میں اردو کا سب سے بڑا نجی ذخیرۂ کتب قرار دیا جا سکتا
خواجہ کے کردار کی خوبی یہ تھی کہ وہ کتاب خرید کر پڑھتے اور اسے اپنے کتب خانے میں محفوظ کر
اور پاکستان کے اعلیٰ ناشرین کو انہوں نے ہدایت کر رکھی تھی کہ جب بھی نئی کتاب شائع
وی پی پی سے بھیج دیں۔ وہ ادبی رسائل بھی سالانہ چندہ بھیج کر منگواتے تھے۔ ان کے کتب
ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالہ نگار بے دریغ استفادہ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کراچی سے
کو مواد کی ضرورت پڑتی تو خواجہ صاحب انہیں اپنے خرچ پر "فوٹو کاپیاں" بھجواتے اور ان کے
حاصل کرنے میں امداد و کتابت کے ذریعے معاونت کرتے۔

"تخلیقی ادب" کے نام سے مشفق خواجہ نے ایک کتابی سلسلہ شروع کیا جس کے صرف پانچ
شائع ہوئے اور ادبی صحافت میں عہد ساز اور بے مثال تسلیم کیے گئے۔ انہوں نے "مکتبہ اسلوب"
اپنا ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا اور بالعموم ایسی کتابیں شائع کیں جنہیں کوئی پیشہ ور نفع پرست
چھاپنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی اردو بولی جاتی ہے وہاں مشفق خواجہ کا حلقہ
موجود ہے۔ اہم بات یہ کہ ملک کے تمام سرکاری ادبی ادارے اور اکادمیاں خواجہ صاحب کی
سے اپنا ادبی ایجنڈا تیار کرتیں اور انہیں کی معاونت سے اس کی تکمیل کرتے رہے۔ ان کی تمام
ادبی خدمت میں گزری لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے نام و نمود سے حتی کہ گریز کیا اور

ادبی صحافت میں داخل ہوئے تو اپنے کالم "سخن در سخن" کے لیے "خامہ بگوش" کا قلمی نام استعمال کیا۔ کراچی میں غالب لائبریری ایک عرصے سے ان کی نگرانی میں چل رہی تھی۔ اس لائبریری کے ترجمان رسالہ "غالب" کی اشاعت کا اہتمام بھی مشفق خواجہ ہی کرتے تھے۔

کالم "سخن در سخن" روزنامہ جسارت کراچی کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن میں جاری کیا گیا تھا، اس کا موضوع ادب اور ادیب کتاب اور مصنف تھا اور اس کا اسلوب تحریر "سخن گسترانہ" تھا جس میں کڑی تنقید، تیکھا طنز اور کڑوا مزاح ہی نہیں تحسین کا زاویہ بھی شامل تھا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ مشفق خواجہ جس مصنف پر کالم لکھتے وہ پورے برصغیر میں معروف تو ہو جاتا لیکن طنز کا وار نہ سہہ سکتا تو منہ چھپاتا پھرتا لیکن نئی کتاب شائع ہوتی تو پھر کالم لکھنے کی درخواست لے کر حاضر ہو جاتا۔ چند کالموں کی اشاعت کے بعد ہی اس کالم کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور اسے پاکستان کے علاوہ بھارت کے متعدد روزناموں اور رسائل میں بھی مکرر شائع کیا جانے لگا۔

مظفر علی سید نے جسے "تصنیف کو ریزہ ریزہ کرنے" کا عمل قرار دیا ہے وہ در حقیقت مشفق خواجہ کی بے لاگ تنقید کا زاویہ لطیف ہے جو باذوق قاری کی مسرت و بہجت کو کروٹ دیتا ہے۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

"انیس ناگی ادب کے جس بلند مقام پر فائز ہیں، اس کا اندازہ ان کی کتابوں سے نہیں باتوں سے ہوتا ہے۔ اپنی کتابیں وہ خود چھاپتے ہیں، اس لیے وہ انہیں کے پاس رہتی ہیں لیکن باتیں خوشبو کی طرح عام ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ اخبارات میں چھپتی ہیں۔"

"سحر انصاری نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور پرانے پاپیوں کی دلجوئی نہایت عمدگی سے کرتے ہیں۔ جس ادیب کی تقریب میں جاتے ہیں، اس کے عظیم ہونے میں کوئی کسر رہ جاتی ہے تو اسے تقریر یا مقالے سے پر کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ جس تقریب میں شریک نہ ہوں وہ تقریب..... تقریب رسوائی بن جاتی ہے۔"

بھارت کے ممتاز نقاد شمیم حنفی کی رائے میں..... "سخن در سخن" کی تحریریں طنز و مزاح کے طوفانی لمحوں میں بھی متین اور سنجیدہ دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تحریریں ہمیں اپنے ادبی معاشرے کے موسم، مزاج اور درجہ حرارت میں اتار چڑھاؤ کی خبر بھی دیتی ہیں۔

یہ کیفیت مندرجہ ذیل چند جملوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

"وہ جب کسی اخبار میں لکھنا چھوڑ دیتے ہیں تو اخبار کی اشاعت بڑھ جاتی ہے۔"

"ایسا شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے جو چٹنوں اور ٹماٹر کو شعر بنا دے۔"

(بحوالہ: روزنامہ "نوائے وقت" ۲۵ فروری ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر محمد سلیم

محقق اور صاحب طرز ادیب..... مشفق خواجہ

مشفق خواجہ ایک ممتاز محقق، صاحب نظر نقاد، بے باک کالم نگار، دانشور، شاعر اور مترجم تھے۔ انہوں نے اپنی علمی زندگی کا زیادہ تر حصہ تحقیق کے تپتے ہوئے صحراؤں میں بسر کیا۔ انہوں نے "جائزہ مخطوطات اردو" لکھ کر اردو ادب کے نقادوں اور محققین کے لیے کمال کی سہولت مہیا کر دی۔ نیز یگانہ چنگیزی کی کلیات کی تدوین اور "غالب اور صفیر بلگرامی" پر کام کر کے اپنی تحقیق کا سکہ منوایا۔ لیکن عوام میں ان کی شہرت ان کے شگفتہ ادبی کالموں کی وجہ سے ہوئی جو وہ خامہ بگوش کے قلمی نام سے روزنامہ "جسارت" اور ہفت روزہ "تکبیر" میں لکھتے رہے۔ اس سے ان کی دھوم مچ گئی۔ یہ کالم طنز و مزاح کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ ان میں عام طور پر مختلف کتابوں پر تبصرہ ہوتا لیکن اس طرح کہ ادب کی بات نسبتاً کم ہوتی اور زیادہ تر بیچارہ ادیب ان کے قلم کا ہدف ہوتا۔ اسلوب ان کا ایسا تھا کہ ایک دو طنزیہ فقروں ہی میں ادیب اتنا گھائل ہو جاتا کہ اس کے زخم عمر بھر مندمل نہ ہوتے۔ وہ اپنے کالموں میں ایک صاحب طرز نقاد کا رول بھی ادا کرتے تھے اور ایک دو پیراگراف میں کسی بھی ادیب نقاد اور شاعر کی نگارشات کا تجزیہ کر ڈالتے۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور ان کی بعض مسلسل غزلیں ان کی شاعرانہ صلاحیت کی خبر دیتی ہیں۔ ان کو مخطوطے، کتابیں اور رسالے جمع کرنے کا جنون تھا۔ اردو زبان کے لحاظ سے ان کا کتب خانہ دنیا بھر میں سب سے بڑا نجی ذخیرۂ کتب ہے۔ اس میں پچاس ہزار کے قریب کتابیں وغیرہ ہیں۔ وہ تحقیق کے لیے اسکالرز کو اپنی لائبریری کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑے دریا دل واقع ہوئے تھے اور ان کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتے تھے۔ وہ شگفتہ مزاج، حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے۔ اپنی معلومات کے لحاظ سے وہ اردو ادب کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ انہیں فوٹوگرافی کا بھی بے حد شوق تھا۔

ایک اعلیٰ پایہ کے محقق ہونے کے باوجود مشفق خواجہ بے حد شگفتہ بیان تھے۔ عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں کہ ان کی شگفتہ بیانی کا یہ عالم تھا۔ کہ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ دوزخ مذکر ہے یا مونث؟ تو بولے۔ "میرا خیال ہے، مونث ہے، کیونکہ لوگ اس کے عذاب سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔"

ایک محفل میں کسی نے پوچھا۔ "ہندوستان کے اردو ادب پر "بعض" "چندوں" کا غلبہ ہے جیسے پروفیسر گوپی چند، پروفیسر گیان چند اور پروفیسر حکیم چند" ..... مشفق خواجہ نے فوراً کہا۔ "مگر جناب یہ تو معدودے چند ہیں۔"

وہ "خامہ بگوش" کے نام سے کالم لکھتے رہے۔ان کے انتخاب کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ایک دفعہ انہوں نے ایک شاعر کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "" اس کتاب میں ایک سو دس گرام کا کاغذ استعمال کیا گیا ہے جبکہ شاعری صرف دس گرام کی ہے۔"

اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں کہ میرے استفسار پر نظیر صدیقی نے بتایا کہ اقبال اور رادھا کرشن کے موضوع پر انگریزی میں ان کی کتاب دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ لیکن چونکہ کتاب انگریزی میں ہے آپ کے سر سے گزر جائے گی۔ میں نے کہا کہ آپ کی اردو کی کتابیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔

مظہر امام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ منکسر المزاج اتنے ہیں کہ اپنی تحریروں سے اپنا علم بھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

جمیل الدین عالی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "عالی کے نغمے بچے بچے کی زبان پر تھے اور آخری زمانے میں تو صرف بچوں ہی کی زبان پر رہ گئے تھے۔"

۱۹۹۶ء کے "جنگ" لندن کے ادبی صفحہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "ہم اسے بہت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ پہلے ہم خالی بیٹھ کر وقت ضائع کرتے تھے اب یہی کام ہم مطالعے کے ذریعے انجام دے لیتے ہیں۔"

ساقی فاروقی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "ساقی نے فحش شاعری کرنے والوں کی فہرست میں آتش لکھنوی کا نام بھی شامل کر دیا ہے۔ اس غریب کی صوفیانہ شاعری کا فحاشی سے کیا تعلق؟ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے شائستہ اور مہذب لکھنے والوں کی فہرست میں خود ساقی فاروقی کا نام شامل کر دیا جائے۔"

ایک کالم میں لکھتے ہیں۔ "اگر گرامر کی پابندیوں کو توڑنے سے شاعری باغی ہو سکتی تو انیس ناگی موجودہ دور کا سب سے بڑا شاعر ہوتا۔"

نارنگ ساقی کی کتاب پر دیباچے میں لکھتے ہیں۔ "کسی کتاب پر دیباچہ لکھنا اس کتاب کے لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہمارے اس جملے کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ کتاب لکھنا بھی مشکل کام ہے اگر یہ کام مشکل ہوتا تو ڈاکٹر عبادت بریلوی ۸۵ کتابوں کے اور ڈاکٹر محمد حسن ۴۴ کتابوں کے مصنف نہ ہوتے۔

اسی کالم میں لکھتے ہیں کہ یہ دیباچہ ڈاکٹر خلیق انجم کی اس دھمکی کے پیش نظر لکھا گیا کہ آپ نے دیباچہ نہ لکھا تو میں خود لکھ کر آپ کے نام سے کتاب میں شامل کر دوں گا۔ "ہم نے سوچا کہ اگر ڈاکٹر صاحب نے ہمارے نام سے بھی ویسی ہی کوئی تحریر لکھ دی جیسی تحریریں وہ عموماً اپنے نام سے چھپواتے رہتے ہیں تو پھر ہم کسی کو منہ دکھانے تو کیا آئینہ دیکھنے کے بھی لائق نہیں رہیں گے۔

محسن بھوپالی کی شاعری پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔ "محسن بھوپالی سے ہم دو وجوہ سے بے حد شرمندہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نہایت محبت سے اپنی دو نئی کتابیں ارسال فرمائیں اور ہم نے کالم لکھنے میں خاصی تاخیر کر دی۔ شرمندگی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے دونوں کتابیں پڑھ لی ہیں۔"

عبدالعزیز خالد پر کالم لکھتے ہوئے انہوں نے انیس ناگی کے حوالے سے یہ لطیفہ لکھا ہے۔ "ریل کے سفر کے دوران دو مسافر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "عبدالعزیز خالد کے شعر کسی کو یاد نہیں رہتے، اگر آپ ان کے پانچ شعر سنا دیں تو میں پچاس روپے انعام دوں گا۔ دوسرے نے فوراً خالد کے پانچ شعر سنا دیے، پہلا بہت متعجب ہوا۔ اس نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا اور شرط جیتنے والے کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اپنا تعارف تو کرائیے۔" شرط جیتنے والے نے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ہی تو عبدالعزیز خالد ہوں۔"

مشفق خواجہ کبھی کبھی کسی مصنف کی تعریف بھی کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "ان کے تجربات و مشاہدات میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ انہوں نے طنز کی گہرائی اپنے بھائی ابراہیم جلیس سے اور اسلوب کی چاشنی اپنے بڑے بھائی کے جگری دوست ابن انشاء سے لی ہیں۔ مزاح میں وہ کسی کے مقلد نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی طباعی اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے اسلوب کی دلکشی (ہمیشہ) قائم رہتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ اپنے ایک کالم میں ان کی نئی کتابوں کی خوب تعریف کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں مزاحیہ انداز میں یوں لکھتے ہیں۔

"دونوں ایک ہی کالج میں استاد ہیں اور کالج بھی ایسا جس کے بیشتر طالب علم ہر سال پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کی علمی خدمات کتنی وقیع ہیں۔"

ایک ٹی وی پروگرام میں کشور ناہید نے انتظار حسین سے کہا۔ "علم کے معاملے میں میری آپ کی لڑائی نہیں ہے۔ اس پر مشفق خواجہ لکھتے ہیں۔ "محترمہ نے یہ بڑی عارفانہ بات کہی ہے۔ لڑتے ہم اسی وقت ہیں جب کسی چیز کے کھو جانے کا خوف ہو یا کسی چیز کے ہاتھ آنے کی توقع ہو جو چیز موجود ہی نہ ہو اس کے لیے لڑنا بیکار ہے۔" اس طرح ان دونوں کو متاع علم سے محروم قرار دے گئے۔ اگر کسی کتاب میں تحقیق و تاریخ کی غلطی ہوتی تو مشفق خواجہ ضرور اس کی تصحیح کر دیتے چنانچہ احمد بشیر کے اس دعویٰ پر کہ انہوں نے مولانا حسرت موہانی سے جو انٹرویو لیا تھا اس سے انٹرویو لینے کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اردو میں پہلا انٹرویو نواب معظم زمانی بیگم کا تھا جو جولائی ۱۹۴۸ء میں پروفیسر حمید احمد خان نے لیا تھا اور اسی زمانے میں شائع بھی ہوا تھا۔ اس طرح کے پہلے کا کلاکار مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں نہ کہ احمد بشیر۔

انیس ناگی کے رسالے میں ظفر اقبال کی نئی طرز کی ایک غزل شائع ہوئی جس کا مطلع یہ تھا۔

جو آن کے اسمائے ہمارے میں رہیں گا
تحقیق کہ وہ خود ہی تمہارے میں رہیں گا

اس پر اپنے ہمزاد استاد لاغر مراد آبادی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

ناگی نے جو چھاپیں ظفر اقبال کی غزلاں
جو ان کو پڑھیں گے، خسارے میں رہیں گے

ان کے تنقیدی تاثرات کے لیے ان کا ایک کالم ملاحظہ ہو۔ "الطاف گوہر کے اسلوب میں نہ تو مختار مسعود کے اسلوب کی سی جادوگری ہے جو تصنع، ملمع اور آورد سے مرکب ہے اور نہ قدرت اللہ شہاب کی افسانہ وافسوں سے بھرپور سادگی ہے جو اپنی جانب فوراً متوجہ کر لیتی ہے لیکن قاری کے ذہن پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتی۔ الطاف گوہر کا ذخیرہ الفاظ کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر طرح کے خیالات کے اظہار پر قادر ہیں۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں نہایت وضاحت سے کہہ دیتے ہیں۔

الطاف گوہر کے اسلوب کی الگ سے کوئی شناخت نہیں جیسے محمد حسین آزاد یا ابوالکلام آزاد کا اسلوب لیکن ہم اسے اردو کے بنیادی اسالیب میں شمار کر سکتے ہیں، جیسے مولوی عبدالحق یا ڈاکٹر عابد حسین کا اسلوب۔ آپ نے دیکھا کہ چند سطروں ہی میں انہوں نے بڑے موثر طریقے سے اپنا دائرہ تنقید کتنے مصنفین تک پھیلا دیا۔

این سعادت بزور بازو نیست .... تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

فراق گورکھپوری پر ڈاکٹر نوازش علی کی کتاب پر کالم لکھتے ہوئے نہ صرف فراق کی شخصیت بلکہ نوازش کی صلاحیتوں پر بھی جامع تبصرہ کر گئے ہیں۔ اور اس کالم کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس موضوع پر انہوں نے کوئی اہم بات چھوڑی نہیں۔

مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ مشتاق احمد یوسفی بھی خواجہ صاحب کے اتنے قائل اور قتیل نظر آئے کہ ان کے بعض فقروں پر سب کے سامنے اور علی الاعلان مسکراتے ہوئے پائے گئے۔

مشفق خواجہ ہندوستان گئے تو مجتبیٰ حسین سے کہنے لگے۔ "میں نے اپنا تحقیقی کام کیا، تنقیدی مضامین لکھے۔ شعر کہے لیکن یہاں کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ ہر جگہ میرے فرضی نام "خامہ بگوش" سے لکھے ہوئے کالموں کا ذکر ہوتا ہے میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مجھے اب صرف مزاح نگاری کرنی چاہیے۔

وہ چین سوکر تھے، صبح شروع ہوتے اور رات گئے تک سگریٹ پیتے رہتے۔

مشفق خواجہ کے آباؤ اجداد کشمیر سے لاہور آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید کو نہ صرف اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر عبور حاصل تھا بلکہ ان زبانوں کے ادب اور کئی ایک علوم پر ان کی گہری نظر تھی۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۸ء تک مشفق خواجہ کے دادا کریم بخش کے گھر ادبی محفلیں ہوتی تھیں جن میں علامہ اقبال اور اس عہد کی بہت سی علمی اور ادبی شخصیتیں شریک ہوتیں۔

مشفق خواجہ ۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام خواجہ عبدالحئی تھا۔ وہ چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھے کہ ان کے والد کا کراچی تبادلہ ہو گیا۔ مشفق خواجہ نے کراچی ہی سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے اسلامیہ کالج کراچی میں داخلہ لیا۔ کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں بی اے آنرز اور

ایک سال بعد ایم اے کیا۔ علم وادب کی روایت مشفق خواجہ کو ورثے میں ملی۔ گھر کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ انہیں کم عمری ہی سے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔ خلیق انجم لکھتے ہیں اور مشفق خواجہ نے طاہر مسعود کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ وہ آنرز کرنے کے دوران، مطالعہ کے لیے اکثر انجمن ترقی اردو کی لائبریری میں جاتے تھے۔ وہاں ان کی ملاقاتیں مولوی عبدالحق سے ہونے لگیں، ان کی ذہانت اور علمی ذوق سے متاثر ہو کر اور ابن انشاء کے توسط سے، جن کے مولوی صاحب سے گہرے مراسم تھے، مولوی صاحب نے ان کو ۱۹۵۷ء کے شروع میں انجمن کے جریدے "قومی زبان" کا اعزازی مدیر مقرر کر دیا۔ کچھ مدت بعد وہ انجمن کے رسالے "اردو" کے بھی ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء میں جب خواجہ صاحب نے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا تو مولوی صاحب نے انہیں "قاموس الکتب" کا مدیر بھی مقرر کر دیا اور انجمن کے شعبہ تحقیق اور مطبوعات کی نگرانی بھی انہیں سونپ دی اور اس طرح وہ انجمن کے باقاعدہ عملے میں شامل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انجمن میں بہت کم لوگ ملازم تھے اور علمی شعبے میں تو مولوی صاحب کے علاوہ شاید اور کوئی تھا ہی نہیں۔

خواجہ صاحب نے ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۳ء تک انجمن ترقی اردو میں کام کیا اور پھر ملازمت چھوڑ کر خود کو مکمل طور پر علمی وادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ انجمن ترقی اردو میں خواجہ صاحب کو "لغت کبیر" کی تیاری میں مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جس سے انہیں اردو زبان پر قدرت حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ بنیادی مسودہ تیار ہو چکا تھا۔ الفاظ کے جو کارڈ بنائے گئے تھے وہ خواجہ صاحب پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب مسودے میں ان کا اندراج کرتے جاتے۔ اس طریق کار سے خواجہ صاحب نے بہت کچھ سیکھا۔ مشفق خواجہ نے بتایا کہ ان دنوں مولوی عبدالحق صاحب کی عمر نوے (۹۰) سال یا اس سے کچھ کم ہو گی۔ وہ صبح آ کر لائبریری میں بیٹھ جاتے اور ایک بجے دوپہر تک مسلسل کام کرتے رہتے۔ یہ کام بعض اوقات تین چار گھنٹے تک جاری رہتا۔ میں تھک جاتا مگر مولوی صاحب نہیں تھکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوے سال کا بوڑھا ایک ایسی کتاب پر کام کر رہا ہے جس کو اپنی زندگی میں مکمل کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو میں آج تک نہیں بھولا۔

مشفق خواجہ صاحب کی شادی ۱۹۶۳ء میں آمنہ صدیقی سے ہوئی۔ آمنہ صاحبہ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

خواجہ صاحب کی یہ بے مثال صلاحیت قابل داد ہے کہ لکھنؤ گئے بغیر صرف اپنی بیوی کے تعاون سے انہوں نے اپنا لب ولہجہ اور انداز گفتگو بالکل لکھنو والوں کا سا بنا لیا۔ مشفق خواجہ نے ایک جگہ ابن انشاء کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جب بولتے تھے تو پنجابی معلوم ہوتے تھے لیکن جب لکھتے تو لکھنو اور دہلی والوں کے بھی کان کاٹتے تھے۔ مجتبیٰ حسین کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب نہ صرف لکھنے بلکہ بولنے میں بھی لکھنو اور دلی لکھنو والوں کے کان کاٹتے تھے۔

۱۸۳۸ء میں سعادت خاں ناصر نے ایک تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" کے نام سے لکھا تھا۔ مشفق

خواجہ نے مفصل مقدمے اور حواشی کے ساتھ اس تذکرے کا تنقیدی ایڈیشن مرتب کیا ہے۔ اس تذکرے کی پہلی جلد ۱۹۷۰ء میں اور دوسری ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔

یہاں ہم ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کرتے چلیں۔ ۱۹۷۲ء میں ریاض الحسن لکھتے ہیں کہ کوئی چالیس سال پہلے حکیم یوسف حسن کے مشہور رسالے "نیرنگ خیال" لاہور میں ایک مضمون حسب ذیل شعر کی سرخی کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مضمون نگار نے اس شعر کو نقل کر کے اس بات کا پتہ چلانے کی بہت کوشش کی یہ شعر کس کا ہے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ میر تقی میر کا رنگ اس شعر سے بالکل ملتا نہیں۔ امیر مینائی پر ان کو کچھ شبہ گزرا اور انہوں نے امیر مینائی کے تمام دیوان کھنگال ڈالے۔ مگر یہ شعر ان میں کہیں نہ ملا۔ ۱۹۷۱ء میں مشفق خواجہ کا مرتب کردہ تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" مجلس ترقی اردو ادب لاہور کی طرف سے شائع ہوا تو ریاض الحسن نے دیکھا کہ اس میں مرزا محمد تقی خاں ہوس کا مع ان کے نمونہ کلام کے ذکر ہے اور ان کی غزل کے تین شعر درج ہیں، جن میں پہلا شعر یہ ہے۔

تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ نکلے کوئی آبلہ پا میرے بعد

"آ جائے" کی جگہ "آ نکلے" ہے۔ گویا اس شعر کی تحقیق کا مسئلہ "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" سے حل ہو گیا۔

مشفق خواجہ کا اعلیٰ ترین تحقیقی کام اور ادبی کارنامہ ان کی کتاب "جائزہ مخطوطات اردو" ہے۔ یہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے۔ ۱۹۷۴ء میں انہوں نے تمام کتب خانوں میں محفوظ قلمی نسخوں کی وضاحتی فہرست تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ کام دس جلدوں میں شائع ہونا تھا۔ ۱۲۲۸ صفحات پر مشتمل پہلی جلد ۱۹۷۹ء میں مرکزی اردو بورڈ، لاہور سے شائع ہوئی۔ خلیق انجم لکھتے ہیں۔ اس میں شامل ہر مخطوطے کے بارے میں دلائل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ وہ اہم ہے یا غیر اہم۔ نیز اس مخطوطے کے نسخے دنیا کی کس کس لائبریری میں موجود ہیں۔ ان نسخوں کی خصوصیات بھی بتائی گئی ہیں۔ اگر وہ مخطوطہ چھپ چکا ہے تو مطبوعہ ایڈیشنوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ مشفق خواجہ نے مصنفوں کے سوانح بھی لکھے ہیں نیز ان پر جو کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں ان کی فہرست بھی شامل کی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم شاعروں اور ادیبوں پر کام کرنے والے محققین کے لیے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس سے ان کی کئی کئی برسوں کی محنت بچ جائے گی۔

مشفق خواجہ کے اپنے الفاظ میں اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ فرض کیجئے، آپ ناسخ پر کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ دنیا میں ناسخ کے دیوان کے کتنے قلمی نسخے

ہیں کہاں کہاں ہیں اور ان کی کیا کیا خصوصیات ہیں، وغیرہ۔ کس دیوان کے کتنے ایڈیشن چھپے ہیں، مزید برآں ناسخ کے بارے میں قدیم تذکروں سے لے کر آج تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ان سب کی تفصیل بھی آپ کو اس کتاب سے مل جائے گی۔ اس طرح یہ کتاب محققوں کے لیے بہت سی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرے گی۔

لیکن ان کی زندگی میں اس کی صرف ایک جلد شائع ہو سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک ادارے کا کام ہے۔ جس جاں فشانی سے انہوں نے یہ کام کیا ہے، اس پر علمی حلقوں نے انہیں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

انہوں نے اس کے علاوہ بھی بہت سا تحقیقی کام کیا ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے اصلی نام سے "تاریخ فرشتہ" کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

مشفق خواجہ نے ۱۹۸۰ء میں "تخلیقی ادب" کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا تھا لیکن اس کے صرف پانچ شمارے نکل سکے۔ لیکن ہر شمارہ مستقل ادبی اہمیت کا حامل ہے۔

"ابیات" مشفق خواجہ کا ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ مشفق خواجہ اس بات سے متفق نہیں کہ تحقیق نے ان کی شاعری کو دبا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے کبھی عمداً شعر نہیں کہا۔ اشعار خود بخود نازل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ان لمحوں میں جب میں شام کے وقت چہل قدمی کے لیے جاتا ہوں۔ میرا کلام اس لیے بہت کم ہے کہ شعری کیفیت مجھ پر کم کم طاری ہوتی ہے۔ مشفق خواجہ کی شاعری میں شراب و شباب اور گل و بلبل کا کوئی ذکر نہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار سن لیجیے۔

تو میرے دل میں مثال چمن مہکتا ہے
میں سانس لوں تری خوشبو بکھر بکھر جائے

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا

راہ کے مصائب سے تھک کے بیٹھنے والے
زندگی سفر میں تھی، زندگی سفر میں ہے

پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم، اس پہ ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کر لیا

ان کی غزلیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے ذاتی تجربات نے شعروں کا روپ دھار لیا ہے۔

مشفق خواجہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ دوست ضائع ہو جائے تو ہو جائے مگر وہ اپنے اچھے شعر کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

جب مشفق خواجہ ہندوستان آئے تو میں نے کہا: "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔ دہلی میں

آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"
مشفق خواجہ بولے۔ "خلیق انجم کے ہاں ہر طرح کا آرام ہے لیکن ان کے ہاں رہنے سے میرا ایک بھاری نقصان بھی ہو رہا ہے۔"
میں نے پوچھا۔ "کیا نقصان؟"
بولے۔ "خلیق انجم کے ہاں رہ کر میری زبان بگڑتی جا رہی ہے۔ میں غلط بات سن سکتا ہوں مگر غلط زبان نہیں سن سکتا۔"

مشفق خواجہ کھری کھری بات کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ "شہاب نامہ" کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ اسے فکشن کی ایک کتاب سمجھتے ہیں خالص ادب۔ اس کا سوانح عمری یا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں افراد کے جو نام ہیں وہ اصلی ہیں، باقی جو کچھ ہے وہ افسانوی ہے۔ اس میں چند واقعات غلط بیان کیے گئے ہیں۔ "شہاب نامہ" کے کئی حصے انہوں نے خود شہاب صاحب کی زبانی سنے اور جب ان پر اعتراض کیا گیا تو انہوں نے وہ حصے کتاب میں شامل نہیں کیے۔ علاوہ ازیں شہاب صاحب نے مارشل لاء کے زمانے کے اپنے بعض قابل اعتراض اقدامات کا جو دفاع پیش کیا ہے وہ بہت کمزور ہے۔ ایک تاریخ کی کتاب میں جب چند واقعات غلط ثابت ہو جاتے ہیں تو باقی جتنے واقعات ہیں ان کی تصدیق جب تک کسی دوسرے ذریعے سے نہ ہو، ہم ان کو صحیح نہیں مان سکتے۔

م۔ب خالد نے جو ایوان صدر میں شہاب صاحب کے ساتھ تھے "ایوان صدر میں سولہ سال" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے دستاویزات بھی شامل کی ہیں۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ شہاب صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "کہ قائداعظم اور اقبال کے بعد اگر کسی کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کیا ہے تو وہ ایوب خان ہیں"۔

مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ شہاب صاحب نے شہاب نامہ میں کئی بار کہا کہ میں نے استعفا دیا اور صدر نے لے کر رکھ لیا۔ اتفاق سے ان کے استعفا کا اصل مسودہ دریافت ہو گیا ہے جو ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور م۔ب خالد نے اسے اپنی کتاب "ایوان صدر میں سولہ سال" میں شامل کیا ہے۔ اس کے متن کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ استعفا تو انہوں نے خوشامد میں دیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ جناب صدر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے میں آپ کے خیالات کی نشر و اشاعت نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس پابندی کو ختم کر کے اپنی زندگی آپ کے خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دوں۔ جگہ جگہ لیکچر دوں، کتابیں لکھوں اور لوگوں کو بتاؤں کہ آپ کتنے بڑے آدمی ہیں۔ تاثر تو یہ دے رہے ہیں کہ میں نے اصولوں کی خاطر استعفا دے دیا اور جو اصول ہے وہ سب کو معلوم ہو گیا۔ تو جس آدمی کا یہ کردار ہو اس کے بارے میں آپ یقین کریں گے کہ وہ قومی مسائل پر دیانتدارانہ رائے دے گا۔

شہاب یہ بھی کہتے ہیں کہ صاحب ادیبوں کی خرید و فروخت کا کام میں نے نہیں کیا۔ یہ کام بریگیڈیئر ایف آر خان کیا کرتے تھے۔ لیکن مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ انہوں نے شاہد احمد دہلوی کو پیسے دیے۔ میں عینی شاہد ہوں۔ مزید برآں، انہوں نے مولوی عبدالحق کے نام سے ایک مضمون بنیادی جمہوریت کے کام پر چھاپا جس میں ایوب خان کی تعریف کی ہے وہ مضمون مولوی صاحب نے لکھا ہی نہیں، البتہ دستخط مولوی صاحب سے کرائے ہیں اور جب دستخط کرائے گئے تو میں وہاں موجود تھا۔ مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ جہاں تک شہاب صاحب کے صوفی ہونے کا سوال ہے تو میں ایک ایسے آدمی کو جس نے ساری عمر خوشامد میں گزاری اور اپنے عہدے کو برقرار رکھنے کے لیے وہ تمام باتیں کی ہیں جو سرکاری افسر کیا کرتے ہیں، اتنی بڑی روحانی بلندی پر سرفراز نہیں دیکھ سکتا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں۔ "مشفق خواجہ اور ان کے والد خواجہ عبدالوحید دونوں سے میری دوستی تھی لیکن دس برس تک پتہ نہ چلا کہ دونوں کا رشتہ باپ بیٹے کا ہے۔ اتفاقاً مجھے کراچی جانا ہوا، مشفق خواجہ کے ہاں قیام رہا اور میں نے ان سے کہا کہ میرے ایک دوست خواجہ عبدالوحید یہاں رہتے ہیں، ان سے ملوا دیجیے۔ مشفق خواجہ ہنس پڑے اور بتایا کہ وہ تو میرے والد صاحب ہیں"۔

۲۱ فروری ۲۰۰۵ کو وہ ہارٹ اٹیک سے کراچی میں انتقال کر گئے۔

آخری کام جو وہ مکمل کر پائے ان کے والد کی ادبی ڈائری ہے جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(بحوالہ: نوائے وقت سنڈے میگزین، یکم و ۸ مئی ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

خواجہ ادیب نواز

1988ء میں کراچی میں طنز و مزاح کانفرنس ہوئی۔ طنز و مزاح کی یہ محفل مرحوم خواجہ حمید الدین شاہد مدیر ماہ نامہ "سب رس" کراچی نے سجائی تھی۔ حمید الدین شاہد بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ انہوں نے کانفرنس پر بڑی محنت کی تھی اور ویسے بھی ان کی خوش اخلاقی اور دل نوازی کے سبھی قائل تھے۔

اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں جب خواجہ حمید الدین شاہد کو خراج تحسین پیش کیا جارہا تھا تو حاضرین میں موجود مشفق خواجہ صاحب نے کہا کہ خواجہ حمید الدین شاہد کو ان کی ادیب نوازی اور ادیبوں کی دل داری کے سبب "خواجہ ادیب نواز" کہنا چاہیے۔ یہ بات حاضرین تک پہنچائی گئی اور حاضرین مشفق خواجہ صاحب کے اس جملے کی بہت دیر تک داد دیتے رہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے لیے یہ خطاب بجا تھا، لیکن اتنا ہی بجا خود مشفق خواجہ صاحب کے لیے تھا۔ مشفق خواجہ صاحب کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

مشفق خواجہ صحیح معنوں میں خواجہ ادیب نواز تھے۔ ان کے گھر پر ہر ہفتے جمنے والی ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور دوستوں کی محفل اس کا ادنیٰ سا ثبوت ہے۔ اکادمی ادبیات کی جانب سے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی مالی امداد ان کے کہنے پر کی گئی۔ کتنے ہی اہل قلم کے علاج معالجے اور موت کے بعد کے لواحقین کے لیے رقم کی فراہمی میں مشفق خواجہ صاحب نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ لیکن انہوں نے اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی کہ اس سے نہ صرف ادیبوں کی عزت نفس مجروح ہوتی بلکہ مرحومین کے ورثا کے لیے بھی یہ اذیت کا باعث ہوتا۔ صرف چند ایسے معاملات کی سرسری اطلاع مجھ جیسے ان عام سے ملاقاتی کو اتفاقیوں ہو جاتی تھی کہ اکادمی کے سربراہ سے ان کی فون پر گفتگو ہو رہی ہوتی تھی، گفت گو کے موقع پر کبھی کبھار ہم ایسے چھٹ بھیے بھی ملاقات کی غرض سے ان کے پاس آئے بیٹھے ہوتے تھے۔

لیکن چونکہ خواجہ صاحب صحیح معنوں میں خواجہ ادیب نواز تھے لہذا انہوں نے کبھی اشارتاً بھی اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ کبھی تحریر میں لانا یا کالم کے ذریعے دنیا جہاں میں ڈھنڈورا پیٹنا (کہ میں نے فلاں ادیب کی بیوہ کو گورنر سے پانچ لاکھ روپے دلوا دیے) ان کے مزاج ہی میں نہ تھا۔

ان کی ادیب نوازی کا ثبوت ان کا وہ وسیع و عریض اور بیش بہا کتب خانہ بھی تھا جس میں مختلف موضوعات پر نایاب اور وقیع کتابوں کے انبار تھے۔ یہ کتابیں نہایت سلیقے سے اور ترتیب کے

ساتھ رکھی گئی تھیں اور مطلوبہ کتاب صرف چند منٹوں میں باہر آجاتی تھی۔ ان کے پاس ایک فہرست تھی جس میں درج تھا کہ کون سی کتاب کس الماری کے کس شیلف پر کون سے نمبر پر لگی ہوئی ہے۔

اس کتب خانے کے دروازے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے علاوہ ادب کے سنجیدہ طالب علموں اور محققوں پر بھی کھلے تھے اور جو کتاب کہیں نہ ملتی وہ خواجہ صاحب کے ہاں دستیاب ہو جاتی۔

خواجہ صاحب کے پاس علمی اور تحقیقی کتابیں پاکستان اور بھارت کے کونے کونے سے کھنچ کر خود بہ خود پہنچ جاتی تھیں بلکہ اردو کی کوئی کتاب یا اردو سے متعلق کوئی اہم کتاب کسی اور ملک سے بھی چھپتی تو خواجہ صاحب کے پاس چند ہفتوں کے اندر اندر پہنچ جاتی اور ہم جیسے تشنہ لب ان کتابوں کے دیدار اور بعض صورتوں میں ورق گردانی اور بعض صورتوں میں باقاعدہ مطالعے سے سیراب اور سرشار ہو جاتے۔

خواجہ صاحب تحقیق کے آدمی تھے۔ محقق کے وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات ہفتوں کی نظر سوزی کے بعد بھی قابل اعتنا مواد ہاتھ نہیں آتا۔ خواجہ صاحب اپنے وقت کو تحقیق کے لیے مختص رکھتے تھے اور اس کے باوجود جب اہل قلم اور اہل علم ان کے در پر دستک دیتے تو خواجہ صاحب بڑی خندہ پیشانی سے انہیں لیتے۔ چھٹی کے روز تو ایک تانتا بندھا رہتا اور بابائے اردو کا پرانا خدمت گار جسے سب صوفی کے نام سے جانتے ہیں اور جواب خواجہ صاحب کا ہو کے رہ گیا تھا، مہمانوں کے لیے چائے بنا بنا کر تھک جاتا لیکن مہمان خواجہ صاحب کی بذلہ سنجی اور ساتھ ہی ساتھ عالمانہ گفتگو سے سیر نہ ہوتے، نہ ہی خواجہ صاحب کی پیشانی پر بل آتا۔

بسا اوقات بیرون شہر اور بیرون ملک سے بھی اہل قلم آتے۔ کراچی میں رہنے والا شاید ہی کوئی اہل علم اور اہل قلم خواجہ صاحب کے در تک نہ پہنچا ہو۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ بیرون کراچی سے اردو کا کوئی ادیب، شاعر، عالم آئے اور خواجہ صاحب کے در پر حاضری نہ دے۔ کتنے ہی بڑے بڑے لکھنے والوں اور اہل علم کو اس عاجز نے خود وہاں دیکھا ہے۔

خواجہ صاحب کے ہاں فون کرنے پر اکثر وہ خود ہی فون اٹھاتے اور کہتے "فرمائیے"..... نہ پوچھیے، اس "فرمائیے" میں کتنی نفاست، کتنا وقار، کتنا رکھ رکھاؤ، کتنی اپنائیت اور کتنی اجنبیت بیک وقت موجود ہوتی تھی۔ مخاطب کی آواز سنتے ہی اسے پہچان کر کہتے "آ ہا، فلاں فلاں صاحب ہیں۔" "بھئی کیسے مزاج ہیں؟" راقم کے ساتھ ان کا برتاؤ بڑا مشفقانہ تھا۔ وہ واقعی بڑے مشفق تھے اور اپنی علمی مصروفیت کے باوجود بڑی دیر تک اور بڑی محبت سے گفتگو کرتے اور میرے طالب علمانہ استفسارات کا جواب دیتے۔

ان کے علم کی وسعت اور حافظے پر تعجب ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے فون کر کے پوچھا کہ مشاعرے کی تاریخ اور اس کی روایت کے بارے میں کوئی مضمون کہاں ملے گا۔ بلا توقف کہا کہ اس وقت بتاتا چلوں کہ سہ ماہی "اردو" کے فلاں شمارے میں عبد السلام ندوی کا ایک مضمون ہے جو فلاں فلاں امور پر بحث میں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی ماخذ بتا دیے۔

تازہ ترین کتابوں کے بارے میں ان کی معلومات پر حیرت ہوتی تھی بلکہ اکثر کا مطالعہ [illegible]
ہوتے تھے۔ خاص طور پر سوانح عمریوں سے انہیں خصوصی لگاؤ تھا۔ جیسے ہی کوئی نئی سوانح عمری [illegible]
اسے حاصل کرتے اور اس کا مطالعہ کر کے اس کی خاص خاص باتیں بھی سمجھا دیتے۔ خود نوشت [illegible]
آپ بیتی سے بہت دلچسپی تھی۔

ایک انٹرویو میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو سوانح عمریوں سے اتنا لگاؤ کیوں ہے۔ [illegible]
انہوں نے کیسا پیارا جواب دیا "اچھی آپ بیتی آپ کو بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی [illegible]
برٹرینڈ رسل کی آٹو بائیو گرافی پڑھیں تو آپ فلسفے کے بہت سے بنیادی مسائل سے بھی آگاہ [illegible]
ہیں۔ ڈیگال کی آٹو بائیو گرافی پڑھیں تو عالمی مسائل پر آپ کی نظر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آپ [illegible]
"اعمال نامہ" پڑھیں (جو سر رضا علی کی آپ بیتی ہے) تو ہندوستان کی معاشرتی تصویر آپ کے [illegible]
جاتی ہے۔ آپ بیتیاں بہت سے علوم کے فرداً فرداً مطالعے سے بچا دیتی ہیں اور اتنی مصروف زندگی [illegible]
آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے شوق کی ہر چیز پر نظر رکھ سکے۔ میرے لیے آپ بیتیاں [illegible]
قربت کا وسیلہ ہیں"۔

وہ شہرت سے بہت گریزاں تھے۔ خبروں میں اور تصویروں میں آنے سے بچتے تھے۔ [illegible]
نہیں دیتے تھے۔ مذکورہ بالا انٹرویو "دید شنید" کے 1990ء کے ایک شمارے میں چھپا تھا۔ [illegible]
طویل انٹرویو رفیق ڈوگر صاحب نے خواجہ صاحب سے کس طرح لے لیا۔

غالب لائبریری اور ادارہ یادگار غالب ان کے وہ کام ہیں جو نہ صرف ان کی ہمیشہ یاد دلاتے رہیں
گے بلکہ ان کی ادب دوستی اور ادیب نوازی کے ثبوت کے طور پر بھی باقی رہیں گے۔ ادارہ یادگار غالب
نے گزشتہ چند برسوں میں انہوں نے پچاس کے قریب علمی کتابیں شائع کی تھیں اور غالب لائبریری کے
لیے انہوں نے اضافی جگہ حاصل کر کے اس کی تزئین و آرائش کروا دی تھی اور اس کا افتتاح بھی [illegible]
بلکہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریب تھی۔ تقریبات سے گریزاں خواجہ ادیب نوازی کی زندگی کی [illegible]
تقریب بھی ادب ہی کے لیے تھی۔

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے (آمین)

(بحوالہ: "فرائیڈے اسپیشل" ۱۸ مارچ ۲۰۰۵ء)

[illegible] عباسی

اردو زبان و ادب کی آبرو

اردو زبان کے یگانہ روزگار محقق و نقاد حضرت مشفق خواجہ بھی 21 فروری 2005ء کو مسافران
[illegible] میں شامل ہو گئے۔ وہ 19 دسمبر 1935ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے اور وفات کے وقت ان کی
[illegible] سال تھی۔ خواجہ صاحب کا اصل نام عبدالحئی تھا۔ مشفق خواجہ ان کا قلمی نام تھا، لیکن ابتدا میں یہ نام بھی
[illegible] اجنبی تھا۔ البتہ ان کا ایک اور قلمی یا کالمی نام "خامہ بگوش" سے اسی وقت سے واقفیت تھی جب
[illegible] روزے میں "سخن در سخن" کے عنوان سے وہ مزاحیہ ادبی کالم لکھا کرتے تھے۔ یہ کالم اپنے زمانے
[illegible] مقبول ترین کالم تھا اور اردو دنیا کے کئی اخبارات و رسائل میں شائع ہوا کرتا تھا جس پرچے میں
[illegible] شائع ہوتا، اس پرچے کی اشاعت دو تین گنا بڑھ جاتی ہماری طرح کئی قارئین اسی کالم کو دیکھ کر
[illegible] تے تھے، اس میں وہ کسی بڑے ادیب یا اس کی کتاب و تحریر کو لے کر اس پر تبصرہ کرتے اور
[illegible] کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس میں چھپی ہوئی زبان و بیان کی خامیوں کو یوں اجاگر کرتے کہ
[illegible] انہیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا تھا ان کا یہ کالم، پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر صرف
[illegible] نہیں بکھیرتا، بلکہ انہیں کئی کتابوں کے تعارف کے ساتھ مذاق تحقیق سے بھی آشنائی بخشتا۔
[illegible] کالموں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اور اب تک ان کے تین مجموعے "خامہ بگوش کے قلم
[illegible]"، "سخن در سخن" اور "سخن ہائے ناگفتنی" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔

[illegible] سے تقریباً چار پانچ سال پہلے ڈاکٹر تحسین مجود صاحب سے ملاقات ہوئی، میری کتاب "متاع
[illegible]" [illegible] کر کے وہ مجھ سے ملنے آئے وہ ہوتے تو [illegible] میں ہیں لیکن انہیں اللہ جل شانہ نے جو ذوق مطالعہ
[illegible] ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے انہیں کتاب اور مطالعے سے جنون کی حد تک عشق ہے اور
[illegible] وسیع اور متنوع حلقہ رکھتے ہیں۔ ان سے ملاقاتیں بڑھیں تو مشفق خواجہ صاحب کا ذکر آیا اور
[illegible] کر مجھے خواجہ صاحب کی مجلس میں لے گئے، معلوم ہوا کہ مجود صاحب اور خواجہ صاحب کے
[illegible] کے ساتھ گھریلو مراسم بھی ہیں، جبکہ مجود صاحب ان کے والد خواجہ عبدالوحید صاحب سے
[illegible] رکھتے تھے۔ انہوں نے تعارف کروا دیا اور یوں مجھے مشفق خواجہ کی مجلسوں میں کبھی کبھار جانے
[illegible] استفادہ کا موقع ملا۔

[illegible] صاحب کی یہ مجلس صرف اتوار کے دن۔ دن تقریباً دس بجے سے ڈھائی تین بجے تک جاری رہتی
[illegible] ادیب، کالم نگار، پروفیسر، اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والے بہت اسی طرح کے لوگ آتے،

خواجہ صاحب اس مجلس کے گل سر سبد ہوتے، چائے کا دور چلتا، لوگ آتے اور جاتے رہتے، وہ [illegible]
دار انسان تھے، رکھ رکھاؤ اور قدر و منزلت کا بڑا خیال رکھتے، یہ بڑی علمی اور مفید مجلس ہوتی تھی [illegible]
"کتاب" ہی مجلس کا موضوع ہوتی، سیاسی اور عالمی حالات پر بھی تبصرہ ہوتا، ادیبوں اور ادبی [illegible]
تذکرہ بھی چلتا، ان کے پاس دنیا بھر سے روزانہ دسیوں کتابیں آتیں، ان کی خوبیوں اور خامیوں کا
بیان ہوتا، خواجہ صاحب ادبی تقریبات اور نمود و نمائش سے دور رہنے والے آدمی تھے۔ خود ان کا شعر [illegible]

کمال بے ہنری بھی ہنر سے کم تو نہیں
مرا شمار کہیں ہو مجھے یہ غم تو نہیں

لیکن ہندو پاک کے ادبی حلقوں پر ان کی پوری نگاہ رہتی تھی اور گوشہ مطالعہ میں رہ کر بھی وہ ان [illegible]
اندر کی باتوں تک کا علم رکھتے تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، کس موضوع پر، کون سے مصنف [illegible]
ہے اور کیسا لکھا ہے، یہ سب انہیں محفوظ ہوتا، ان کی لطیف حس مزاح وقتاً فوقتاً مجلس کو کشت [illegible]
بنائے رکھتی، وہ جتنی خوب صورت اردو لکھتے تھے، اتنی ہی خوب صورت اور شگفتہ اردو بولتے بھی تھے۔

خواجہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تحقیقی ذوق عطا فرمایا تھا اور اکثر زندگی انہوں نے کتاب [illegible]
آغوش میں گزاری، انہوں نے "جائزہ مخطوطات اردو" کے نام سے ساڑھے بارہ سو صفحات پر [illegible]
کتاب لکھی جس میں اردو زبان کے مخطوطات اور ان کے مولفین کا بڑی دقت رسائی کے ساتھ تعارف [illegible]
گیا ہے، کون سا مخطوطہ کس لائبریری میں کیسی حالت میں ہے۔ اسے سوچ کر ہی دانتوں کو پسینہ آ [illegible]
ان کی یہ کتاب مرکزی اردو بورڈ نے 1979ء میں شائع کی ہے۔ سعادت علی خان ناصر نے اردو
کے شعراء کا تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" کے نام سے لکھا ہے، اس پر بھی انہوں نے ترتیب و تحقیق کا [illegible]
کیا اور 1970ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے دو ضخیم جلدوں میں چھاپا، غالب کے [illegible]
زبان و ادب میں بڑی انفرادیت رکھتے ہیں، غالب کے مکتوب الیہ صفیر بلگرامی بھی تھے" غالب اور [illegible]
بلگرامی" کے نام سے انہوں نے کتاب لکھی جس میں صفیر بلگرامی اور متعلقہ موضوع کا تحقیقی تعارف [illegible]
یہ کتاب 1981ء میں چھپی ہے۔ 1980ء میں انہوں نے "تخلیقی ادب" کے عنوان سے ایک
سلسلہ شروع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ 1985ء تک پانچ پرچے نکالنے کے بعد انہوں نے اسے [illegible]
اس سلسلہ کا کوئی بھی پرچہ پانچ سو صفحات سے کم نہیں، بلکہ تیسرا پرچہ آٹھ سو چالیس صفحات کا ہے [illegible]
اس کے بند کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے" چونکہ اس سے حلقہ احباب بہت وسیع ہو رہا تھا جس [illegible]
پر دوسرے کاموں کا حرج ہو رہا تھا، اس لیے اسے بند کر دیا۔"

2003ء میں یاس یگانہ چنگیزی کی کلیات پر ان کا تحقیقی کام اکادمی بازیافت کراچی سے [illegible]
ہے، یہ کتاب نو سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور خواجہ صاحب نے تقریباً عمر عزیز کے پندرہ سال اس [illegible]
صرف کیے، اسے اردو زبان و ادب میں تحقیق کی آبرو کہنا بے جا نہ ہوگا، تدوین متن اور تحقیق و [illegible]

[illegible] مثال ہے اور اس میدان میں ان کے ساتھ ہندوستان کے رشید حسن خان کو چھوڑ کر کسی اور کا
[illegible] جا سکتا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر جو تحقیقی مقالات لکھے ہیں، ان کا مجموعہ "تحقیق نامہ"
[illegible] انہوں نے 1991ء میں شائع کیا، وہ شاعر بھی تھے اور ان کا مختصر مجموعہ کلام "ابیات" کے نام
[illegible] ہوا ہے۔

"مشفق خواجہ صاحب دل، دین دار اور مشرقی تہذیب کے علمبردار تھے، وہ نوے فیصد ادیبوں کے
[illegible] دینی مدارس اور دین داروں سے محبت کرنے والے شخص تھے، ان کے والد خواجہ عبدالوحید مرحوم
[illegible] حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ کے مرید خاص تھے اور ان کے انگریزی رسالے
[illegible]" کے ایڈیٹر بھی تھے، بچپن میں ان کے گھر علماء اور صلحاء کا آنا جانا رہتا، ایسے گھرانوں میں تربیت
[illegible] پر بہرحال دین و ایمان کا اثر ہوتا ہے اور خواجہ صاحب میں یہ اثر بہت نمایاں طور پر محسوس کیا جا
[illegible] کے والد مرحوم نے 1928ء سے 1938ء تک دس سالوں کی ڈائری لکھی تھی، خواجہ صاحب
[illegible] اس پر کام کر رہے تھے۔ اس ڈائری میں کئی علماء اور ممتاز شخصیات کا بھی تذکرہ ہے، وہ اس ڈائری
[illegible] تحقیقی حواشی میں ان علماء کا تعارف بھی لکھ رہے تھے اور کوئی ڈیڑھ سو کے قریب اہل علم پر وہ لکھ چکے
[illegible] سلسلہ میں وہ رجال کی اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کو بھی جمع کر رہے تھے اور ضرورت محسوس کر
[illegible] کہ سرحد اور خاص کر ہزارہ کے علماء کی سوانح و تعارف پر کام کیا جائے، مجھ سے ایک بار کہنے لگے
[illegible] آپ کے پاس افراد ہیں، اس لیے یہ کام شروع کر دیں، مجھ سے جو تعاون ہو سکے گا میں وہ کروں گا"
[illegible] ان کے آخری ماہ و ایام ان ہی گم گشتہ علماء و اولیاء کے تذکرے پڑھنے اور لکھنے میں گزرے جسے
[illegible] کاموں کا حسن خاتمہ کہا جا سکتا ہے، وہ آخر میں زیادہ تر وقت اسی کام کو دے رہے تھے، گزشتہ
[illegible] اب دل کا دورہ پڑنے کے بعد وہ صحت یاب ہوئے تو پوچھنے پر بتلانے لگے کہ آج کل میں کرسی پر
[illegible] گھنٹے کام کر رہا ہوں، شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ:

نسیم جاگو کمر کو باندھو
اٹھاؤ بستر کہ وقت کم ہے

[illegible] زمانہ صحت میں ان کا معمول اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے بیٹھ کر کام کرنے کا تھا۔ میرے ساتھ وہ معمول
[illegible] شفقت فرمایا کرتے تھے، اجازت کے وقت اکثر وہ مجلس سے اٹھ جاتے اور دروازے تک
[illegible] آتے، روزنامہ اسلام میں چھپنے والے کالموں کا مجموعہ میں نے ان کی خدمت میں پیش کیا
[illegible] تاثرات لکھنے کی درخواست کی، ابھی انہوں نے لکھا نہیں تھا کہ ان پر دل کا حملہ ہوا، تین چار ماہ
[illegible] میں تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو چلنے پھرنے سے ڈاکٹروں نے منع کیا تھا لیکن اس عالم میں
[illegible] بیانیاں، پھلجھڑیاں اور طنز و مزاح کی لطافتیں بکھر رہی تھیں، کہنے لگے" میں نے کالم پڑھ لیے
[illegible] تاخیر کا احساس ہے اور ان شاء اللہ میں اس کی تلافی کروں گا" اور واقعتاً انہوں نے صحت یاب

ہونے کے بعد دل کھول کر اپنے تاثرات لکھے، حالاں کہ کسی کتاب پر رائے دینے میں ان کا احتیاط مشہور تھا۔ الحمد للہ کالموں کا یہ مجموعہ بھی بہت مقبول ہوا اور گزشتہ سات آٹھ ماہ میں اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

مشفق خواجہ صاحب کو سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے طارق روڈ والے قبرستان میں دفنایا جا رہا تھا تو ان کے بڑے بھائی خواجہ عبدالقدیر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور کہے جا رہے تھے "میرے بھائی نے جانے میں بڑی جلدی کی" اور میرے دل و دماغ کو صدائے شیراز نے گھیر اتھا کہ:

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

آخر میں خواجہ صاحب کی ایک غزل کے چند اشعار:

وہ جو تجھ کو موجود سے ہٹ کر دیکھیں
نئی صبحیں نئی شامیں نئے منظر دیکھیں
گھر کی دیواروں پہ تنہائی نے لکھے ہیں جو غم
میرے غم خوارا انھیں بھی کبھی پڑھ کر دیکھیں
آپ ہی آپ یہ سوچے کوئی آیا ہو گا
اور پھر آپ ہی دروازہ پہ جا کر دیکھیں
کچھ عجب رنگ سے کٹتے ہیں شب و روز اپنے
لوگ کیا کچھ نہیں کہیں ہم کو جو آ کر دیکھیں

(بحوالہ: "فرائیڈے اسپیشل" ۱۸ مارچ ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر انور سدید

بحر تحقیق کا شناور...... مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو ادب کی ایک جامع الحیثیات شخصیت تھے۔ وہ نقاد تھے۔ شاعر تھے۔ کالم نویس تھے۔ طنز و مزاح نگار تھے۔ ادبی رسائل کے مدیر تھے۔ سیاسی تجزیہ نگار تھے۔ ادب کے اعلیٰ اصناف شناس ہونے کے علاوہ ملک کے متعدد ادبی اداروں کے مشیر اور ادیبوں کے تحقیقی و تنقیدی کام میں ان کے معاون تھے۔ لیکن ان کا فطری رجحان تحقیق کی طرف تھا۔ یہ "صورت گر کچھ خوابوں کے" کے مولف طاہر مسعود صاحب کو انھوں نے ایک انٹرویو میں بتایا:

"میرے والد خواجہ عبدالوحید مرحوم مختلف نوعیت کے علمی و ادبی کام انجام دیتے رہتے تھے۔ انھیں دیکھ کر میں تحقیق کی طرف مائل ہوا۔ بعد میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو پرانی چیزوں میں میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانے رسائل پڑھتا تھا۔ اب بھی یہی کیفیت ہے۔ اگر میرے سامنے ایک پرانا اور ایک نیا علمی و ادبی رسالہ پڑا ہو تو میں پرانے رسالے کو پہلے پڑھتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مجھے نئی چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے یا کم ہے بلکہ بات یہ ہے کہ پرانے رسائل کو پڑھتے ہوئے میں خود کو اسی عہد میں سانس لیتا ہوا پاتا ہوں۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ان کا تعارف طالب علمی کے زمانے میں اس وقت ہوا جب وہ قلمی کتابوں کے مطالعے کے لیے "انجمن ترقی اردو" کے کتب خانے میں جایا کرتے تھے۔ ایک دن مولوی صاحب نے اس لڑکے کو جس کا خاندانی نام عبدالحی تھا، دیکھا تو دریافت کیا:

"تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آتے ہو؟"

انھوں نے بتایا "میں طالب علم ہوں اور مجھے قلمی کتابوں سے دلچسپی ہے۔"

بابائے اردو بہت خوش ہوئے اور جب ان کے ارشاد پر کسی قلمی نسخے کے چند اقتباسات درست نقل کر دیے تو بولے:

"حیرت ہے تم نے اس دکنی زبان کے مسودے کو بالکل ٹھیک ٹھیک پڑھ لیا ہے۔"

مشفق خواجہ نے جواب دیا "میں پنجابی ہوں۔ اس وجہ سے اسے پڑھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ پنجابی اور دکنی زبان میں بڑی مشابہت ہے۔ اس لیے پنجابی جاننے والوں کے لیے دکنی زبان پڑھنا اور لکھنا بہت آسان ہے۔"

اس کے بعد مولوی عبدالحق انھیں نہ صرف مختلف کام دینے لگے بلکہ جب مراسم گہرے ہو گئے اور وہ

جامعہ کراچی سے فارغ التحصیل ہو گئے تو مولوی صاحب نے ان کا تقرر انجمن ترقی اردو میں کر دیا جہاں انھوں نے اپنی نوجوانی کے ساڑھے چار سال ان کے سایۂ عاطفت میں گزارے اور تحقیق کے اس شوق کو پروان چڑھایا جو انہیں اپنے والد مرحوم سے ورثے میں ملا تھا۔ انجمن ترقی اردو میں انھوں نے ماہ نامہ "قومی زبان" اور سہ ماہی "اردو" کی ادارت کی جو بنیادی طور پر تحقیق ادب کے رسائل تھے۔ مولوی صاحب نے انہیں "قاموس الکتب" کا مدیر مقرر کرنے کے علاوہ ان سے "لغت کبیر" کی تدوین میں بھی مدد لی۔ خواجہ صاحب راوی ہیں کہ:

"ان (مولوی صاحب) کے پاس لغت کا مسودہ ہوتا اور میرے پاس پرچیاں جن پر اسناد لکھی ہوتی تھیں" میں سند پڑھتا اور مولوی صاحب متعلقہ جگہ اسے درج کر دیتے تھے۔ یہ کام بعض اوقات تین چار گھنٹے تک جاری رہتا تھا۔"

تحقیق کا کام چونکہ بنیادی طور پر حقیقت کی دید و دریافت کا کام ہے اس لیے اس میں دستاویزی شہادت اور سندی ثبوت بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے "لغت کبیر" کے سلسلے میں ان سے جو ریاض کرایا تھا، اس کے ثمرات مشفق خواجہ نے بعد میں اپنے تحقیقی کارناموں کی صورت میں سمیٹے۔ تاہم اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ خواجہ صاحب نے اس دور میں جن بزرگ ادیبوں کی مجالس سے فیض اٹھایا ان میں سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور شان الحق حقی کے نام اہم ہیں جن کے قاموسی مزاج میں تحقیق و جستجو کے عناصر بے پایاں تھے۔ انجمن ترقی اردو کے ساتھ وابستگی مولوی عبدالحق کی سرپرستی اور موخر الذکر محققین سے تعلق خاطر سے مشفق خواجہ نے بہ طور محقق اپنی جو مزاج سازی کی وہ اس شعر کے مصداق تھی۔

سودا نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرے میں ہے آفتاب کا

تاہم میرا خیال ہے کہ مشفق خواجہ نے اردو کے قدیم سرمائے کی تحقیق جس خضوع و خشوع کے ساتھ کی ہے، وہ ذرے میں آفتاب کا جلوہ دیکھنے کا عمل ہی نہیں ہے بلکہ گم شدہ خورشید کو بازیافت کرنے کی کوشش بھی ہے۔

مشفق خواجہ کا پہلا تحقیقی کارنامہ "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا" ہے جسے 1848ء میں سعادت خان ناصر نے مرتب کیا تھا۔ اس تذکرے کی تحقیقی ترتیب و تدوین اور تقابلی تصحیح پر انھوں نے مولوی عبدالحق کے مشورے سے کام کیا تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تالیف "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" کے مطابق اب تک اس تذکرے کے چار مخطوطوں کا سراغ لگا ہے جن میں سے ایک خدا بخش لائبریری پٹنہ میں، دوسرا مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں، تیسرا لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں اور چوتھا نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مشفق خواجہ نے تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے مقدمے میں

ان چاروں مخطوطوں کی تفصیلات کے علاوہ متون اور شعراء کی تعداد کا فرق بھی واضح کر دیا ہے۔ ان چاروں نسخوں کی روشنی میں اس تذکرے میں شعراء کی تعداد کا تعین 824 کیا گیا ہے اور یہ مشفق خواجہ کی تحقیقی ژرف نگاہی کا نتیجہ ہے۔ اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ گلشن ہند مولفہ مرزا علی لطف، گلدستہ حیدری مولفہ حیدری، انتخاب دواوین مولفہ امام بخش صہبائی اور گلدستہ نازنیناں مولفہ کریم الدین کے بعد یہ تذکرہ پانچواں تھا جو فارسی زبان کے برعکس اردو میں لکھا گیا اور اس میں زیر تذکرہ پانچواں تھا جو فارسی زبان کے برعکس اردو میں لکھا گیا اور اس میں زیر تذکرہ شاعر کے علاوہ اس کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا ذکر بھی کیا گیا۔ شعراء کے حالات زندگی کی تفصیل اور ادبی معرکہ آرائیوں کے علاوہ ادبی، سماجی اور معاشرتی فضا اور لطائف و حکایات کا تذکرہ بھی درج ہے جن سے بعد کے تذکرہ نگاروں بالخصوص محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں استفادہ کیا۔ مشفق خواجہ کے بقول:

ناصر نے تذکرے کا نام "خوش معرکہ" محض اس بنا پر لکھا تھا کہ اس میں شعراء کی معرکہ آرائیوں کی تفصیلات درج ہیں۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ اس مصرع سے نکالی۔

"تاریخ یہی پائی خوش معرکہ زیبا"

چنانچہ اس کا نام ہی "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" رکھ دیا گیا۔ اس تذکرے میں میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا سے لے کر مولف سعادت خان ناصر تک قریباً ایک صدی کے شعراء کا تذکرہ موجود ہے۔ جس کی تحقیق شدہ دو جلدیں مجلس ترقی ادب لاہور سے 1970ء اور 1971ء میں پروفیسر حمید احمد خان کے دور میں شائع ہو چکی ہیں۔ تیسری جلد جو تعلیقات پر مشتمل ہے، تا حال شائع نہیں ہوئی اور مشفق خواجہ کی وفات کے بعد شاید ہی منظر عام پر آئے۔ اس تذکرے پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے رائے دی ہے:

"مشفق خواجہ اس وقت نسبتاً نومشق اور نوعمر تھے۔ لیکن انھوں نے ذہن کی جس پختگی اور تلاش و توازن کی جس مزاولت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، اس کا اندازہ اس تذکرے کے طویل مقدمہ اور اس کے ساتھ شامل تحقیق نامے سے ہوتا ہے۔ تعلیقات اور مختلف مسائل اور مباحث پر علمی گفت گو کے لیے "تحقیق نامے" کی یہ اصطلاح بھی مشفق خواجہ ہی کی ایک دین ہے۔"

مشفق خواجہ کا تحقیقی نوعیت کا دوسرا بڑا کام "جائزہ مخطوطات اردو" ہے جو 1248 صفحات پر مشتمل ہے اور یہ صرف پہلی جلد ہے جو 1979ء میں مرکزی اردو بورڈ (حالیہ اردو سائنس بورڈ) لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ جائزہ مخطوطات اردو کا منصوبہ مشفق خواجہ کے ذہن میں ان کے تحقیقی کام کے دوران پیش آنے والی مشکلات سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کے بارے میں انھوں نے طاہر مسعود صاحب کو انٹرویو میں بتایا:

"جب میں نے تحقیقی کام شروع کیا تو مجھے اس میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ مثلاً میں نے کسی شاعر کے حالات جاننا چاہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ اس کے بارے میں اب

تک کیا کچھ لکھا گیا ہے تو مجھے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کسی شاعر کے قلمی نسخے کہاں کہاں دستیاب ہوں گے تو اس سلسلے میں راہ نمائی کے لیے کوئی بھی کتاب موجود نہیں تھی۔ لہٰذا یہ سوچ کر کہ تحقیق کرنے میں جو دقتیں مجھے پیش آ رہی ہیں، وہ دقتیں یقیناً دوسروں کو بھی درپیش ہوں گی۔ میں نے جائزہ مخطوطات اردو پر کام شروع کر دیا۔"

"اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ فرض کیجیے آپ ناسخ پر کام کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب آپ کو بتائے گی کہ دنیا بھر میں ناسخ کے دیوان کے کتنے قلمی نسخے ہیں اور ان کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔ کس دیوان کے کتنے ایڈیشن چھپے ہیں۔ غرضیکہ ناسخ کے بارے میں قدیم تذکروں سے لے کر آج تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ان سب کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں مل جائے گی۔ اس طرح میری یہ کتاب محققوں کے لیے تحقیق کی راہ میں بہت سی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرے گی۔"

جائزہ مخطوطات کی اس پہلی جلد میں دو سو مخطوطات پر ضروری، کارآمد اور مفید معلومات ہی نہیں دی گئیں بلکہ متعدد کتابوں اور ان کے مصنفین کے بارے میں تحقیقی مسائل بھی چھیڑے گئے ہیں اور مشفق خواجہ نے خود اپنے نتائج اخذ کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ مزید برآں مخطوطات کے مصنفین کے سوانح اور ان پر لکھی گئی کتابوں کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ مشفق خواجہ کا یہ منصوبہ دس جلدوں پر مشتمل تھا۔ وہ اس پر اپنے دوسرے ادبی کاموں کے ساتھ ساتھ مسلسل کام کر رہے تھے اور دوستوں کو اس کی تفصیلات سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن اب ان کی اشاعت معرض خطر میں پڑ گئی ہے۔ مشفق خواجہ کی وفات سے اپنی نوعیت کا یہ پہلا اور اعلیٰ ترین کام بھی ادھورا رہ گیا ہے۔ جائزہ مخطوطات اردو کی پہلی جلد پر ممتاز محقق رشید حسن نے لکھا تھا:

"بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے تن تنہا وہ کام کر دکھایا ہے جو بہ ظاہر ایک ادارے کا کام معلوم ہوتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں دل لگا کر اور نظر جما کر کرنے کا جذبہ اور حوصلہ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اب تک جو کام کیے ہیں وہ ان کی قابل رشک صلاحیت کے شاہد عادل ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو گروہ بندی سے، ادبی وغیر ادبی، جوڑ توڑ اور خفیف الحرکاتی سے دور رکھا ہے۔ وہ حصول دنیا کے سلسلے میں ابھی تک ہوس کے اسیر نہیں ہو پائے ہیں اور علم و ادب کی عظمت اور تحقیق کی صبر آزمائی کے قائل ہیں۔"

دل لگا کر اور نظر جما کر کام کی ایک اور مثال مشفق خواجہ کی کتاب "غالب اور صفیر بلگرامی" ہے۔ صفیر بلگرامی شاگردان غالب میں اس لیے نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ غالب سے 1864ء میں تعلق

ہونے اور صرف دو اڑھائی ماہ کی صحبت غالب سے استفادہ کرنے کے باوجود ان کا معنوی سلسلہ اب تک زیر بحث رہتا ہے۔ ان کے نام غالب کے دو خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کو "تذکرہ جلوۂ خضر" کے متعدد مبالغہ آمیز اور غلط بیانات نے داغ دار کر رکھا ہے۔ مشفق خواجہ نے ان کے پوتے سید نور احمد گرامی کے صاحب زادے سید وصی احمد بلگرامی سے وہ کاغذات، مسودات اور خطوط حاصل کیے جو انھیں وراثت میں ملے تھے۔ وصی بلگرامی کے ذخیرۂ کتب کو بالاستیعاب دیکھا اور پھر یہ کتاب تحقیقی ژرف نگہی سے تالیف کی، جس سے غالب اور صفیر بلگرامی کے تعلقات کی پوری تفصیل سامنے آ جاتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف صفیر بلگرامی کی زندگی کا مرقع ہے بلکہ بقول مالک رام "غالب اور صفیر بلگرامی کے ذریعے سے کئی چیزیں پہلی مرتبہ منظر عام پر آ گئی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ ماخذ میں سے کوئی ایسی تحریر جس سے ان دونوں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہو، اب غیر مطبوعہ نہیں رہ گئی۔"

یہ کتاب 1981ء میں شائع ہوئی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی کے عرصے میں کسی محقق نے اس کی معلومات میں نیا اضافہ نہیں کیا ہے اور نہ اس کی کسی بات کی تردید کی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی مشفق خواجہ کی تحقیق نگاری کی منفرد مثال ہے۔

مشفق خواجہ کی تحقیقی بازیافت کا ایک اور ثمر "اقبال" از احمد دین ہے۔ یہ کتاب مولوی احمد دین نے علامہ اقبال کی زندگی میں 1923ء میں لاہور میں چھاپی تھی لیکن اشاعت سے پہلے ہی اقبال نے اس کاوش کو پسند نہ کیا۔ کتاب نہ شائع کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں اقبال کی بعض طویل نظمیں شامل تھیں جن میں اقبال نے ترمیم و تنسیخ کر دی تھی۔ انھی دنوں اقبال اپنا مجموعہ کلام "بانگ درا" مرتب کر رہے تھے۔ چنانچہ خدشہ پیدا ہوا کہ اگر مولوی احمد دین کی کتاب شائع ہو گئی تو اقبال کے مجموعہ کلام کی فروخت پر منفی اثر پڑے گا۔ مولوی احمد دین اقبال کے مداح تھے، انھیں اقبال کے تاثر کا پتہ چلا تو انھوں نے تمام نسخے نذر آتش کر دیے۔ تاہم تین سال کے بعد 1926ء میں کچھ ترامیم کے ساتھ دوسرا ایڈیشن شائع کر دیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے کہ "دوسرے ایڈیشن کا خاکہ تیار کرنے میں اقبال کے مشوروں یا کم از کم اعتراضات کو بہت ممکن ہے پیش نظر رکھا گیا ہو۔" حسن اتفاق دیکھیے کہ پہلے ایڈیشن کے دو نسخے بھی کسی طرح ضائع ہونے سے بچ گئے تھے۔ مشفق خواجہ نے ان دونوں ایڈیشنوں کو بازیافت کیا اور انھیں سامنے رکھ کر ایک نیا نسخہ تیار کیا جو 1979ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوا۔ انھوں نے ان تمام تبدیلیوں کی نشان دہی کی جو مولوی احمد دین نے دوسرے ایڈیشن میں کی تھیں۔ اردو ادب میں مولوی احمد دین کی شخصیت "سرگزشت الفاظ" کے مولف کی حیثیت میں بہت معروف ہے۔ اقبال کی زندگی میں ان پر تنقیدی کتاب لکھنے کا شرف بھی انھیں حاصل ہے۔ اس وقت تک اقبال پر چند چھوٹے چھوٹے مضامین اور مختصر سی ضخامت کی انگریزی کتاب "مشرق سے ایک آواز" (A Voice from the East) چھپ چکی تھی لیکن تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب مولوی احمد دین نے ہی لکھی جو اقبال کی شخصیت سے بھی شناسا

تھے۔ مشفق خواجہ کو اس کتاب کی بازیافت اور تدوین نو کا ہی اعزاز حاصل نہیں بلکہ منفرد بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے مولوی احمد دین کے مستند سوانح بھی مرتب کیے ہیں جو ان کی تحقیقی دیدہ وریزی کا ایک اور بے مثال نقش ہے۔

مشفق خواجہ کی ایک غیر مدون کتاب "پرانے شاعر نیا کلام" ہے جو رسالہ "غالب" کراچی میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ یہ تذکرہ ان شعراء کا ہے جو زمانے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں لیکن اپنے زمانے میں "تازہ گویان سر آمد روزگار" میں شمار ہوتے تھے، ان میں سے چند نام یہ ہیں:

فضل علی ممتاز، جسونت سنگھ پروانہ، ولی اللہ محب، خواجہ احسن الدین بیان، مرزا محمد رضا قزلباش خان امید۔ اردو کے ان کلاسیکی شعراء کا وجود اب تذکروں میں تو مل جاتا ہے لیکن ان کے کارناموں کو کسی محقق نے شمار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مشفق خواجہ نے اپنے مخصوص تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی اسلوب میں انھیں اسی طرح بازیافت کیا کہ بیسویں صدی میں ان کی نشاۃ ثانیہ برپا ہو گئی۔ پرانے شعراء کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا جو آج بھی پسند کیے جا سکیں۔

"تحقیق نامہ" مشفق خواجہ کے چھ مضامین پر مشتمل تحقیقی کتاب ہے۔ ان میں سے دو مضامین "سعادت خان ناصر اور اس کا تذکرہ خوش معرکہ زیبا" اور احمد دین (مصنف اقبال) ان کی مرتبہ کتابوں کے مقدمے ہیں جو ان کتابوں کے ساتھ بالترتیب 1970ء اور 1979ء میں شائع ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان مضامین میں نہ صرف یہ کہ اپنی بعض غلطیوں کی تصحیح کی بلکہ بعض نئے مآخذ کی روشنی میں مباحث کا اضافہ بھی کیا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ مشفق خواجہ اپنی تحقیق کو "حرف آخر" شمار نہیں کرتے تھے بلکہ نیا مواد سامنے آ جاتا تو نہ صرف اپنی رائے میں تبدیلی پیدا کرتے بلکہ نئے مباحث بھی ابھار دیتے۔ مرزا محمد رضا قزلباش خان امید، مرزا جعفر علی حسرت اور قدرت اللہ قدرت کو بھی انھوں نے مکمل حوالوں اور نئے مواد سے استفادہ کے بعد پیش کیا ہے۔ "تذکرہ گلشن مشتاق" پر مضمون 1974ء میں لکھا گیا تھا۔ اس وقت حسین قلی خان، عاشق عظیم آبادی کا تذکرہ "نشتر عشق" شائع نہیں ہوا تھا۔ "گلشن عشق" میں اس تذکرے سے استفادہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ خواجہ صاحب کو بھی اپنی رائے میں تبدیلی کی ضرورت لاحق ہو گئی جس کا ذکر انھوں نے اس کتاب کے دیباچہ میں کر دیا ہے۔ یہ تفصیلی مطالعے اور ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، یہ کتاب ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں چلنے والی "مغربی پاکستان اردو اکیڈمی" لاہور سے 1991ء میں شائع ہوئی اور اسے برصغیر کے ایک ممتاز محقق کے نام معنون کیا گیا ہے جس سے مشفق خواجہ کی بزرگ شناسی کا زاویہ سامنے آتا ہے اور ان کی عقیدت کا نقش قائم ہو جاتا ہے۔

انتساب یوں ہے:

"نہایت ادب کے ساتھ

محترم مالک رام صاحب

کی خدمت میں

جن کی تحریروں سے میں نے لکھنا سیکھا اور جن سے مل کر بہ قول حالی لفظ آدمیت کے معنی معلوم ہوئے۔"

مشفق خواجہ کی زندگی کی آخری تحقیقی کتاب مرزا یاس یگانہ چنگیزی پر ہے جو 1983ء میں اس وقت شائع ہوئی جب علالت کا ایک دور اسپتال میں گزار کر وہ بہ ظاہر صحت مند ہو کر گھر آ گئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا یگانہ دست برد زمانہ کی نذر ہو چکے تھے۔ ان کی خوش قسمتی سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انھیں اپنی وفات کے بہت عرصے کے بعد مشفق خواجہ جیسا قدر دان میسر آ گیا جنھوں نے یگانہ کو نہ صرف ایک مستقل موضوع کی حیثیت میں جزو حیات بنا لیا بلکہ یگانہ کی تحقیق میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں اور اپنی بصارت و بصیرت کے چراغوں سے وہ کرنیں جمع کیں جو آج یگانہ کی زندگی کو نہ صرف منور کر رہی ہیں بلکہ تحقیق کا ایک ایسا مثالی نقش بھی پیش کرتی ہیں جو اپنی نظیر آپ ہے۔ یگانہ پر اپنے تحقیقی کام کا آغاز مشفق خواجہ نے کئی برس پہلے اس وقت شروع کیا تھا جب انھوں نے اپنے رسالہ "تخلیقی ادب" میں یگانہ پر ایک گوشہ مختص کیا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب اپنی تحقیقی فطرت کے مطابق مواد کی تلاش میں سرگرم جستجو ہو گئے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اس کتاب کی تکمیل کے لیے مشفق خواجہ نے کتنی دیدہ ریزی کی اور اپنی زندگی کے متعدد ماہ و سال کے علاوہ اپنی صحت بھی اس کتاب کی نذر کر دی۔ اس کتاب کی خوبی صرف یہ نہیں کہ اس میں یگانہ کا تمام مطبوعہ غیر مطبوعہ، مدون اور غیر مدون کلام تحقیقی صحت کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے بلکہ ہر تخلیق کا زمان و مکان، اشاعت کا ماہ و سال اور کتاب یا جریدے کا نام بھی دیا گیا ہے۔ جس ادیب سے کتاب کا مواد حاصل کیا ہے اس کا نام اور پتہ بھی درج ہے۔ اہم بات یہ کہ متن کی تصحیح کے ساتھ یگانہ کی فرہنگ بھی پیش کر دی گئی ہے جو صرف یگانہ سے مخصوص ہے۔ اس طرح صدہا ایسے الفاظ اس کتاب میں از سر نو دریافت ہوئے ہیں جو قبر یگانہ میں مدفون تھے۔ مزید خوبی یہ ہے کہ یگانہ کی سب کتابوں کا پورا متن، خود نوشت حالات، دیباچے اور بعض غزلوں کے قلمی عکس اور سابقہ بعض ایڈیشنوں کے سرورق بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مشفق خواجہ کا معراج کمال اس کتاب کے حواشی سے ظاہر ہوتا ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ مجموعی طور پر ایسی کتاب ہے جو ایک نظر میں آپ کے دل و نگاہ کو مغلوب و مسحور کر لیتی ہے۔ بلاشبہ یہ کلیات یگانہ ہے لیکن اب یہ بجا طور پر "مشفق خواجہ" بھی معروف ہو گی اور آئندہ جو کام بھی یگانہ پر ہو گا اس کا بنیادی ماخذ یہ کتاب ہو گی۔ میرے دوست نثار احمد زین الدین نے درست لکھا ہے:

"مشفق خواجہ نے کلیات یگانہ کی ترتیب و تدوین کے اس مشکل ترین اور صبر آزما تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر اپنی بقا کا سامان فراہم کر دیا اور ہمیں یگانگی کی "معراج" دھند سے نکال کر "یگانہ آشنا" بنا دیا۔"

دکھ کی بات یہ ہے کہ مشفق خواجہ نے [illegible] جن سات مزید نایاب کتابوں کی اشاعت کا [illegible]
تھا وہ اب ان کی ناگہانی وفات کی وجہ سے شاید تا دیر منظر اشاعت پر نہ آسکیں کیوں کہ ۲۱ [illegible]
2005ء کو وہ آفتاب تحقیق غروب ہو گیا جس کے تحقیقی کارنامے لوح ادب پر ہمیشہ تابندہ رہیں گے [illegible]
ادب کی صفوں سے ایک بے مثل انسان اپنا رخت حیات سمیٹ کر راہی ملک عدم ہو گیا۔ افسوس [illegible]
وائے افسوس۔

(بحوالہ: "فرائیڈے اسپیشل" ۱۸ مارچ [illegible])

[illegible] محمود احمد برکاتی

ایک ادارے کا اختتام

[illegible] عبدالحی مشفق خواجہ بھی اپنی مہلت عمر پوری کر کے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ
[illegible] صاحب کی وفات ایک فرد کی وفات نہیں بلکہ ایک ادارے کا اختتام ہے کیونکہ وہ خاموشی
[illegible] کی خدمت میں مصروف تھے اور مشرقی تہذیب کے ایسے نمائندے تھے جن کی رخصتی سے
[illegible] ہو گیا ہے جس کے پر ہونے کی امید کم ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کا نعم البدل
[illegible] مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

مشفق خواجہ صاحب مرحوم سے مراسم سے پہلے مجھے ان کے والد ماجد خواجہ عبدالوحید صاحب مرحوم
[illegible] حاصل تھا۔ میرے دل میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ وہ خاصان اقبال میں سے تھے اور میں ہر
[illegible] حضرت اقبال سے اپنی شیفتگی کی بنا پر ان سے علامہ اقبال کی عادات ومشاغل وغیرہ کے سلسلے
[illegible] کر کے استفادہ کرتا تھا۔ اسی طرح ان کے عزیز کرنل خواجہ عبدالرشید مرحوم سے بھی قیام
[illegible] پہلے دہلی میں نیاز حاصل تھا۔ ندوۃ المصنفین اور اس کی مطبوعات مشترکہ دلچسپی کا باعث
[illegible] المصنفین میں ہی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ انہیں کتابوں اور خصوصاً مخطوطات جمع کرنے کا خاص
[illegible] اتحاد مذاق کی بنا پر ملاقاتیں ہوتی تھیں اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ کراچی میں
[illegible] اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر ہوتے تھے، بہت سے بے وسیلہ مریضوں کے سلسلے میں ان سے
[illegible] ہوتا تھا اور وہ خصوصی توجہ فرماتے تھے۔

مشفق خواجہ صاحب مرحوم کا نام پہلی بار اس وقت سنا جب انہوں نے ترقی اردو بورڈ کراچی کی
[illegible] پر ایک تفصیلی اور وزنی مضمون لکھا تھا۔ پھر ایک روزنامے میں کتابوں پر ان کے تبصرے
[illegible] اس طرح ان سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ پہلی ملاقات اپنے پیارے دوست جمیل اختر خاں کے
[illegible] ہوئی۔ ان کی خواجہ صاحب مرحوم سے نوک جھونک رہتی تھی۔ اس محفل میں زیادہ تر وہ دونوں ہی
[illegible] ہے اور میں ان دونوں کے مکالمے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر اس کے بعد کئی بار مسعود میاں
[illegible] برکاتی) کے یہاں دعوت طعام میں ملاقاتیں اور تفصیل سے باتیں ہوتی رہیں اور میں ان کے وسیع
[illegible] اردو پر ان کی نظر اور استحضار سے متاثر ہوا۔ ایک زمانے میں "جسارت" "بعد میں" "تکبیر"
[illegible] ان کے کالم شائع ہوتے تھے اور ان کے شوخ اور تیکھے جملوں سے لذت یاب ہوتا رہا۔
[illegible] کے یہاں زیادہ تر حاضری بیرون کراچی کے مہمانوں کے ساتھ ہوتی رہی۔ میں ڈاکٹر مظفر محمود

شیرانی، ڈاکٹر سفیر اختر اور ڈاکٹر نبی ہادی وغیرہ کو لے کر ان کے یہاں گیا ہوں، پھر وہ فرمانے لگے کہ اللہ کرے باہر سے مہمان آتے رہیں اور اس بہانے سے آپ تشریف لایا کریں۔

وہ نہایت ذکی و ذہین انسان تھے۔ حافظہ بھی قوی پایا تھا۔ ان کا ذوق مطالعہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ ان کا بیان تھا کہ جتنے رسائل نکلتے ہیں میرے پاس آتے ہیں۔ اعزازی طور پر نہیں آتے میں تو خریدتا ہوں۔ پاک و ہند کے ادبی حلقوں سے مراسم کی بنا پر کثرت سے ہدیتاً کتابیں آتی تھیں ورنہ خریدتے تھے اور ہر کتاب توجہ سے پڑھتے تھے۔ مطالعہ میں سماجی تعلقات اور معاشی مشاغل وغیرہ حائل ہوتے ہیں۔ وہ عرصے سے گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اپنے کتب خانے میں معتکف تھے۔ ان کا واحد مشغلہ پڑھنا اور لکھنا تھا۔ اردو ادب اور علمی کتب کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا تھا اور وہ سب بڑے نظم و سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ فرماتے تھے یہ سب تذکرے ہیں اور یہ سب دواوین ہیں..... وغیرہ وغیرہ۔

ان کی عجیب صفت، شہرت سے ان کا گریز تھا۔ نام آوری کا جذبہ ان میں تھا ہی نہیں۔ وہ زیادہ تر قلمی ناموں سے لکھتے تھے۔ ان کے کالموں کے مجموعوں تک پر ان کا نام نہیں ہے۔ قلمی نام "خامہ بگوش" ہے جو بہت نادر صفت ہے۔ بہت کم، بہت ہی کم انسان ایسے ملیں گے جو نام وری کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں نہ ہوں۔

اہل علم و قلم اور طالبان تحقیق کی اعانت کے لیے آتے اور وہ بڑی فراخ دلی سے ان سے اعانت و تعاون فرماتے۔ موضوع پر جتنا مسالہ ان کے پاس ہوتا وہ بے تکلف پیش کر دیتے۔ اس اعانت کا سلسلہ پاکستان سے بھارت تک دراز تھا۔

حسن خلق میں وہ اسلاف کا نمونہ تھے۔ مجھے راستہ بھول جانے کی عادت ہے، جہاں کئی بار جا چکا ہوں وہاں بھٹکے بغیر نہیں پہنچتا۔ ایک دفعہ مشہور دانشور اور محقق ڈاکٹر سفیر اختر کراچی تشریف لائے تھے اور خواجہ صاحب سے ملاقات کے خواہش مند تھے۔ میں نے ان کو اپنے ساتھ لے جانے کا ذمہ لیا۔ خواجہ صاحب سے وقت لے لیا۔ خواجہ صاحب کے مشغول اوقات کا علم تھا اور خود بھی میں وقت کا پابند ہوں، اس لیے مقررہ وقت پر پہنچنے کی نیت سے مہمان کو لے کر چلا اور حسب عادت "گم راہ" ہو گیا۔ دو گھنٹے ہو گئے۔ آخر ایک جگہ سے خواجہ صاحب کو فون کیا کہ میں دیر سے آپ کے جوار میں ہوں مگر پہنچ نہیں سکا اور اب ناکام واپس جا رہا ہوں۔ بے وقت آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتا مگر انہوں نے باصرار فرمایا کہ ضرور تشریف لائیں۔ میں سراپا انتظار ہوں اور گھر کی نشان دہی فرمائی۔

بالکل یہی "گم راہی" علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق صدر ڈاکٹر نبی ہادی کو ساتھ لے جانے میں پیش آئی اور بھٹکتے بھٹکتے رات کے دس بج گئے تو میں نے ہمت ہار دی اور فون پر معذرت چاہی۔ وہ بضد ہوئے کہ ضرور آئیں اور راہ نمائی فرمائی۔ ہم پہنچے اور خود خواجہ صاحب کے کہنے پر دیر تک نشست رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔

(بحوالہ: "فرائیڈے اسپیشل" ۱۸ مارچ ۲۰۰۵ء)

محبت حسین اعوان

میرے "مشفق" خواجہ صاحب

خواجہ صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا اور کہتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے، لیکن جو حقیقت ہے اس سے کوئی آنکھیں چرا نہیں سکتا کہ یہ سانحہ ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خواجہ صاحب میرے مشفق خواجہ صاحب ہم سے جدا ہو کر اس دارالفنا سے عالم بقا کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ ان کے ذکر کے ساتھ ہی ان کی معیت میں گزرے ہوئے تمام لمحات آنکھوں کے سامنے تیزی سے آ موجود ہوتے ہیں۔ محرومی کا عجیب سا احساس قلب و روح اور عقل و شعور کو گھیر لیتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہماری دنیائے فکر و دانش کا آفتاب علم و فضل اور ادب و لسان غروب ہو گیا ہے جس نے اپنی شعلہ نفسی اور خدمت علم و ادب سے ہمارے جہان آگہی کو منور رکھا۔ ہمارا معاشرہ پہلے ہی قحط الرجال کا شکار ہے۔ خواجہ صاحب جیسے اہل علم و ادب کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک مربی کا اٹھ جانا ہے۔ ایک چشمہ بصیرت کا خشک ہو جانا ہے جس سے طالبان علم و ادب سیراب ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب کی رحلت سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے پر ہونے کا امکان کم کم ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ وہ اس خلا کو خلا نہ رہنے دے اور ان کے نعم البدل سے ہمیں نوازے۔ قطرے میں دجلہ دیکھنے والے ہم میں ہیں ہی کتنے، اکثریت تو ان کی ہے جو دجلے میں بھی قطرہ نہیں دیکھ سکتے۔

دلے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت

(ارے مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ دیدہ ور کون ہے جو خار کو دیکھ کر چمن کے احوال بتا دیتا ہے: اقبال)

غالباً اکتوبر 1999ء اتوار کا دن تھا، ریگل چوک صدر میں میرے محترم دوست محمد ظفر جنجوعہ، ملک نواز اعوان اور میں کتاب بازار میں پرانی کتابیں دیکھ رہے تھے، اچانک جنجوعہ صاحب کہنے لگے: ارے اعوان صاحب آپ نے اپنی کتاب تو ابھی تک خواجہ صاحب کو پیش ہی نہیں کی۔ میری یہ کتاب "تاریخ علوی اعوان" انہی دنوں چھپ کر پریس سے آئی تھی۔ خواجہ صاحب کا نام تو سن رکھا تھا لیکن ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی، میں نے بھی یہ موقع مناسب جانا اور عرض کیا کہ ایک کتاب کار میں پڑی ہے کیوں نہ ابھی ان کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں، اسی بہانے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جائے گا۔ صدر سے ہم ان کے ہاں ناظم آباد گئے، گھنٹی بجائی، دروازہ کھلا اور ہم خواجہ صاحب کے سامنے تھے۔ جنجوعہ صاحب نے میری کتاب "تاریخ علوی اعوان" کے حوالے سے میرا تعارف کروایا۔ میں نے کتاب پیش

کی، کتاب دیکھ کر فرمانے لگے "آخاہ! بہت خوب اس پر اپنے دستخط بھی عنایت فرما دیجیے۔" مجھے یاد ہے میں نے اپنے دستخط کے ساتھ لکھا تھا "واجب الاحترام مکرمی مشفق خواجہ صاحب کی خدمت اقدس میں" انہوں نے میرا حال احوال پوچھا، خصوصاً راولپنڈی، اسلام آباد، مری اور ہزارہ کے متعدد ادیبوں، شاعروں کے نام گنوائے۔ اعوان قبیلے کے بارے میں جستجویانہ انداز میں سوالات کیے۔ میں نے بتایا کہ مرحوم پروفیسر کرم حیدری مری والے میرے عزیزوں میں سے تھے، ممتاز منگلوری مانسہرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل محکمہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ دوسری اتوار کو پھر حاضری دی۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد فرمایا: آپ نے اعوان قبیلہ کی واقعی مستند تاریخ مرتب کر دی ہے اور خوب محنت کی ہے، شاباش۔ میں نے ماہنامہ "قومی زبان" میں تبصرہ شائع کرنے کا کہہ دیا ہے جو شائع ہو گیا۔

مشفق خواجہ صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ پانچ چھ سال تک کی ان کے ہاں حاضریاں، مرنجاں مرنج محفلیں، ان کی مہمان نوازیاں، علم و ادب کا دبستان سب آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ ایک عظیم کتب خانے کے مالک تھے جسے انہوں نے اپنی محدود آمدنی میں بڑی جدوجہد اور محبت سے جمع کیا تھا۔ آخر میں ان کی ساری توجہ تحقیق پر مرکوز ہو چکی تھی۔

سوانح عمریوں کا جتنا بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا شاید ہی کراچی میں کسی کے پاس ہو۔ سوانح کی کتابیں جمع کرنے کا شوق ان کو جنوں کی حد تک تھا، اس کے علاوہ مخطوطات کا اچھا خاصا خزانہ انہوں نے جمع کر لیا تھا۔ شعرائے کرام کے تذکرے اور ادبیات اردو کی تمام ضروری کتابیں ان کے ہاں موجود تھیں۔ ہماری پچھلی پچاس سال کی علمی و ادبی تاریخ کے وہ عینی شاہد تھے۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ سب کچھ ان کو مستحضر تھا۔ ہم ان سے ان کی اپنی سوانح عمری لکھنے کا تقاضا کرتے تو وہ ٹال دیا کرتے تھے۔ جناب رفیق احمد نقش صاحب کے بڑے قدردان تھے اور ان کو ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھتے، خاص کر پروف ریڈنگ کے معاملے میں ان پر ہی اعتماد کرتے تھے کیونکہ وہ بھی انہی کی طرح ذمہ داری اور محنت سے کام کرنے کے عادی ہیں، دوسرے وہ زبان کے معاملے میں بڑے باریک بین ہیں۔ مسودوں کی تبویب و اصلاح پر ان کی آراء کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ خواجہ صاحب کے اپنے ہم عصروں سے ذاتی تعلقات تھے اور یہ تعلقات عالمی سطح کے تھے۔ آخر میں روزانہ کتابوں کے بنڈلوں کے بنڈل ان کے ہاں اندرون ملک اور غیر ممالک سے آیا کرتے، خاص طور پر ہندوستان سے ان کی آمد زیادہ تھی۔ کراچی آنے والے تقریباً تمام اہل علم ان سے ملاقات ضرور کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کی برکت سے ہم بھی ان سے متعارف اور ان کی علمی گفتگوؤں سے مستفید ہوتے۔

ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا کہ ڈاکٹر بڑا ہوتا ہے یا پروفیسر۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "ویسے تو پروفیسر بڑا ہوتا ہے مگر (ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ الگ بات ہے کہ یہ بھی پروفیسر ہیں" بذلہ سنجی اور حاضر جوابی خواجہ صاحب پر ختم تھی۔ محفل میں ہر وقت مسکراہٹیں بکھری رہتی تھیں۔

لندن سے ایک صاحب جن کا تعلق اردو ادب سے تھا، اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ تشریف لائے۔ شعر و ادب پر گفتگو رہی، خواجہ صاحب کے ساتھ انہوں نے تصویریں بھی بنوائیں، جانے لگے تو کمال عقیدت کے ساتھ اپنا بریف کیس کھول کر ایک لفافہ تحفتاً خواجہ صاحب کو پیش کیا کہ یہ تحفہ لندن سے خصوصی طور پر آپ کے لیے لایا ہوں۔ ان کے جانے کے بعد لفافہ کھولا گیا تو اس میں ایل (L) شیپ کی ایک لوہے کی پتری نکلی جو کتاب میں نشانی رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ ہم سب حیران تھے کہ لندن سے یہ کیا تحفہ آیا ہے۔ لیکن خواجہ صاحب نے فرمایا: "تحفہ تحفہ ہی ہوتا ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔" مجھے یقین ہے کہ اس تحفے کو بھی انہوں نے ایک کاغذ پر چپکا کر پیچھے دینے والے کا نام اور تاریخ لکھ کر اپنے نوادرات میں شامل کر لیا ہوگا۔

ذوالفقار مصطفیٰ صاحب ان کے ہم زلف ہیں۔ خواجہ صاحب ان کا تعارف اس طرح کرواتے تھے "یہ میرے ہم ذوالفقار ہیں۔" ان کی محفل میں بڑی بڑی قد آور شخصیات کو دیکھنے کا شرف نصیب ہوا۔ شاعر، ادیب، نقاد، علمائے کرام، سیاست دان اور معززین شہر تشریف لاتے تھے اور مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے تھے۔ میں "اچھے" سامع کی طرح خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سے علمی نکات اخذ کرتا رہتا۔ اردو، فارسی، عربی کے متعدد الفاظ کے صحیح تلفظ انہی محفلوں کا عطیہ ہیں، مثلاً جلوس کو میں پہلے جلوس پڑھا بولا کرتا تھا۔ اسی طرح اردو ادب کے ایک ڈاکٹر صاحب نے دوران گفتگو میں "سَر سوَتی" کہا تو آواز آئی "سَرسْوتی"

ایک دن ہمارے بزرگ دوست ملک نواز اعوان صاحب نے فرمایا ہماری اسلامی تہذیب میں ہمیشہ سے دستور رہا کہ صاحب علم حضرات کو کسب معاش سے ہمیشہ فارغ رکھا جاتا، ان کو تعلیم و تعلّم، تصنیف و تالیف اور تحقیق و تخلیق کے لیے مناسب ماحول اور مالی فراغت فراہم کی جاتی اور ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی، شاہی کتب خانوں سے استفادہ کی مکمل سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں، مغرب نے علم کے سلسلے میں یہ اصول اپنا لیے ہیں اور ان کے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اس پر عمل پیرا ہیں، ہمارے اہل علم کا زیادہ وقت زندگی کی گاڑی رواں رکھنے میں ہی خرچ ہو جاتا ہے۔ معمولی معمولی ضروری آلات کے بغیر ہی کام کرنا پڑتا ہے، اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ایک وسیع مکان لے کر خواجہ صاحب کو وہاں منتقل کروا دیتا کہ آرام اور یکسوئی سے اپنے تحقیقی کاموں کو بہ سہولت انجام دیں۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ خواجہ صاحب اپنی لائبریری کے لیے ایک کمپیوٹر کی اشد ضرورت محسوس فرماتے تھے، عموماً اس کا ذکر ہوتا لیکن گراں قیمت کی وجہ سے اس کی خریداری کا معاملہ ٹلتا رہتا۔ میں نے دوسرے دن ہی کمپیوٹر کا بندوبست کر کے خواجہ صاحب کو فون پر اس کی اطلاع دی اور ہم نے کمپیوٹر ان کے ہاں انسٹال کر دیا اور چلا کر ان کو دکھایا۔ ان کو اپنی ذات کے لیے اس کمپیوٹر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ خود کمپیوٹر تھے اور اپنے کتب خانے کی ہر کتاب اور کتاب کہاں رکھی ہے اور اس کے مضامین سے واقفیت تھی، چند لمحوں میں کتاب ان کی میز پر حاضر ہو جاتی۔ اس کی ضرورت کیٹلاگنگ کے لیے تھی تاکہ مقامی اور غیر مقامی اہل علم کو استفادے کی

سہولت میسر آسکے۔ خواجہ صاحب کتاب دینے کے معاملے میں انتہائی سخت تھے۔

اپنی کتاب کسی کو مستعار دینے کی بجائے مانگنے والے سے کہتے اگلی اتوار کو فوٹو کاپی لے جائیں میں بنوا رکھوں گا۔ بہت ہی کم لوگ تھے جن کو کتاب لے جانے کی اجازت دیتے تھے۔ البتہ ملک نواز احمد اعوان صاحب کو میں نے دیکھا کہ ہر اتوار کو ایک دو کتابیں اٹھا لیتے اور اگلے اتوار کے وعدے پر لے جاتے، دوسرے اتوار کو واپس کر دیتے۔ ایک دن میں نے خواجہ صاحب سے کہا: خواجہ صاحب میرے لائق کسی قسم کی کوئی بھی خدمت ہو تو بلا تکلف حکم فرما دیا کریں، انہوں نے ملک نواز صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: صرف ان کو ہر اتوار ملاقات کے لیے لے آیا کریں۔ میں تقریباً ہر اتوار کو ملک صاحب کو اپنے ساتھ ان کے ہاں لے جاتا رہا۔

ان کا دو منزلہ قدیم مکان کتابوں، رسالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم یہی سوچ رہے تھے کہ جس تعداد میں ان کے پاس روزانہ کتابیں آ رہی ہیں اب یہ رکھیں گے کہاں؟ اگر کوئی بھی نہیں تو کتب خانے کا نظم کیسے برقرار رہے گا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ وہ ہر کتاب اور رسالے کو پڑھتے تھے، نہ صرف پڑھتے تھے، بلکہ ان کے مضامین بھی ان کے دماغ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ اس عظیم دماغ اور اس کے حامل عظیم انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ یہ شعر میری دل کی ترجمانی کرتا ہے:

آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را
تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

(آہ اگر میں اپنے دوست کا مبارک چہرہ دوبارہ دیکھ لوں تو قیامت تک اپنے اللہ کا شکر کرتا رہوں گا)

(بحوالہ: "فرائیڈے اسپیشل" ۱۸ مارچ، ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

سخی فی العلم

ٹیلیفون کی گھنٹی پر جواباً "فرمائیے" کہنے والی منفرد آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ اس آواز والا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جی ہاں، مشفق خواجہ صاحب سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے پر "ہیلو" کے بجائے بڑی دھیمی اور مشفقانہ انداز میں "فرمائیے" کہا کرتے تھے۔ میں اس آواز کا بڑا خوگر تھا۔ کیونکہ مرحوم سے میری ملاقات اکثر و بیشتر ٹیلیفون ہی پر ہوتی تھی۔ یا شاذ و نادر کسی تقریب میں محافل و مجالس میں وہ جاتے ہی نہ تھے اور میں نے بھی چند برسوں سے ادبی یا علمی محافل میں جانا بند کر دیا ہے۔

سولہ سترہ سال ہوتے ہیں کہ تقسیم ہند کے سال یعنی اب سے ٹھیک ۵۷ سال قبل کے حامد ہائی سکول رام پور کے ایک لائق سابق شاگرد رضوان اللہ خان عنایتی نے اپنے یہاں ایک کھانے پر مرحوم مشفق خواجہ صاحب سے میرا تعارف کرایا اور پھر اس کے بعد سے یہ رشتہ مودت استوار رہا۔ ورنہ اس سے قبل میں مشفق خواجہ صاحب کے نام سے بھی واقف نہ تھا کیونکہ تیس پینتیس سال سے عرب ملکوں میں تھا اور اس ملاقات سے سال دو سال قبل ہی واپس کراچی آیا تھا۔ میرے اور مشفق خواجہ صاحب مرحوم کی دلچسپی کے میدان اگرچہ جدا جدا تھے لیکن "تحقیق" سا ایک نقطہ اشتراک تھا۔ مرحوم بنیادی طور پر نقاد و محقق تھے اور میں بھی تقریباً نصف صدی سے اسی دشت کا رہرو ہوں۔ ان کا دائرہ تحقیق اردو شعر و ادب تھا اور میرا اسلامی و عربی تاریخ و علوم، یہی ذوق تحقیق ہم دونوں کے تقارب کا باعث ہوا۔

میں نے اپنی ابتدائی جوانی میں اردو ادب اور خاص طور پر ترقی پسند ادب بہت پڑھا تھا، لیکن سنہ ۱۹۳۹ء سے عربی زبان سیکھنے کے بعد اردو شعر و ادب سے میرا رشتہ تقریباً کٹ چکا تھا۔ گو بیرون ملک مسافرانہ زندگی میں دیوان غالب اور علامہ اقبال کے بعض دواوین ہمیشہ میرے ساتھ رہے، لیکن وہ تبرک کے طور پر تھے اور کبھی کبھار دل بہلانے کے لیے، سچ بات یہ ہے کہ اردو ادب سے دوبارہ میرا رشتہ مرحوم مشفق خواجہ کے ذریعہ ہی قائم ہوا، اور وہ ان کے کالموں کے ذریعے سے، مشفق خواجہ صاحب اردو ادب کے ایک بلند پایہ محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نغز گو شاعر و ادیب اور ایک منفرد نوعیت کے کالم نگار بھی تھے۔ لطیف طنز اور پرمغز ادبی تنقید کا امتزاج ان کے کالموں کی انفرادیت تھی۔ یہ بھی محض ایک اتفاق تھا کہ مجھے مرحوم کی تحریر سے ان کے کالموں کے ذریعے ہی آگاہی ہوئی۔

برسوں بعد پاکستان واپس آنے کے بعد میں پابندی سے اپنے عزیز و مخلص دوست صلاح الدین

شہید کا ہفتہ وار مجلہ "تکبیر" پڑھا کرتا تھا۔ اس میں مشفق خواجہ صاحب مرحوم "خامہ بگوش" کے قلمی نام سے "سخن در سخن" کے عنوان سے ہر ہفتہ ایک کالم لکھا کرتے تھے۔ جو انتہائی دلچسپ اور مقبول تھا۔ میں یہ کالم بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا اور مرحوم کی شگفتہ اور لطیف طنز سے بھرپور تحریر سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ اگرچہ خود مرحوم ان کالموں کو بانداز "کالم" کہہ بیرنگ سن است ہی کہتے تھے۔

ایک بار میں نے ان کے کسی کالم میں ان کی اخلاقی حس کی تعریف کی تو پوری صفائی و سادگی سے کہنے لگے، چھوڑیے صاحب، یہ کالم تو میں پیسوں کے لیے لکھتا ہوں، ہر ہفتہ ایک ہزار روپے مل جاتے ہیں۔ بہر حال ان کے یہ کالم اخبارات و رسائل میں چھپنے والے بہت سے کالموں کی طرح وقتی نوعیت کے نہیں تھے، نہ ان میں رچا بسا ادبی و اخلاقی طنز محض لفظوں کا کھیل تھا، بلکہ ان میں گہری ادبی معنویت و تنقید ہوتی تھی اسی لیے کافی عرصے قبل یہ کالم انڈیا میں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع ہوئے اور پھر پاکستان میں بھی۔

اگر تعبیر کو درست سمجھا جائے تو مرحوم سے میری دوستی "ٹیلیفونک دوستی" تھی (ٹیلیفونک کے لیے عربی لفظ "ھاتفی" "زیادہ بہتر ہے) یعنی ہم دونوں ٹیلیفون ہی کے ذریعہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے، میں ان سے اردو میں مستعمل الفاظ یا غلط مستعمل الفاظ کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا اور وہ بعض ثقیل و نامانوس عربی الفاظ کے تلفظ کے بارے میں مجھ سے استفسار کر لیا کرتے تھے۔ ایک بات ان کی ہمیشہ مجھے یاد رہے گی، وہ یہ کہ اچھے اچھے مصنفوں کی تحریروں میں قمیص کا املا "قمیض" دیکھ کر میں بہت حیران اور متعفض ہوتا تھا، میں نے اس کی شکایت کی تو کہنے لگے کہ آپ کس کس کو روکیں گے۔ یہ تو ۹۹ فیصد لوگ لکھتے ہیں۔ میرا جواب تھا کہ اگر ۱۰۰ فیصد لوگ بھی لکھنے والے ض سے قمیض لکھیں تو یہ غلط ہی ہو گا۔ یہ قرآنی لفظ ہے۔ سورہ یوسف میں متعدد بار آیا ہے، کسی کو حق نہیں کہ اس قرآنی املا کو بگاڑے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ مشفق خواجہ صاحب مرحوم انتھک کام کرنے اور خاموش کام کرنے والے شخص تھے، یہی ان کی سب سے اہم خصوصیت تھی، لیکن میری نظر میں اس سب کے ساتھ ان کی ایک اہم دوسری خصوصیت ان کی علمی فیاضی تھی۔ ان سے اگر کوئی بات پوچھی جائے تو وہ دریا دلی کے ساتھ بہت کچھ بتا دیا کرتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ میں اردو لغت کا کوئی نکتہ ان سے دریافت کرتا اگر وہ ان کو مستحضر نہ ہوتا یا انہیں اس بارے میں شک ہوتا تو مجھ سے کہتے ذرا توقف کیجیے اور فوراً کسی لغت یا تذکرے میں دیکھ کر جواب دے دیتے تھے۔ ایسے بھی لوگ دیکھے اور سنے ہیں جو بہت ذی علم ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں بہت بخل سے کام لیتے، بخیل العلم ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کے بالکل برعکس مشفق خواجہ مرحوم بڑے سخی فی العلم بلکہ دریا دل تھے۔

علاوہ ازیں وہ بہت سے مشہور اور سکہ بند اردو ادیبوں کے برخلاف غرور علم سے پاک اور حق بات قبول کرنے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ اس کا تجربہ مجھے ایک واقعہ سے ہوا۔

سنہ ۱۹۹۰ء یا ۱۹۹۱ء کی بات ہے کہ تکبیر کے صفحہ عنوان پر اور اندر ان کے کالم میں بھی مجھے لفظ "معلّن" لام کے تشدید کے ساتھ نظر آیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ کاتب کی غلطی ہوگی، کیونکہ صحیح لفظ لام پر تشدید کے بغیر معلن ہے (یعنی اعلان کرنے والا) بالکل اسی وزن پر جس پر محسن، مومن بلکہ خود مشفق کے الفاظ ہیں، کہ یہ سب عربی کے باب افعال سے اسم فاعل ہیں۔ بہر حال ٹیلیفون پر گفتگو میں، میں نے مرحوم سے پوچھ لیا کہ کیا آپ نے لفظ معلن (بہ تشدید "ل") لکھا ہے، یا یہ کاتب کی غلطی ہے؟ موصوف نے پوری صفائی سے کہا میں نے ہی ایسا لکھا ہے، جس پر میں نے انہیں بتایا کہ عربی زبان کا یہ ٹھیٹ لفظ بہ تشدید (ل) نہیں بلکہ بغیر تشدید کے ہے، کیونکہ عربی میں مادہ "معلن" سے باب تفعیل نہیں آتا ہے کہ آپ اس سے اسم فاعل "معلّن" بنالیں۔ مرحوم نے بغیر رد و قدح کے کشادگی قلب کے ساتھ میری بات تسلیم کر لی۔ اسی طرح اردو میں ایک عربی لفظ حمقی (احمق کی جمع) کا غلط استعمال حمقاء (بروزن علماء) ہے، مدیر تکبیر شہید صلاح الدین بھی ایسا ہی لکھتے تھے اور مشفق خواجہ صاحب، لیکن تکبیر کے صفحات پر میری اصلاح کے بعد ان دونوں نے اپنی روش بدل لی۔ میں نے ان سے اردو کے ایک مشہور شعر:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

کے بارے میں پوچھا کہ یہ کس شاعر کا ہے، کیونکہ میں ۳۵ سال تک عربی ممالک و انگلینڈ میں رہنے کے سبب اردو ادب سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ مرحوم نے مجھے فوراً بتایا کہ یہ شعر رام نرائن موزوں کا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کا پس منظر بھی بتا دیا کہ رام نرائن نے یہ شعر جنگ پلاسی میں انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی شکست و شہادت پر کہا تھا۔

بہر حال ہم دونوں کا یہ "علمی لین دین" جاری رہتا تھا، میں نے جب شان الحق حقی صاحب کی فرہنگ تلفظ کا ایک طویل تنقیدی جائزہ لکھا تو وہ اس سے بہت محظوظ ہوئے۔ انہوں نے اس فرہنگ کی تصنیف کے بارے میں مجھے کچھ معلومات بھی مہیا کیے تھے اور چار پانچ ماہ قبل جب اس تصنیف پر میں مزید کچھ تنقید لکھ رہا تھا جو پہلے سے بھی زیادہ خوب ہو گی تو موصوف نے اس دوران میں مجھے اردو کے مشہور ادیب، نقاد، جعفر علی خان، اثر کی فرہنگ اثر کے بارے میں بتایا تھا جس سے میں نے اپنے مقالے میں بہت فائدہ اٹھایا۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں میری یہ تنقید مزید نہیں چھپ سکی اگرچہ وہ اس کے پڑھنے کے مشتاق تھے۔ مقتدرہ والے جن کو میں نے اشاعت کے لیے بھیجی تھی اب تک اسے دبائے بیٹھے ہیں۔

اپنی اس علمی سخاوت و فیاضی کی بنا پر وہ اردو ادب کے ریسرچ طلبہ میں بڑے محبوب تھے، جو اکثر ان کے گھر آ کر مستقل طور پر ان سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ اردو ادب اور پی ایچ ڈی حاصل کرنے والے طلبہ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اس یونیورسٹی میں بحیثیت وزیٹر پروفیسر تین سال گزارنے کے بعد شعبہ عربی اور اسلامیات و اسلامی تاریخ کے شعبوں کے

بارے میں میرا ابھی یہی تاثر تھا کیونکہ وہاں اساتذہ وطلبہ میں محنت وجانفشانی کا فقدان تھا اور ہے، پی ایچ ڈی کرنا اور کرانا اکثر حالات میں انہوں نے ایک آسان کام سمجھ رکھا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب مرحوم ایک قادر الکلام اور نغز گو شاعر تھے لیکن مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے اور جب میری ان سے رسم وراہ ہوئی تو وہ غالباً شعر گوئی ترک کر چکے تھے لیکن پھر بھی مجھے اپنے ایک محترم اور مخلص دوست جسٹس ریٹائرڈ سید مظہر علی صاحب کے یہاں ایک محدود نجی مشاعرے میں مرحوم کی ایک غزل اولیں وآخریں بار سننے کا اتفاق ہوا جہاں مشتاق احمد یوسفی صاحب مشفق خواجہ صاحب کو پکڑ کر لے آئے تھے کہ وہ اس ادبی انجمن کے سیکرٹری اور مظہر علی صاحب کے مخلص دوست تھے۔

مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہے گا کہ اپنی خواہش کے باوجود میں کبھی مشفق خواجہ صاحب کے گھر جا کر ان کا مکتبہ نہیں دیکھ سکا جس کی میں نے بہت تعریف سن رکھی تھی۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق مجھے بھی انہی کی طرح ہے۔ وجہ یہ رہی کہ اتوار کے روز صبح کو دس پندرہ سال سے میرا درس قرآن ہوتا ہے (چھ سال سے ڈیفنس سوسائٹی سنٹرل لائبریری میں) اور ان کے یہاں بھی اتوار ہی کو نشست ہوتی ہے۔ بس اسے طبیعت کی سستی اور محرومی کہیے ورنہ کسی اور دن بھی جا سکتا تھا۔

ایک اور افسوس یہ ہے گا کہ انہوں نے مجھ سے دو فرمائشیں کی تھیں جن پر میں ان کی زندگی میں عمل نہیں کر سکا (شاید اب توفیق ہو) ایک یہ کہ اپنے قدیمی استاد فارسی شاداں بلگرامی کے بارے میں ایک مضمون قومی زبان کے لیے لکھ دوں اور دوسرے یہ کہ راغب مراد آبادی صاحب کی کتاب ”آیات و احادیث رباعی افروز“ کا ایک تنقیدی جائزہ، کیونکہ میں نے انہیں بتایا تھا کہ اس کتاب میں آیات و احادیث کے الفاظ و ترجمانی میں اغلاط کی بھرمار ہے۔

میں ہمیشہ ان کا شکر گزار رہوں گا کہ ان کے ذریعہ سے کسی حد تک اردو ادب سے میرا رشتہ دوبارہ استوار ہو گیا کیونکہ انہوں نے دس بارہ سال قبل ”قومی زبان“ اعزازی طور پر میرے لیے جاری کرا دیا تھا۔ آخر میں عرض ہے کہ مرنے والا اس دنیا میں جا کر ہماری اس تعریف و توصیف سے بے نیاز ہو جاتا ہے، جو چیز اس کے کام آتی ہے، وہ اس کے لیے جاری دعائے مغفرت ہے، سو مرحوم کے احباب کا فرض ہے کہ وہ اور ہم سب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت فردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین!

(بحوالہ: ”فرائیڈے اسپیشل“ ۱۸ مارچ، ۲۰۰۵ء)

پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر

آہ مشفق خواجہ!

ترکیہ کے بذلہ سنج خواجہ نصیر الدین سے مشابہت رکھنے والے شعر و ادب کے شیدائی اور ایک خوش مزاج انسان مشفق خواجہ ہم سے جدا ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۹۳۵ء میں لاہور سے طلوع ہونے والا آفتاب ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو کراچی میں غروب ہو گیا۔ وفات سے چند روز قبل مشفق خواجہ سے فون پر بات ہوئی تھی جس میں انہوں نے کہا کہ اپنی علمی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ لکھ کر بھجوا دیں۔ ۲۰ فروری پندرہ منٹ تک ٹیلیفون پر بات کی۔ میں نے بیگم کی خیریت دریافت کی تو کہا، خیریت سے ہیں۔ آواز سے کسی قسم کی نقاہت یا تکلیف کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ جب میں ۲۲ فروری کو یونیورسٹی پہنچا تو معلوم ہوا۔ گزشتہ رات مشفق خواجہ ہم سے جدا ہو گئے!

مشفق خواجہ سے قبل ان کے والد خواجہ عبدالوحید سے ۱۹۵۵ء سے میرے تعلقات تھے۔ خواجہ عبدالوحید اسلام، اقبال اور ترکوں کے مداح تھے۔ ان سے میری ملاقات پاکستان، ترکی کلچرل انجمن کے جلسے میں ہوئی تھی جس کی صدارت کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اے بی اے حلیم کر رہے تھے۔ اسی اجلاس میں عطیہ فیضی رحمین سے ترکی میں گفتگو ہوئی۔ عطیہ اصل میں ترک تھیں۔ میں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں بی اے کرنے کے بعد کانپور میں سکونت پذیر مشرقی ترکستانی مہاجر مولانا ہاشم ایک ترکستانی عالم سے ترکی سیکھی جو مولانا مدنی کے شاگرد تھے۔ خواجہ صاحب سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور وہ ایک دن مجھے اپنے سرکاری مکان جہانگیر روڈ لے گئے۔ خواجہ عبدالوحید نے مجھے اپنے انگریزی پرچے Al-Islam میں ترکی مسلمانوں اور جنوبی کوریا میں ترکی فوج اور اشاعت اسلام کے بارے میں سلسلہ شروع کرنے کے لیے کہا۔ میں نے امام زبیر قوچ (Koch) کو خط لکھ کر معلومات حاصل کیں اور کوریا میں اسلام کے موضوع پر مضامین لکھے۔ یہ اخبار وکٹوریہ روڈ صدر کراچی سے خواجہ عبدالحئی کی جانب سے چھپتا تھا اور اس کا دفتر نیو ٹاؤن مسجد میں تھا۔ میں نے پوچھا، یہ عبدالحئی کون ہیں۔ مسکرا کر بولے۔ میں سرکاری ملازم ہوں اس لیے اپنے بیٹے کے نام سے شائع کراتا ہوں۔ یہ جو سامنے بیٹھے ہیں، یہ خواجہ عبدالحئی ہیں۔ یہی خواجہ عبدالحئی بعد میں مشفق خواجہ بن گئے۔

خواجہ عبدالحئی سے مشفق خواجہ کا قلمی نام اختیار کرنے والے سے میرا اپنا تعلق تھا۔ خواجہ صاحب سے برابر تعلق رہا۔ ایک تو ان کی بیوی آمنہ بی بی میری شاگرد تھیں اور والد میرے دوست تھے۔ خواجہ صاحب کو ترکی سے بھی لگاؤ تھا، کبھی ترکی کے بارے میں کوئی کتاب طلب کرتے، کبھی فون پر ترکی لفظ کے

معنی دریافت کرتے، ایک بار فوری طور پر اولیا چلبی (ترکش مورخ و ادیب) پر کتاب طلب کی، بھجوا دی۔ پڑھ کر واپس کر دی۔

میں نے جب ترکوں کے سب سے عظیم شاعر و ادیب میر علی شیر نوائی کی پہلی مثنوی "حیرت الابرار" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد نومبر ۱۹۶۱ء سے جامعہ کراچی میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے بعد میری مشفق خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے، احسان اوغلو صاحب آپ مجھے شاید بھول گئے۔ آپ ترکی سے متعلق مضامین لے کر میرے والد خواجہ عبدالوحید کے پاس آیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں مجھے ایم اے کرنے کے بعد استنبول یونیورسٹی میں ترکی ادب پر ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے حکومت ترکیہ کا وظیفہ مل گیا تو خواجہ عبدالوحید صاحب بہت خوش ہوئے اور وہ واحد بزرگ تھے جو مجھے کراچی ایئر پورٹ الوداع کہنے آئے اور روانگی کے وقت زور دے کر کہا کہ مطالعہ کے ساتھ ساتھ اقبال، اردو اور پاکستان کے موضوع پر تحقیق سے غفلت نہ برتنا۔

میں نے مشفق خواجہ کو بتایا کہ ایک کیتھولک پادری ڈاکٹر باربیریو (Barbario) مجھ سے اردو پڑھتے تھے۔ یہ اطالوی النسل تھے اور یوسانی سے واقف تھے۔ بہت جلد اردو لکھنے اور بولنے لگے تو کتابوں اور لغت سے استفادہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ آپ اپنی اردو میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو کراچی خط لکھیں وہ ضرور مدد کریں گے۔ میرے والد کے ہم جماعت حکیم اسرار کریوی مولوی عبدالحق کی اردو دوستی، فراخدلی اور ان کی صحبت میں کام کرنے والے نوجوان ادیب مشفق خواجہ کی صلاحیتوں کا اکثر تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر باربیریو (Barbario) کا ایک دن فون آیا کہ ایک بڑی انگریزی اردو لغت کراچی سے تحفتاً آ گئی ہے۔ میں نے اس خط کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے اچھا آپ شورائیوں کے ملک میں بھی اردو کے لیے کوشاں رہے۔ مجھ سے ایک دن کہنے لگے آپ کو احسان اوغلو (Ihsan Oghlu) کیوں کہتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ اس کے معنی ہیں "ولد احسان"۔ ترکی میں احسان اوغلو کے معنی ہیں، احسان کا بیٹا۔ اب لوگوں نے صرف اوغلو کہنا شروع کر دیا جس کے معنی بیٹے کے ہیں۔ بعض لہجوں میں اوغل کہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ترک میرے والد کا نام پوچھ کر اپنے قاعدے کے مطابق زبردستی احسان اوغلو لکھتے تھے تو میں نے بھی صابر احسان اوغلو لکھنا شروع کر دیا۔

چند سال قبل مشفق خواجہ نے پوچھا کہ آج کل کیا لکھ رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ میر علی شیر نوائی پر اردو میں مستند کتاب لکھنے میں لگا ہوا ہوں۔ میں نے بتایا کہ میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا کچھ حصہ استنبول یونیورسٹی سے چھپ چکا ہے، اب اردو میں نوائی کے خیالات اور ترکی کی گرامر کا تعارف ضروری ہے۔ مرحوم نے کہا کہ آپ توقف کریں ابھی نہ شائع کرائیں، اسے احسن طریقہ پر شائع کرانے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ارادہ ترک کر دیا اور خود ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء میں ہم سے جدا ہو گئے۔

قبل انہوں نے اردو شاعر یاس یگانہ چنگیزی پر تحقیقی کتاب شائع کی تو میں نے [illegible]
فزکس کے سابق صدر (کراچی یونیورسٹی) ڈاکٹر شیخ انصار الدین کے مکان پر ڈاکٹر [illegible]
صدارت میں ایک نشست ہوئی جس میں چنگیزی پر طویل مقالے پڑھے گئے۔ [illegible]
اہم مقالہ پیش کیا۔ میں بھی اس نشست میں شریک تھا۔

مشفق خواجہ نے ان مقالوں کو حاصل کر لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے [illegible] صدیقی اور فضل صدیقی کا انتقال ہو گیا اور ڈاکٹر شیخ انصار حسین امریکہ چلے گئے۔

ایک دن موڈ میں تھے، مجھ سے کہنے لگے آپ الہ آباد کے پاس ملیس [illegible] جانتے ہوں گے۔ میں نے تفصیل سے بتایا کہ میں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ [illegible] زمانے میں نوح ناروی (مسلمان کا سمجھ) بسمل الہ آبادی (ہندو کا سمجھ) اور [illegible] کا سمجھ) موسوم، پر فراق گورکھپوری جیسے شعراء کی دھوم تھی اور میرے مشاعرں [illegible] میرے اساتذہ میں ڈاکٹر سعید احمد، ڈاکٹر زبیر احمد، ڈاکٹر محمد احمد، اقبال خان، ڈاکٹر [illegible] تھے۔

ایک بار ان سے اردو زبان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کی اولیت کا تذکرہ [illegible] فیصلہ تو ڈاکٹر اسلم فرخی کے حوالے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ برصغیر میں اردو کے پہلے پی ایچ ڈی [illegible] الہ آبادی پھر ڈاکٹر ابواللیث بدایونی ہیں جنہوں نے علی گڑھ سے یہ ڈگری حاصل کی [illegible] کے کسی فرد کا ڈگری حاصل کرنے سے تعلق ہے تو لندن یونیورسٹی سے اردو کی پہلی ڈگری [illegible] اللہ نے حاصل کی تھی۔ سننے کے بعد مسکرانے لگے اور کہنے لگے آپ کو ان باتوں کی بھی [illegible] کہا کہ مجھے صرف توران کی نہیں بلکہ ایران و انگلستان کی بھی خبر ہے۔

مشفق خواجہ نے اپنے بھائی طارق کی شادی کے موقع پر مجھے خاص [illegible] شاندار تقریب تھی۔ معلوم ہوا طارق احمد میں امریکہ چلے گئے۔ میری وہ شادی [illegible] کی کمزوری بات سن کر مسکراتے اور چائے پلا کر رخصت کر دیتے۔

خواجہ عبدالوحید مجھ سے اور میرے ایک شاگرد پروفیسر شفیع اختر سے بڑی محبت [illegible] قبل شفیع اختر کا انتقال ہوا تو میں نے پنڈال میں داخل ہوتے ہی مشفق خواجہ کو [illegible] معلوم ہوا کہ موجود نہیں۔ میری بیگم نے خواتین میں [illegible] سے ملاقات ہوئی، جنہوں نے بتایا کہ مشفق خواجہ کی حالت کافی خراب ہے [illegible] اس خبر سے بڑی تشویش ہوئی اور آخر کار وہ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو ہم سے جدا ہو گئے [illegible] کرے۔ آمین!

(بحوالہ: "افرا ایشیائی جرنل" [illegible] ۲۰۰۵ء)

تحقیق کا مشفق

(اردو ادب کی نامور شخصیت پر چھبیس برس قبل لکھا گیا ایک دل گداز خاکہ)

وہ اس زمانے میں محض ایک ہونہار طالب علم تھا اور اسلامیہ کالج میں زیر تعلیم۔ میں کراچی، سالنامہ ادب لطیف کے مضامین کی فراہمی کے لیے گیا تھا۔ ابھی اس مہم میں مصروف تھا کہ ابن انشا نے کہا ''اسلامیہ کالج میں مشفق خواجہ نے آپ کو بلایا ہے۔ آپ طالب علموں سے خطاب کریں گے۔''

''میں کیا خطاب کروں گا؟'' میں نے پوچھا۔

''گھبرا کیوں رہے ہیں۔ آپ خطاب نہیں کریں گے تو وہ آپ سے خطاب کر لیں گے۔'' انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

انشا جی نے مجھے اسلامیہ کالج کا پتا بتایا اور میں وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت تک مشفق خواجہ سے دو تین خطوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اب یاد نہیں رہا کہ انہوں نے اپنی کوئی غزل بھیجی تھی یا مضمون، بہرحال رسمی سا رابطہ تھا۔ اور اس رسمی رابطے کے باوجود انہوں نے مجھے اپنے کالج آ کر لڑکوں سے گفتگو کی دعوت دے ڈالی تھی۔

ایک صاحب مجھے اوپر کی منزل میں لے گئے۔ سب سے پہلے جو شناسا چہرہ نظر آیا، وہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا تھا۔ وہ اردو کے استاد تھے اور اس وقت کاغذ قلم لیے کچھ مضطرب سے نظر آئے۔ مجھے دیکھا تو بولے ''آپ جماعت میں چلیے، ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

جماعت سامنے تھی اندر گیا۔ لڑکے جو تعداد میں پندرہ سے زیادہ نہیں تھے، تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ تو مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے کسی اجنبی دنیا سے آیا ہوں اور کچھ بڑے غور و خوض سے دیکھ کر غالباً یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں واقعی وہی ہوں جس کا غائبانہ طور پر تعارف کرایا گیا تھا۔ دائیں طرف سب سے پہلے ڈیسک پر دو ایسے نوجوان بیٹھے تھے جن کے چہروں کے تاثرات نے بتایا کہ وہ آنے والے کو اپنی ہی دنیا کا باشندہ سمجھتے ہیں اور اسے پہچانتے بھی ہیں۔

کچھ دیر بعد ابوالخیر کشفی جماعت میں آ گئے۔ انہوں نے تفصیل سے میرا تعارف کرایا، میری تخلیقات کی تحسین کی، میری آمد کو اپنی اور اپنے طلبا کی خوش بختی پر محمول کیا اور پھر کہنے لگے ''میرزا صاحب یہاں موجود ہیں۔ آپ نے ان کے افسانے، ڈرامے پڑھے ہیں۔ کچھ پوچھنا ہو تو شوق سے پوچھ لیں۔''

یہ کہہ کر وہ دروازے پر کسی صاحب کو آتے دیکھ کر باہر چلے گئے۔ جماعت میں کھسر پھسر ہونے لگی، پھر بند ہو گئی اور لڑکے اس انداز سے مجھے دیکھنے لگے جیسے میں سٹیج پر جادو کا کوئی کرتب دکھانے آیا ہوں اور اب وہ تماشے کے منتظر بیٹھے ہیں۔

ایک منٹ گزر گیا، خاموش تماشا جاری رہا۔ آخر ایک لمبے قد کا لڑکا جو دیر سے مجھے گھور رہا تھا، کرسی سے اٹھا۔ میرے لیے اس قسم کا پہلا تجربہ تھا۔ اندر سے خوف زدہ تھا کہ نہ جانے یہ کیسا مشکل سوال کر بیٹھے۔ اس نے گلا صاف کیا، اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پنسل دانتوں تلے دبائی، نکالی پھر نظریں نیچی کیے پوچھا:

''جی...... آپ...... جی...... کون ہیں؟'' یہ کہہ کر جلدی سے بیٹھ گیا۔

جماعت پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں گھبرا گیا کہ اگر ایسے ہی سوال پوچھے گئے تو میرا حشر کیا ہوگا۔ پھر دیکھا کہ پہلے ڈیسک والے دونوں لڑکے ہنس نہیں رہے، سنجیدہ ہیں۔ ان میں سے ایک تو گول مٹول سا تھا، رنگ سرخ و سفید اور بھرا بھرا چہرہ۔ وہ کشمیری نسل کا لگتا تھا اور دوسرا لڑکا ذرا دبلا پتلا تھا۔

گول مٹول لڑکا کھڑا ہو گیا ''معاف کیجیے جو سوال ابھی آپ سے پوچھا گیا، فلسفیانہ قسم کا ہے، میں تو طالب علمانہ سوال کروں گا۔ یہ بتائیے کہ آپ کو ادب کا شوق کیونکر ہوا؟''

میں نے جو مناسب سمجھا، جواب دے دیا۔ اس پہلے سوال پر ہی گول مٹول کی ذہانت نے مجھے متاثر کر دیا۔ اس کے بعد تابڑ توڑ سوال کیے گئے اور لطف کی بات یہ کہ سارے سوال ان دونوں لڑکوں ہی نے کیے۔ خصوصاً گول مٹول پیش پیش تھا، جماعت کے تمام لڑکے محض تماشائی بن گئے۔ ان کے چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہیں اس تماشے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ ان دونوں کے سوال تو شاید ایک گھنٹہ اور چلیں گے اور میرا کچومر ہو جائے گا۔ اسی وقت ایک لڑکا کمرے میں آیا اور گول مٹول سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''کشفی صاحب کہتے ہیں میرزا صاحب کو ادھر لے آئیے۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوا۔ جی چاہتا تھا کہ ان دونوں ستم آزما طالب علموں سے پوچھوں کہ تمہارے نام کیا ہیں...... اور مشفق خواجہ کیوں نہیں آئے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میں کوشش کر کے ان کے قریب پہنچ گیا۔

''ذرا رکیے۔''

''فرمائیے۔'' گول مٹول لڑکے نے کہا۔

''اپنا تعارف نہیں کرائیں گے۔ ماشاءاللہ بہت ذہین و فطین نوجوان ہیں۔''

''لیجیے ابھی تعارف ہو جاتا ہے، یہ ہیں رضی اختر شوق، مجھ سے دو جماعتیں سینئر ہیں۔ انہیں ادب کا بہت شوق ہے۔ اس لیے اپنا تخلص شوق رکھ لیا؟'' گول مٹول نے ان الفاظ میں اپنے ساتھی کا تعارف

کرایا اور خاموش ہو گیا۔

''اور آپ؟''

''ارے آپ انہیں نہیں جانتے، کمال ہے، یہ......'' رضی اختر شوق اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

کوئی متوسل خود بول پڑا ''حضور! اس خاکسار کو مشفق خواجہ کہتے ہیں۔''

''تو آپ ہیں مشفق خواجہ؟''

''جی...... بندہ گنہگار کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔''

''آپ نے پہلے تعارف کیوں نہیں کرایا؟''

''غلطی ہو گئی حضور!''

یہ تھی مشفق خواجہ سے میری اولین ملاقات کی مختصر روداد۔

چائے نوشی کے دوران مشفق خواجہ سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان کے شائستہ لب ولہجے اور ش۔ ق کی درستی سے مجھے احساس ہو گیا کہ وہ جمنا پار کے کسی علاقے سے آئے ہیں۔ اس لیے پوچھا ''خواجہ صاحب! یہ تو بتایئے آپ لوگ پاکستان میں کب اور کہاں سے آئے؟''

مسکراتے ہوئے بولے ''ہم لوگ پاکستان میں کہاں سے آتے، تھے ہی ازلی اور ابدی پاکستانی۔''

''تو یہ لب ولہجہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''خدا کی دین ہے۔''

مجھے اس بات پر کافی حیرت ہوئی۔ مشفق خواجہ نے اپنے شستہ لب ولہجے کو خدا کی دین کہا اور بالکل صحیح کہا۔ ایسا بے عیب تلفظ انہیں اہل زبان کے زمرے میں لے آتا ہے اور اس وجہ سے میں نے انہیں اہل زبان تصور کر لیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ خود بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی ایک مدت تک انہیں اہل زبان ہی سمجھتے رہے تھے۔

مشفق خواجہ سے میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر مولوی صاحب کی زیرنگرانی انجمن ترقی اردو کے مرکزی دفتر میں کام کرنے لگے۔ مشفق خواجہ نے اپنی کارکردگی سے انہیں اس درجہ متاثر کر لیا کہ وہ ان سے بعض اہم معاملات میں بھی مشورہ لے لیتے تھے۔ جب تک مولوی صاحب زندہ رہے، مشفق حقیقی معنوں میں ان کے معتمد رہے۔

اس دوسری ملاقات میں کھل کر باتیں نہ ہو سکیں، وہ بے حد مصروف تھے۔ میں جب تیسری مرتبہ کراچی پہنچا تو مولوی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں ادارہ مصنفین کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے کراچی گیا تھا۔ دو روز تک اجلاس جاری رہا۔ میرا قیام ادارے کے باقی مندوبین کے ساتھ ہوٹل میں رہا۔ دو دن گزر گئے تو اب مجھے یا تو واپس چلے جانا چاہیے تھا یا ہوٹل سے نکل کر کسی اور جگہ اپنی اقامت کا انتظام کرتا۔ انشا جی نے اپنے ہاں ٹھہرنے کے لیے کہا۔ میں انہیں زحمت دینا نہیں چاہتا تھا۔ مشفق خواجہ

نے کہا ''میرا مکان تنگ ہے، مگر دل کشادہ ہے۔''

عرض کیا ''مجھے آپ کے دل میں نہیں مکان میں رہنا ہے اور وہ تنگ ہے۔''

مشفق خواجہ کچھ سوچتے رہے پھر بولے ''اگر آپ ہم میں سے کسی کے ہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتے تو انجمن کے دفتر میں قیام کر لیجیے، وہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔''

مشفق خواجہ کی یہ تجویز میں نے منظور کر لی۔ دراصل میں سمندر کے ساحل پر جانا چاہتا تھا اس کے بغیر کراچی سے چلے جانا میرے لیے تکلیف دہ ہوتا۔

اس دفعہ ان کے ساتھ کافی نشستیں رہیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ مشفق خواجہ نے اتنی کم عمری میں اتنا کچھ کیسے پڑھ لیا اور اتنا کچھ پڑھ کر ہضم کس طرح کر ڈالا۔ وہ نسلاً کشمیری ہیں، ذہانت انہیں ورثے میں ملی ہے۔ اس فطری اور نسلی ذہانت کے علاوہ ان کی خوش قسمتی یہ ہے کہ ان کا تعلق ایسے خانوادے سے ہے، جس کی امتیازی خصوصیت علم سے والہانہ شیفتگی اور فنون لطیفہ سے گہری وابستگی ہے۔ خواجہ صاحب کے والد گرامی خواجہ عبدالوحید مرحوم و مغفور علوم اسلامیہ کے متبحر عالم تھے اور ادبی محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔

انہوں نے اپنی محفل آرائیوں اور عملی جدوجہد کے ساتھ ساتھ زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں بسر کیا۔ ان کے فرزند ارجمند نے باپ سے علمی ورثہ تو تمام و کمال پایا مگر محفل آرائیوں اور عملی جدوجہد سے بہت کم بہرہ مند ہوا۔ اس علمی خانوادے کے دوسرے افراد میں ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید شامل ہیں جنہوں نے لاہور کے فارسی شعرا کا تذکرہ تالیف کیا اور علمی موضوعات سے متعلق بیسیوں مقالات سپرد قلم کیے۔ خورشید انور سے کون واقف نہیں ہوگا، انہوں نے فلمی موسیقی میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کی بنائی ہوئی کی دھنیں کل بھی مقبول تھیں اور آج بھی ہیں۔

مشفق خواجہ نے اسی ماحول میں پرورش پائی۔ انہیں علمی لگن ورثے میں بھی ملی اور اپنی ذاتی سعی و جہد سے بھی۔ میں نے ابھی بتایا ہے کہ وہ ہنگامہ آرائیوں سے حتی الوسع مجتنب رہتے ہیں۔ نمود و نمائش سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ کراچی میں ہر روز طرح طرح کی تقاریب ہوتی ہیں مگر خواجہ صاحب شاذ و نادر ہی کسی تقریب میں شامل ہوتے ہیں۔

وہ کسی کے ہاں آتے جاتے نہیں۔ انشا جی سے ان کے تعلقات بہت پرانے اور گہرے تھے مگر رابطہ ٹیلی فون کے ذریعے قائم رہتا۔ اپنے باقی احباب سے بھی وہ ٹیلی فونی رابطہ ہی قائم رکھتے مگر یہ رابطہ بھی قلبی رابطے ہی کی نمائندگی کرتا ہے۔ وضع داری کا یہ عالم ہے کہ ایک بار جس سے تعلق استوار ہوا، ہمیشہ کے لیے استوار ہو گیا۔ اس سے ملیں نہ ملیں، اس کے حالات سے بے خبر نہیں ہوتے۔

خواجہ صاحب نے بہت پڑھا اور بہت کچھ ذہن میں محفوظ کر رکھا ہے۔ ان کا ذہن ایک قسم کا خزانہ عامرہ ہے، جس میں آئے دن نوادرات جمع ہوتے رہتے ہیں۔ ان نوادرات کی نمائش نہیں کرتے، ان سے

کام ضرور لے لیتے ہیں۔

مرحوم ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ایک مضمون میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرۂ اشعراء "گلشن بے خار" کی جی بھر کر تنقیص کی اور پھر ایک اور نام سے اپنے مضمون کی تحسین بھی کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کو کیا خبر تھی کہ کراچی میں ایک ایسی نگاہ بھی ہے جو ان کے اصلی اور نقلی نام پہچانتی ہے اور یہ مشفق خواجہ کی تھی۔ خواجہ صاحب نے نہ جانے کن کن اجزا کی شیرازہ بندی کر کے ایسا مضمون لکھا کہ ساری ڈھکی چھپی باتیں منظر عام پر آ گئیں۔

خواجہ صاحب نے داخلی شہادتوں کی بنا پر ثابت کر دیا کہ مضمون کی تحسین کرنے والے خود ڈاکٹر صاحب ہی ہیں اگرچہ انہوں نے اپنے چہرے کو ایک فرضی نام کی دبیز نقاب سے چھپا رکھا ہے۔

مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد ان کی ذات و صفات کے بارے میں سینکڑوں مضامین لکھے گئے مگر خواجہ صاحب نے ایک مختصر سا مضمون لکھا اور مولوی صاحب کی زندگی کا ایک نیا گوشہ لوگوں کے سامنے آ گیا انہوں نے ثابت کیا کہ بابائے اردو کے اندر ایک شریر بچہ بھی سانس لیتا رہتا تھا اور مثال یہ دی:

"ایک بار مولوی صاحب کے ہاں ایک مہمان آیا۔ یہ مہمان جب صبح سویرے جاگتا تو یہ دیکھ کر حیران و پریشان رہ جاتا کہ اس کا جوتا جسے اس نے کمرے کے باہر اتارا تھا، اس کے تکیے کے پاس پڑا ہے۔

یہ معاملہ ایک معمہ بن گیا۔ مشفق خواجہ نے واقعہ لکھتے ہوئے اسے یوں ایک ڈرامائی موڑ دیا:

"اس دن جوتا حسب معمول مہمان کے تکیے پر پڑا تھا اور مولوی صاحب جلدی جلدی کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔"

میں پچھلی مرتبہ کراچی گیا تو خواجہ صاحب نے میرے اعزاز میں کراچی کے بیشتر ادیبوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ کھانے متنوع قسم کے تھے اور نہایت لذیذ۔ میرا خیال تھا خواجہ صاحب نے کھانے تیار کرنے کے لیے کراچی کے کسی مشہور باورچی کی خدمات حاصل کی ہوں گی مگر جب انہوں نے بتایا کہ یہ آمنہ نے تیار کیے ہیں، تو میں حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ آمنہ بھابی جو اپنی تدریسی مصروفیات کے ساتھ گھر کے سارے انتظامی امور بھی قابو میں رکھتی ہیں، اتنے رنگا رنگ اور مزے دار کھانے تیار کر لیں گی۔

وہ واقعہ تو تھا ہی حیرت انگیز، اس کے علاوہ بھی ایک اور واقعہ ایسا ہوا جس سے میں حیران ہو گیا۔ ہم یعنی مشفق خواجہ کے مہمان طرح طرح کے کھانے کھا رہے تھے۔ اس سے میں نے دیکھا کہ خواجہ صاحب کے سامنے سادہ روٹی سالن رکھا ہے۔

پوچھا "خواجہ صاحب! آپ ہم سے الگ تھلگ کیوں ہیں؟"

بولے "الگ تھلگ مطلق نہیں، وزن بڑھ رہا تھا...... اس لیے......؟"

عرض کیا "خواجہ صاحب! ہر دور میں ایک مہاتما ہوتا ہے۔ آپ کے قریبی دور میں بھی ایک مہاتما بکری کا دودھ پی کر گزارہ کر لیتا تھا۔ آپ بھی یہ خوراک کھا کر شاید اپنی مہاتمائی ثابت کر رہے ہیں۔"

بولے "میں بکری کا دودھ پینے والا مہاتما نہیں اور نہ بھی بننا چاہتا ہوں۔ لذیذ کھانے پسند کرتا ہوں، یہ محض عارضی وقفہ ہے۔"

خواجہ صاحب کشمیری نسل کے موروثی حسن و وجاہت سے بہرہ مند اور خوش ذوق بھی ہیں۔ ان کے ہاں جاؤ تو ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں گی۔ کمرے میں زیادہ گنجائش نہیں مگر کتابوں کو انہوں نے اس طرح مختلف جگہوں پر ترتیب دیا ہے کہ بے ترتیبی کا گمان نہیں ہوتا، لگتا ہے کتابیں ترتیب بلکہ حسن ترتیب کے ساتھ پہلے رکھی گئیں اور بعد میں ان کے پیچھے دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ خواجہ صاحب کتابوں کے لین دین کے معاملے میں کسی صاحب خرد کے اس حکیمانہ قول کو ہمیشہ مد نظر رکھتے ہیں "کسی کو کتاب دینا حماقت ہے اور کتاب کی واپسی کی امید رکھنا مزید حماقت۔"

ان کے پاس بے شمار کتابیں ہیں، ایسی بھی جنہیں چرانے کا جرم میں بھی بصد مسرت کر سکتا ہوں مگر خواجہ صاحب اپنے مہمان کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتے۔ ایک بار میں نے ان سے کسی کی سوانح عمری مستعار مانگی۔ بار بار لکھا مگر خواجہ صاحب اس مطالبے کو بڑی خوش اسلوبی سے گول کر گئے "کتابوں میں نہ جانے کہاں گم ہو گئی ہے۔ ذرا فراغت میسر ہو تو ڈھونڈوں گا۔" اور خواجہ صاحب کو یہ فراغت آج تک نصیب نہ ہو سکی۔

خواجہ صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ایک مرتبہ رات کو شان الحق حقی کے ہاں مشاعرہ تھا۔ صدارت میرے حصے میں آئی۔ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ شاعر آتے، جاتے رہے۔ اچانک ایک بلند آواز میری سماعت سے ٹکرائی "حقی صاحب! میرزا صاحب سے بھی پڑھیے۔"

سامنے دیکھتا ہوں تو خواجہ صاحب کھڑے ہیں، میں نے معذرت کر لی۔ مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے خواجہ صاحب سے پوچھا "خواجہ صاحب! یہ آپ کو کیا سوجھی، آپ جانتے ہیں میں شعر نہیں کہتا۔"

بولے "اور آپ کو یہ کیا سوجھی کہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ آپ کو ہوش میں لانے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا ورنہ اچھا خاصا تماشا بن جاتے۔"

خواجہ صاحب دوستوں کے دوست ہیں۔ بہت محبت اور تواضع کرنے والے مگر اپنے اصولوں کے بھی پکے ہیں۔ کسی کی محبت انہیں اصول شکنی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ جمیل الدین عالی سے خواجہ صاحب کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے ہیں۔ جس زمانے میں عالی صاحب رائٹرز گلڈ کے کرتا دھرتا تھے، انہوں نے خواجہ صاحب کو گلڈ کا رکن بننے کے لیے اصرار کیا۔ خواجہ صاحب کسی بھی تنظیم میں، ادبی ہو یا غیر ادبی، شامل ہونا نہیں چاہتے، اسی لیے طرح دے گئے۔ اس طرح وہ کتابوں

پر انعامات لینا بھی پسند نہیں کرتے۔ جائزہ مخطوطات اردو، ان کا قابل فخر کارنامہ ہے۔ داؤد ادبی انعام کے ججوں نے جن میں میں بھی شامل تھا، متفقہ طور پر اس کتاب کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا۔ مجھے بڑی خوشی تھی کہ ان کی کتاب کو نوازا گیا۔ انہیں مبارکباد کا تار بھیجا، خط بھی لکھ دیا۔ دوسرے دن اخبار میں کیا دیکھتا ہوں کہ خواجہ صاحب نے یہ اعزاز لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے لکھا "میں نے اپنی کتاب انعام کے لیے بھیجی ہی نہیں تھی۔ میں انعامات کے قابل نہیں ہوں۔"

ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق خواجہ دونوں میرے بہت پیارے اور اچھے دوست ہیں۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ دونوں میں کئی مشترکہ خوبیاں موجود ہیں۔ دونوں محقق اور غزل گو ہیں اور خوبصورت غزل کہتے ہیں۔ ان کے ہاں مزاح نگاری کم اور چھیڑ چھاڑ زیادہ ہوتی ہے۔ لطف کی بات یہ کہ دونوں فرضی ناموں کی نقاب پہن کر یہ شغل کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں یبوست زدہ انداز بیان کے بجائے شعریت اور تروتازگی ہوتی ہے۔ دونوں کو تصویر بنانے کا شوق ہے۔ یاروں کی محفلوں میں عموماً کیمرہ بدست نظر آتے ہیں۔ مجھے ان میں اتنی ذہنی اور جسمانی مشابہت محسوس ہوتی ہے کہ سوچتا ہوں، اگر ڈاکٹر وحید قریشی جسمانی طور پر اس درجہ وسعت پذیر نہ ہوتے، تو مشفق خواجہ ہوتے اور اگر خواجہ صاحب بے دریغ پھیل جاتے تو ڈاکٹر وحید قریشی بن جاتے۔

اب کچھ ذکر آمنہ بھابی کا بھی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ حقیقی معنوں میں مشفق خواجہ کی رفیقہ ہیں۔ گھر کے علاوہ خود خواجہ صاحب کو بھی بنانے سنوارنے میں ان کا بڑا اہم حصہ ہے۔ خواجہ صاحب مخطوطات اور بوسیدہ قلمی نسخوں کی جانچ پڑتال کرتے رہتے ہیں اور گھر کی ساری دیکھ بھال آمنہ کرتی ہیں۔ وہ اپنے منصبی فرائض بھی ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتیں۔ میاں بیوی میں اس قدر محبت ہے کہ لگتا ہے دونوں ابھی ابھی ماہ عسل منا کر لوٹے ہیں...... دراں حالانکہ دونوں اٹھارہ سال سے شادی کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔

(بحوالہ: "اردو ڈائجسٹ" اپریل ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں

مشفق خواجہ...... ایک گوشہ نشین عالم

میں نے "مظفر علی سید" پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتے ہوئے ان کے ۶۰ تنقیدی مضامین کو ڈھونڈا اور ان کا مطالعہ کیا۔

اس مطالعے کے دوران، میں نے محسوس کیا وہ بہت کم ادیبوں اور شاعروں کے لیے ستائشی لہجہ اختیار کرتے تھے اور چند خوبیاں ایسی تھیں جنہیں وہ بے حد سراہتے تھے۔ مثلاً انہیں مجید امجد اور حفیظ ہوشیار پوری اس لیے بے حد پسند تھے کہ ان دونوں کو نمود و نمائش سے مطلب نہ تھا۔ خود مظفر علی سید کا عمومی رویہ بھی رہا کہ بس اپنے حصے کا کام دیانت داری سے کرتے رہے باقی چرچا، شہرت و نمود کی خواہش ان کے ادبی مسلک میں شامل نہ تھی۔ ان کے گہرے دوست اور پیر و مرشد جناب مشفق خواجہ ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے پوری زندگی کتاب اور قلم تھیلے کو دی اور اس کے بدلے میں چاہا کچھ بھی نہیں۔ کتاب کے ساتھ ایسی کمٹ منٹ نہ کسی نے دیکھی ہوگی نہ سنی۔

جناب مشفق خواجہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کراچی میں ناظم آباد کے علاقے میں گزارا۔ جہاں ایک مختصر سے کمرے میں ان کا قیام تھا۔ مکان کے باقی حصے میں صرف کتابیں قناعت اور درویشی کی ایسی مثال ملنا فی زمانہ مفقود ہے۔ کسی ادبی محفل میں نہ جاتے نہ جانا پسند کرتے۔ لیکن ادیب، شاعر اور ادب کے عام طالب علم جوق در جوق ان کی طرف کھنچے چلے آتے۔ وہ بھی انہیں خوش آمدید کہتے، کیوں کہ عالم کبھی بخیل نہیں ہوتا۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۹۶ء میں اس وقت ہوئی جب میں "ڈاکٹر محمد احسن فاروقی" پر اپنا ایم فل کا مقالہ لکھ رہی تھی۔ جتنی فراخدلی سے انہوں نے مجھے کتابوں، مضامین اور قیمتی مشوروں سے نوازا، وہ قابل تقلید و ستائش ہے۔ پھر مظفر علی سید کے ضمن میں ان سے اپنی ذاتی مراسلت کا سارا حصہ مجھے عطا کیا۔ ہر اتوار کو ان کے اس مختصر سے کمرے میں ادبی کچہری منعقد ہوتی تھی۔ جس میں مقامی ادیبوں کے علاوہ اس وقت شہر میں موجود دیگر علاقوں سے آئے ہوئے نامور ادیب و شاعر شرکت کرتے تھے۔ وہ علم و فیض کا ایک منبع تھے جس سے ہر ایک نے استفادہ کیا، اس سے بڑھ کر کسی کی اچھائی اور کیا ہوگی۔

"خامہ بگوش" کے قلمی نام سے فکاہی کالم نگاری ان کی پہچان کا معتبر حوالہ بنی۔ وہ قلم سے تلوار کا کام لینا جانتے تھے۔ چوں کہ خود ان کے کام میں خامی ڈھونڈ نکالنا ممکن نہ تھا، کسی عہدے اور اعزاز کے وہ امیدوار نہ تھے، اس لیے حق بات کہنے سے انہیں خوف نہ تھا۔ بیسویں صدی کے آخری ربع میں فکاہیہ کالم

نگاری کی تاریخ میں ایک خوبصورت کالم نویس کا اضافہ ہوا۔ "سخن در سخن" کے عنوان سے مشفق خواجہ نے لکھنا شروع کیا۔ ان کا موضوع ادب، ادیب اور ادبی دنیا تھا، کیوں کہ دراصل یہی ان کی اپنی دنیا تھی۔ خالص ادبی ناہمواریوں کو ان سے پہلے کسی کالم نگار نے باقاعدہ موضوع نہیں بنایا۔ ان کے کالموں کا انتخاب "خامہ بگوش کے قلم سے" ۱۹۹۵ء میں "سخن در سخن" اور "سخن ہائے ناگفتنی" ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔

تمام کتابوں میں شامل کالموں کا انتخاب مظفر علی سید نے کیا تھا اور دیباچہ بھی انہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنا مظفر علی سید اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

"کہتے ہیں کہ زندگی میں ایک جیسی خوشی خال خال ہی دوبارہ نصیب ہوتی ہے جب کہ ملتے جلتے مصائب بار بار پیش آتے رہتے ہیں۔ چناں چہ خامہ بگوش کے کالم منتخب کرنے کا مزید ایک موقع، مرتب کے لیے، اس شیرینی دیگر کی طرح پرکشش ہے جو شکر کے حریص (یا مریض) کے سامنے رکھ دی گئی ہو"۔ (انتخاب از دیباچہ "سخن ہائے ناگفتنی")

مشفق خواجہ کی ادبی حیثیت ایک محقق کی تھی وہ تحقیق میں مولوی عبدالحق کے پیروکار تھے۔ مخطوطہ شناسی اور ادبی نوادرات کی تلاش اور پرکھ ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی ادبی تحقیق کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ میر اور یگانہ کے انتخابات بھی ان کی ادبی خدمات میں شامل ہیں۔ بالخصوص یگانہ کا انتخاب انہوں نے بڑی محنت اور تحقیق کے بعد کیا جو اب مستند حوالے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انہیں ان ادبی خدمات پر تمغہ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ بے شک ان کا ادبی مقام و مرتبہ اس سے زیادہ کا مستحق تھا۔ وہ ایک صائب الرائے عالم، منفرد محقق اور وسیع مطالعے کے مالک تھے۔ اور اس نسل کے نمائندہ تھے جو اپنی تہذیب و ثقافت سے جڑے رہنے کے علاوہ اس کا بھرپور شعور بھی رکھتے تھے، افسوس یہ تہذیبی ورثہ آئندہ نسل کو منتقل نہیں ہو سکا۔ خواجہ صاحب جس نسل سے تعلق رکھتے تھے اس نے اپنی بھرپور توانائیاں اور بہترین دماغی صلاحیتیں ادب کے لیے وقف کر رکھی تھیں، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ انسانی ذہنی و تہذیبی ارتقا میں ادب نے کیا کردار انجام دیا ہے اور اس سے کیا اہم کام لیے جا سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے لیے ادب تفریح یا مقصد نہ تھا بلکہ طرزِ زندگی اور طریقِ حیات تھا۔ یہی ان کی انفرادیت تھی، بہ
اب:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ان کے ادبی کام وہ اہم وسیلہ بنے رہے جن کی مدد سے ادبی ماحول اور دنیا کو سمجھنے اور تازہ ترین جاننے میں مدد ملتی رہی۔ ان کے فکاہیہ کالموں سے اردو مزاح کی گود ہری ہو گئی اور بڑے بڑوں کی طبیعت بھی۔ معنوی لحاظ سے ان کے کالموں میں سوچ کا پہلو نمایاں رہتا تھا۔ درحقیقت وہ ادب لکھتے، پڑھتے اور سوچتے تھے اس کو بنانے سنوارنے کے لیے کوشاں رہتے۔ ان کے سخت تنقیدی تبصرے تخلیق کاروں کو بھٹکنے سے بچاتے اور معاصر ادب کو جاننے میں معاون ثابت ہوتے تھے۔ ان پر تنقیدی شعور کی پختگی اور مطالعے

ومشاہدے کی وسعت قابل رشک تھی اور ان تمام خوبیوں سے بڑھ کر حق بات کہنے کی جرات و ہمت قابل تقلید کہی جا سکتی ہے۔ وہ روایتی ادب پرستی کے خلاف تھے اور ادیبوں کی جھوٹی خود پسندی کا پول کھولنے والے بھی۔ اس لحاظ سے وہ ادبی میدان کے مجاہد تھے اور یہ علمی و ادبی جہاد ہر باشعور اور باضمیر پر فرض ہے۔

فنی لحاظ سے ان کے کالم اسلوب کی شگفتگی اور تازگی کا نمونہ ہیں ان کا ایک ایک جملہ معنوی وسعت کا حامل ہے۔ وہ مختصر مگر جامع لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں جاندار اسلوب کو بڑا دخل تھا۔ وہ فنکار کی توصیف سے بات شروع کرتے اور پھر آہستہ آہستہ جملوں کی بنت اور ساخت نیا روپ اختیار کر لیتی اور ہجویہ حصہ شروع ہو جاتا۔ اور قاری اس گریز کو سمجھتے سمجھتے کسی اور جہاں میں پہنچ جاتا۔ امیر خسرو کی کہہ مکرنیوں کا سا یہ انداز ان کی تحریر کی اصل روح ہے۔ اشعار کا برمحل استعمال، ضرب الامثال، نادر تشبیہات اور بات سے بات پیدا کرنے میں خواجہ صاحب کا کوئی ثانی نہ تھا۔ حالاں کہ ان کے کالموں کا موضوع صرف ادب اور ادیب تھے، اس لحاظ سے ان کے موضوعات کی دنیا محدود تھی لیکن وہ اس محدود دنیا کے ایسے رنگ ڈھنگ سامنے لاتے تھے کہ ساری دنیا کا آئینہ نظر آنے لگتا تھا۔

مختلف ادبی تحاریک، دبستانوں یا رجحانات کی بات ہو یا پھر پاک و ہند کے ادیبوں کا تذکرہ، وہ ہر تصویر میں رنگ بھرنا جانتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے ادبی نظریے و مقصد کو سامنے لائے بغیر وہ بڑے بڑے بتوں کو توڑنے پر قادر تھے اسی وجہ سے انہیں قاری کی ہمنوائی بھی حاصل تھی۔

مشفق خواجہ بنیادی طور پر تنہائی پسند، گوشہ نشین انسان تھے۔ وہ تشہیری عناصر و عوامل سے دور رہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے محقق کو شہرت اخباری کالموں سے ملی، جو "جسارت" ہفت روزہ "تکبیر" اور ماہنامہ "کتاب نما" دہلی میں شائع ہو کر خواص و عوام سے داد تحسین حاصل کرتے رہے۔ اس طرح ان کی خاموشی زبان بن گئی اور ہر جگہ ان کے کاٹ دار جملے ضرب المثل کی حیثیت سے پڑھے، سنے اور بولے جانے لگے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ادیب و شاعر اب کتابیں اس چاٹ میں لکھ رہے ہیں کہ ان پر مشفق خواجہ سے کالم لکھوائیں، جب کہ عطاء الحق قاسمی کا خیال اس کے برعکس ہے ان کے نزدیک جن ادیبوں اور شاعروں کو خامہ بگوش نے اب تک اپنا موضوع نہیں بنایا انہوں نے کلمہ شکر ادا کیا ہے کہ وہ بچ گئے۔ اچھی تنقیدی رائے کی اہمیت و حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اسے پڑھ کر لوگ اصل کتاب پڑھنے کی طرف راغب ہوں۔ اس لحاظ سے خامہ بگوش کی رائے قابل قدر ہے کیوں کہ ان کے کالموں میں جن ادیبوں اور کتابوں کو موضوع بنایا جاتا ان کو پڑھنے کا اشتیاق ہر قاری کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ان کے کالموں کی کاٹ میں کئی لوگ تلخی محسوس کرتے تھے۔ حالاں کہ مشفق خواجہ کی دردمندی، جرات اور بے باکی کو تلخی سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ انہیں کسی فرد سے دشمنی نہ تھی بلکہ اس تلخی میں دوستی اور دردمندی کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح طب قدیم میں کڑوے قہوے اس لیے پلائے جاتے تھے کہ جسم کے فاسد اور گندے مادوں کو ختم کیا جا سکے بالکل اسی طرح خامہ بگوش کی کڑواہٹ میں دردمندی کی مٹھاس

پوشیدہ تھی۔ وہ ادب کے جسم سے فاسد مادوں کا خاتمہ چاہتے تھے اس سلسلے میں ان کی نیت پر شک کرنا عاقبت نااندیشی ہے۔

وہ "بت ساز" نہ تھے "بت شکن" تھے۔ عام مشاہدہ ہے کہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقی توانائی ایک دو تصانیف کے بعد باقی نہیں رہتی لیکن ناقدین، لحاظ، مروت، ادب اور مرتبے کا خیال رکھتے ہوئے اس بت کو پوجتے رہتے ہیں اور اس کی کمزوریوں کی نشاندہی نہیں کر پاتے۔ اس غلط روایت کو خواجہ صاحب ختم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کے قلم کا نشتر خوب کام آیا۔

آج ہمارا ادب اور ادیب سستی شہرت، نام و نمود کی خواہش اور گروہ بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں ایسی صورت حال میں خواجہ صاحب کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن اللہ کی مرضی کے سامنے ہم سب بے بس ہیں۔ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو مختصر علالت کے بعد وہ کراچی کے آغا خان ہسپتال میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات پر ادبی دنیا کا ہر دل اداس اور ہر آنکھ پرنم ہے۔ ان کی کتب کا ایک بڑا اور نادر ذخیرہ ان کی واحد کل کائنات تھا اور وہ مختصر سا کمرہ جہاں ہر طرف کتابیں اور رسالے ہی ہیں مگر حیران ہیں کہ ہمارا پرانا رفیق کہاں چلا گیا۔

(بحوالہ: قومی زبان، مارچ ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر طاہر مسعود

مشفق خواجہ...... چند تاثرات

6610648 خواجہ صاحب کا فون نمبر تھا۔ میں اس نمبر پر انہیں ہفتے میں ایک بار ضرور فون کیا کرتا تھا۔ وہ ریسیور اٹھاتے ہی کہتے۔ "فرمایئے" انہوں نے کبھی "ہیلو" نہیں کہا کہ آپ کون بول رہے ہیں اور آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔ یہ ان کی تہذیب تھی کہ مخاطب کے لیے انہوں نے ایسا لفظ چنا تھا جس میں اپنائیت بھی تھی، خلوص بھی تھا اور کسی قدر آشنائی بھی۔ جس شب ان کا انتقال ہوا اس کی اگلی صبح میں نے اس نمبر کو ڈائل کیا، گھنٹی بجتی رہی، کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب میں ریسیور پہ "فرمایئے" کا لفظ کبھی نہیں سن سکوں گا۔ اخبار میں ان کے انتقال کی خبر شائع ہو چکی تھی اور خواجہ صاحب اس دنیا سے جا چکے تھے۔ اس فانی دنیا سے جہاں سے آخر کار سب کو جانا ہے، جانے والے کے ساتھ کوئی نہیں جاتا۔ المیہ یہ ہے کہ اسے جانے والے کی یادوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے اور جانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

مشفق خواجہ اردو کی علمی و ادبی دنیا کے بہت بڑے محقق، بہت اچھے شاعر، کالم نگار، طناز اور انتہائی وسیع المطالعہ اسکالر تھے۔ ساتھ ہی وہ ایک بے حد وسیع المشرب اور وسیع اطلاقات انسان بھی تھے۔ پاکستان و ہندوستان میں ادیبوں اور محققوں سے ان کے تعلقات کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ ہندوستان، انگلستان، امریکہ، کینیڈا، مشرق وسطیٰ سے جو بھی ادیب اور دانشور آتا وہ مشفق خواجہ کو پوچھتا ہوا آتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر تحقیق کی دنیا کے آدمی تھے لیکن تخلیق سے بھی ان کا رشتہ گہرے طور پر استوار تھا۔ خود شاعر تھے۔ "ابیات" میں ان کے کلام کے نہایت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان کی کالم نگاری سے بھی ان کی تخلیق کے جوہر کھلتے ہیں۔ انہوں نے بڑے تخلیقی انداز کے کالم لکھے ہیں۔ اس کے لیے وہ بڑی محنت کرتے تھے۔ ادیبوں کو پڑھتے اور نہایت محنت سے ان کی غلطیوں اور مختلف پہلوؤں کی اپنے مخصوص انداز میں نشاندہی کرتے تھے۔ ان کی زندگی نظم و ضبط کی مضبوط زنجیر میں بندھی ہوئی تھی۔ وہ ادبی تقریبات وغیرہ میں نہیں جاتے تھے۔ اپنے گھر میں گوشہ نشین رہنا ان کی زندگی کے برسہا برس کا معمول تھا لیکن وہ مردم بیزار ہرگز نہ تھے۔ اپنے دوستوں کے حلقے میں وہ خوب چہکتے تھے اور اپنی جملے بازی سے محفل سرگرم اور بارونق بنائے رکھتے تھے۔ ٹیلیفون سے باہر کی دنیا سے ان کا تعلق بحال تھا۔ ڈاک اور ٹیلیفون کے ذریعے وہ ادبی دنیا کی صورت حال سے جتنے باخبر تھے اس کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ وہ کل وقتی ادیب تھے۔ پڑھنا لکھنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انہیں کئی علمی اداروں کے اعلیٰ مناصب کی پیش کشیں

ہوئیں لیکن انہوں نے ہمیشہ معذرت کر لی۔ وہ اپنی آزادی کو کسی قیمت پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے مختصر مدت کے لیے انجمن ترقی اردو سے وابستگی اختیار کی لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ اس کی ذمے داریاں ان کے لکھنے پڑھنے کے کام میں حارج ہو رہی ہیں تو انہوں نے وہاں سے بھی استعفا دے دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے گھر میں رہ کر وہ انجمن کے معاملات میں دخیل رہے اور اس کے علمی کاموں کی نگرانی ورہنمائی کرتے رہے۔

خواجہ صاحب کو وقتی شہرت اور نام ونمود کے حصول سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں میں پیش کشوں کے باوجود کبھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان چیزوں میں پڑ کر وقت ہی ضائع نہیں ہوتا خود آدمی بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے ریڈیو کے لیے سیکڑوں کی تعداد میں اسکرپٹس لکھے۔ "مسلمان سیاح" ان کا ایک پروگرام ساڑھے پانچ سال تک نشر ہوتا رہا۔ اس طرح انہوں نے دو سال تک ریڈیو کا مشہور پروگرام "دیکھتا چلا گیا" تحریر کیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ایک کالم "سنا آپ نے" روزانہ نشر ہوتا تھا۔ جنگی نغمے بھی لکھے لیکن یہ سارا تحریری کام انہوں نے گھر بیٹھ کے کیا اور کبھی ریڈیو کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا۔ وہ ابتدا میں اخبارات ورسائل وغیرہ کو انٹرویو دے دیا کرتے تھے۔ لیکن پھر اس سے بھی بیزار ہو گئے۔ ذاتی طور پر میرے علم میں ہے کہ متعدد اخبارات ورسائل کے صحافی حضرات ان سے انٹرویو کرنے کے لیے اصرار کرتے رہے لیکن انہوں نے ہمیشہ معذرت کی۔ شہرت سے ان کی بیزاری کا اندازہ اس سے لگایئے کہ "تخلیقی ادب" جسے وہ تن تنہا مرتب کیا کرتے تھے اس کے شماروں پر ان کا نام ہو مگر دو ناموں کے ساتھ آخر میں اس جگہ پر شائع ہوتا تھا جہاں کاتب کا نام شائع ہوتا ہے۔ اسی طرح یگانہ کی کلیات جس پر انہوں نے برسہا برس جان توڑ محنت کی تھی، جب یہ کلیات شائع ہوئی تو اس کے سرورق پر خواجہ صاحب کا نام نہیں تھا۔ ان کا نام کتاب کے اندرونی صفحات پر نہایت غیر نمایاں طریقے سے درج ہے۔ اسی طرح ان کے کالم جو اردو دنیا میں ان کی شہرت کا سبب بنے، یہ کالم رسائے واخبار میں بھی اور کتابی صورت میں بھی خامہ بگوش کے قلمی نام سے شائع ہوئے۔ بہت سے کالم نگار اس پہ حیرت کا اظہار کیا کرتے تھے کہ اتنے مقبول اور معیاری کالموں کو وہ اپنے نام سے منسوب کرنا کیوں پسند نہیں کرتے۔ اصل میں خواجہ صاحب اپنے آپ کو چھپا کر رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ جتنا اپنے آپ کو چھپاتے تھے، ان کا نام اور ان کی شخصیت اتنی ہی زیادہ ابھر ابھر کر سامنے آتی رہتی تھی۔ وہ شہرت سے جتنا دور بھاگتے تھے، شہرت اتنی ہی زیادہ ان کے تعاقب میں لگی رہتی تھی وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آدمی اپنے کام سے پہچانا جاتا ہے۔ لہٰذا اصل اہمیت کام کی ہے، نام میں کیا رکھا ہے۔ شیطان سے زیادہ مشہور کون ہو گا۔ آپ کتنی ہی کوشش کر لیجیے، شیطان سے زیادہ مشہور تو نہیں ہو سکتے۔

خواجہ صاحب میں بے پناہ انسانی خوبیاں تھیں۔

وہ ادیبوں، شاعروں اور محققوں کے صحیح معنوں میں سرپرست تھے۔ انہوں نے بے شمار ضرورت

مند ادیبوں کی مدد کی۔ مختلف اداروں سے ان کے لیے وظیفے لگوائے اور ان میں سے بعض کی تو انہوں نے اپنی جیب سے مدد کی۔ ان کے احسانات کا دائرہ ایک اور معنوں میں یوں بھی وسیع ہے کہ انہوں نے بہت سے ادیبوں اور محققوں کو بہ صد اصرار ادبی اور تحقیقی کام کی جانب راغب کیا۔ کسی سے خاکے لکھوائے، کسی سے کوئی کتاب مرتب کرائی، کسی سے خود نوشت لکھوائی۔ وہ بڑے مردم شناس تھے اور خوب پہچانتے تھے کہ کس ادیب یا محقق سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ صرف ادیبوں کو اسائنمنٹ دیتے تھے بلکہ ایک مشفق استاد کی طرح ہر طرح اس کی معاونت اور رہنمائی بھی کرتے تھے۔ تحقیق کے لیے کتابیں فراہم کرتے، کام کرنے کا طریقہ کار سمجھاتے اور پھر جب مسودہ مکمل ہو جاتا تو اس کا مطالعہ کر کے اس کی غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ خواجہ صاحب کو کتابوں کے نام رکھنے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ لہٰذا بہت سے ادیبوں کی کتابوں کے نام خواجہ صاحب نے تجویز کیے۔ میری دو کتابیں "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" اور "اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ" کے نام انہوں نے ہی تجویز کیے۔

خواجہ صاحب گھر سے مشکل ہی سے نکلتے تھے۔ سوائے شام کی سیر کے جوان کا معمول تھا۔ لیکن کسی دوست کی بیماری کی خبر سن لیتے تو اس کی عیادت کو پہنچتے، کسی کا انتقال ہو جاتا تو اس کی آخری رسومات میں لازماً شریک ہوتے۔ شادی بیاہ کی تقریبات کی دعوتوں کو بھی وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ خوشی اور غمی کے مواقع پر خواجہ صاحب کو ہمیشہ شریک دیکھا گیا۔ ان میں ایسی انسانی خوبیاں تھیں جو ہمارے ادیبوں میں خال خال ملتی ہیں۔

وہ بہت زندہ دل، متواضع، مہمان نواز اور حلیم الطبع واقع ہوئے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ وقت کو قیمتی جانتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک معمول بنا رکھا تھا اور کوئی بھی موسم ہو اپنے معمولات پر کاربند رہتے تھے۔ چونکہ ان کا بیشتر وقت گھر ہی پر گزرتا تھا جو ان کا گھر بھی تھا اور دفتر بھی۔ اس لیے لوگ وقت طے کیے بغیر ہی ان کی رہائش گاہ پر جا دھمکتے تھے جس سے ان کا وقت ضائع ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دروازے پہ چٹ لگا دی۔

اس سرا میں نہیں قیام بہت
زندگی مختصر ہے کام بہت

اس مہذبانہ انتباہ نے جب کوئی اثر نہیں دکھایا تو چٹ بدل دی۔

"از راہ کرم پیشگی اطلاع کے بغیر زحمت نہ فرمائیں"

لیکن اس کے باوجود اگر کوئی پہنچ جاتا تو وہ خندہ پیشانی سے ملتے تھے لیکن اس کو وہ معمول بنانے کی اجازت نہیں دیتے تھے چنانچہ ایک عزیز دوست نے اطلاع کیے بغیر ان کے پاس جانے کا سلسلہ جاری رکھا تو صاف لفظوں میں انہیں سمجھا دیا گیا کہ اگر آپ اس طرح ملنا چاہیں گے تو میرے لیے تعلقات کو استوار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کے عزیز دوست ناراض ہو گئے اور ان کے گھر آنا جانا موقوف کر

دیا۔ وہ اپنی نظم وضبط کی زندگی کو تباہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے اور بلاشبہ اس معاملے میں ان کا طرزِ عمل درست تھا اور وہ اس میں حق بجانب تھے۔

ان کی زندگی کا سب سے پراسرار معاملہ ان کی یافت کا تھا۔ اکثر لوگ پوچھتے تھے کہ خواجہ صاحب کا ذریعہ روزگار کیا ہے۔ وہ کوئی ملازمت وغیرہ تو کرتے نہیں ہیں پھر ان کا خرچ کیسے چلتا ہے اور وہ اتنے شاہانہ انداز میں زندگی کیسے گزارتے ہیں۔ جو ادیب ان کے کالموں کے ڈسے ہوئے تھے انہوں نے یہ بھی مشہور کرنے کی کوشش کی کہ خواجہ صاحب سی آئی اے کے پے رول پہ ہیں۔ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ والد مرحوم کی طرف سے جو کچھ انہیں ملا تھا اسے انہوں نے فکسڈ ڈپازٹ کرا دیا تھا۔ وہ شیئرز خریدتے رہتے تھے، مکتبہ اسلوب سے بھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ ان کی کالم نگاری کا بھی انہیں معاوضہ ملتا تھا۔ (لیکن جسارت چھوڑ کر جب محمد صلاح الدین شہید نے "تکبیر" نکالا تو اس میں لکھنے کا انہوں نے کوئی معاوضہ نہیں لیا) پھر یہ کہ ان پہ کوئی لمبی چوڑی ذمہ داری بھی نہیں تھی۔ ایک بیوی تھیں، وہ بھی برسرِ روزگار۔ خواجہ صاحب لاولد تھے اور اس کا انہیں قلق رہتا تھا۔ گو کبھی اس کا اظہار انہوں نے نہیں کیا لیکن دو باتوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کو فوٹوگرافی کا شوق تھا اور ادیبوں کے علاوہ بچوں کی تصویریں اتارنے کے شوقین تھے۔ چنانچہ ان کے پاس ادیبوں کے علاوہ بچوں کی تصویروں کا بھی ایک وسیع ذخیرہ تھا۔ میرے نزدیک یہ لاولد ہونے کی حسرت کی تسکین کا ایک ذریعہ تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے بڑے تاسف سے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میری اولاد ہوتی تو میری زندگی کا یہ انداز نہیں ہوتا۔

وہ بڑے مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ دلی یا لاہور یا کسی بھی شہر سے کوئی بھی مہمان آتا تو وہ گلشن والے گھر میں یا پنک پینتھر ریسٹورنٹ میں اس کی شاندار دعوت کرتے اور شہر کے منتخب ادیبوں کو جمع کر لیتے۔ وہ ان ادیبوں کی تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ کوئی ہندوستانی ادیب کتابیں خریدنا چاہتا تو وہ اپنی جیب سے اسے کتابیں خرید کر فراہم کرتے۔ اس پیشکش کا بعض ادیب ناجائز فائدہ بھی اٹھا لیتے اور کثرت سے کتابوں کی فرمائش کر ڈالتے۔ یا ہندوستان سے کسی ادیب کی کسی کتاب کے لیے درخواست آجاتی تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتے۔ ان باتوں پہ وہ بے دریغ رقم خرچ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ پاکستان ہندوستان کے ایک سو سے زائد ادیب، شعراء و محققین ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں کو ان کے نام معنون کیا۔ شاید ہی کسی ادیب کے نام اتنی کتابیں انتساب کی گئی ہوں۔ جب وہ ہندوستان گئے تو مکتبہ جامعہ کے شاہد علی خان نے ان کے قیام کے دوران ہی ان پر ایک کتاب مرتب کر کے شائع کر دی۔ یہ پذیرائی بھی خواجہ صاحب ہی کے حصے میں آئی۔

خواجہ صاحب کی کن کن خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ یہ تو ایک چلتا ہوا مضمون ہے، جس میں ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں کا ذکر عجلت میں کر دیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خواجہ صاحب کی تحقیقی، تخلیقی اور صحافتی خدمات پر مبسوط طریقے سے کام کیا جائے اور یہ دکھایا جائے کہ حقیقتاً ان کے کارنامے کیا

ہیں تبھی ہمیں اندازہ ہو سکے گا کہ کیسا قیمتی اور نادرِ روزگار آدمی ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

(۳)

مشفق خواجہ کا شمار ان شخصیات میں ہوتا ہے جو اپنی زندگی میں ادارے کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ہر چند کہ وہ اپنے گوشہ عافیت میں خود کو مطمئن اور مسرور پاتے تھے اور مشکل ہی سے کہیں آتے جاتے تھے لیکن اس کے باوجود ادبی اور علمی دنیا سے ان کا رابطہ نہ صرف بحال بلکہ مستحکم و مضبوط تھا۔ پاکستان و ہندوستان کے اکثر ادیبوں سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور وہ ان میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ان کی فکاہیہ کالم نگاری تھی۔ اس نوع کی ادبی کالم نگاری کے وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اکثر ادیب اس بات کے خواہاں رہتے تھے کہ خواجہ صاحب ان کی کتاب پر تبصرہ لکھیں اور جب خواجہ صاحب لکھتے تھے تو کتاب کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح نمایاں کرتے تھے کہ ادیب موصوف کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے تھے۔ وہ لکھنے کے معاملے میں کسی رو رعایت کے قائل نہ تھے۔ کالم لکھنے کے لیے انتہائی محنت کرتے تھے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کو غور اور توجہ سے پڑھتے، اس کے قابلِ تبصرہ حصوں کو نشان زد کرتے۔ پھر کالم کا ایک رف ڈرافٹ تیار کرتے اور پھر اسے صاف کرتے۔ دوسری مرتبہ نقل کرنے میں اکثر کالم بالکل بدل جاتا۔ جب وہ اپنے کالموں کا مجموعہ مرتب کر رہے تھے تو میں نے خود دیکھا کہ وہ پرانے کالموں کی قطع و برید میں لگے ہوئے ہیں اور پیراگراف نئے لکھ رہے ہیں۔ تحقیق ہو یا کالم نگاری وہ بنیادی طور پر Perfectionist تھے۔ چلتا ہوا کام کرنے کے عادی نہ تھے۔ یگانہ پہ جن دنوں وہ کام کر رہے تھے، میں ان کے تیار کردہ نوٹس دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ تحقیق کی تیاری کا ایک مثالی نمونہ تھا۔ یگانہ پہ انہوں نے برسہا برس تک کام کیا۔ اس کے لیے لائبریریوں کی لائبریریاں کھنگال ڈالیں۔ سیکڑوں رسالے جن میں یگانہ کا کلام یا مضمون چھپتا تھا، دیکھ ڈالے۔ ایک مرتبہ مجھے فٹ پاتھ سے دو قدیم رسالے ملے جن میں یگانہ کا کلام شائع ہوا تھا۔ مجھ سے وہ رسالے انہوں نے مانگ لیے۔ میں ان سے کہتا تھا کہ آپ اپنے موضوع پہ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں۔ اتنی محنت میں تو کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ وہ کہتے تھے۔ "مجھے معلوم ہے یگانہ اتنا بڑا شاعر نہیں ہے کہ اس پر اتنی محنت کی جائے لیکن میں دکھانا چاہتا ہوں کہ کسی پرانے شاعر کی کلیات کیسے مرتب کی جاتی ہے۔"

خواجہ صاحب سے میرے مراسم عرصہ پچیس سال پر محیط ہیں۔ اس عرصے میں میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا۔ ظاہر ہے وہ انسان تھے ان میں خامیاں بھی تھیں جیسے سب انسانوں میں ہوتی ہیں لیکن ان کی خوبیاں ان کی خامیوں پر حاوی تھیں۔ وہ بڑے ہمدرد اور انسان دوست واقع ہوئے تھے۔ بہت متواضع اور مستقل مزاج تھے۔ جن لوگوں پہ انہوں نے احسانات کیے، ان میں سے بعض نے انہیں نقصان بھی پہنچایا، لیکن خواجہ صاحب نے اس کا انتقام نہیں لیا۔ یہ ان کی بڑائی تھی۔ وہ کہتے تھے مجھے کسی سے کیا لینا دینا۔ میں اپنے گوشہ عافیت میں مگن ہوں۔ دنیا بھر سے کتابیں میرے پاس آتی ہیں۔ نئی نئی چیزیں پڑھنے

کو ملتی ہیں۔ مجھے ان ہی سے فرصت نہیں۔ میں کسی جھگڑے میں پڑ کر کیوں اپنا وقت ضائع کروں۔ جس روز ان پر ہارٹ اٹیک ہوا اس سے ایک دن قبل میری ان سے فون پر دیر تک گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کی صحت کا حال پوچھا تو انکساری سے بولے صحت تو اچھی ہے۔ سوچتا ہوں جب صحت اچھی تھی تو کون سا تیر مار لیا جواب اچھی نہیں رہی تو اس کا گلہ کروں۔

خواجہ صاحب کا زندگی بھر دو اداروں سے گہرا تعلق رہا۔ ایک انجمن ترقی اردو اور دوسرا ادارۂ یادگار غالب۔ ان دونوں اداروں کو انہوں نے اپنی زندگی کے بڑے قیمتی لمحات دیے اور ان کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ انجمن کے لیے تو میں نے انہیں بعض اوقات مضطرب بھی پایا۔ انجمن سے ان کا تعلق دیرینہ تھا۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ ۱۹۵۷ء میں مولوی عبدالحق مرحوم سے خواجہ صاحب کا تعارف یوں ہوا کہ وہ انجمن کے کتب خانے میں مطالعے کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ وہیں ایک دن مولوی صاحب نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آتے ہو؟ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ میں طالب علم ہوں اور مجھے قلمی کتابوں سے دلچسپی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ دو ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی قلمی نسخے سے اقتباسات انہوں نے نقل کرنے کے لیے دیے جب خواجہ صاحب نے اسے نقل کر دیا تو بولے۔ "حیرت ہے تم نے دکنی زبان کے مسودے کو بالکل صحیح صحیح پڑھ لیا۔" خواجہ صاحب نے کہا۔ "میں پنجابی ہوں اس وجہ سے اسے پڑھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ پنجابی اور دکنی زبان میں بڑی مشابہت ہے۔ اس لیے پنجابی جاننے والوں کے لیے دکنی زبان کو پڑھنا اور سمجھنا بہت آسان ہے۔"

اس کے بعد مولوی صاحب خواجہ صاحب کو مختلف کام دیتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ابن انشاء نے مولوی صاحب سے خواجہ صاحب کا باقاعدہ تعارف کرایا۔ ابن انشاء کے مولوی صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ ان ہی کے توسط سے خواجہ صاحب رسالہ "اردو" سے وابستہ ہوئے اور جب جامعہ کراچی سے فارغ التحصیل ہوئے تو مولوی صاحب نے ان کا انجمن میں باقاعدہ تقرر کر دیا۔ اس طرح خواجہ صاحب مولوی صاحب کی زندگی میں اس تاریخی ادارے سے ساڑھے چار سال تک منسلک رہے۔ بعد ازاں بھی وہ کسی نہ کسی طرح انجمن سے وابستہ رہے۔ اسی طرح ادارۂ یادگار غالب سے ان کی وابستگی بھی اٹوٹ تھی۔ ٹیلیفون پر مجھ سے آخری گفتگو میں وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ فاطمہ ثریا بجیا نے بعض اہل ثروت حضرات سے ادارے کو خاصی خطیر گرانٹ دلا دی ہے۔ ادارے سے نئی نئی کتابوں کی اشاعت کے منصوبے وہ خود بناتے تھے اور اس کے لیے بڑی محنت کیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب اپنے کتب خانے کے بارے میں بڑے فکر مند رہا کرتے تھے۔ ان دنوں جب نصیر ترابی جامعہ کراچی کے معاملات میں دخیل تھے ایک تجویز لے کر خواجہ صاحب کے پاس گئے تھے کہ جامعہ کراچی میں ایک نئی عمارت لائبریری کے لیے بنائی جائے جس میں آپ کا اور ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کا

کتب خانہ منتقل کر دیا جائے۔ خواجہ صاحب اس کے لیے تیار تھے لیکن پھر نصیر ترابی صاحب جامعہ کے معاملات سے الگ کر دیے گئے تو یہ تجویز، تجویز ہی رہ گئی۔

انہیں اپنا کتب خانہ تقریباً حفظ تھا۔ کون سی کتاب کہاں رکھی ہے وہ آسانی بتا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ادیبوں کے بارے میں بے انتہا معلومات جمع کر رکھی تھیں۔ مجھے اپنے انٹرویوز کی کتاب کے نئے ایڈیشن میں افسانے کے لیے جن ادیبوں کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی تاریخ وفات درکار تھی۔ لیکن یہ تاریخ وفات کہیں سے دستیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ خواجہ صاحب سے اس مشکل کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو جس کی تاریخ وفات چاہیے مل جائے گی۔ چنانچہ تقریباً ڈیڑھ درجن ادیبوں کی تاریخ وفات خواجہ صاحب نے منٹوں میں فراہم کر دی۔ اسی طرح دو ایک ادیبوں کے کوائف کی ضرورت پڑ گئی۔ وہ کوائف بھی خواجہ صاحب کے پاس موجود تھے۔ یہی نہیں کبھی کسی لفظ کے معنی جاننے کی ضرورت ہوتی، کسی شعر کا مطلب سمجھنا ہوتا، خواجہ صاحب کو صرف ایک فون کرنے کی دیر ہوتی تھی اور وہ مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔

وہ معلومات کا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اور ان کی زندگی نظم و ضبط کی مضبوط ڈور میں بندھی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں کبھی کسی کام کو ٹالتے ہوئے اور وقت کو ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

خواجہ صاحب ان لوگوں پر ہمیشہ افسوس کرتے تھے جو وقتی شہرت اور منصب کے پیچھے بھاگ کر اپنی آبرو کھو دیتے ہیں۔ ایسے ادیبوں کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے، اور نجی گفتگوؤں میں ان کی مذمت کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ادیب کے لیے ایک معنوں میں تارک الدنیا اور بے نیاز ہونا ضروری تھا۔ خواجہ صاحب خود بھی بے نیاز آدمی تھے۔ ہر چند کہ وہ اپنی ساری ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیتے تھے۔

خواجہ صاحب بڑے حاضر جواب، زندہ دل اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ میں نے انہیں کبھی مایوس نہیں دیکھا، لیکن عارضۂ قلب نے انہیں بہت ڈپریس کر دیا تھا۔ اپنی بیماری کے دوران انہوں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ "میری صحت یابی کے لیے دعا کیجیے۔"

جب وہ صحت یاب ہو گئے تو میں نے بیماری کے تجربے کے بارے میں دریافت کیا تو بولے۔ "نہایت خوفناک تجربہ رہا۔ لمبی سیاہ راتیں تھیں جو ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔"

ان کی بیماری پر میں پھولوں کا گلدستہ لے کر گیا۔ ایک دن بعد فون کیا تو بولے۔ "آپ کے لائے ہوئے پھول ابھی تک مہک رہے ہیں۔"

اظہار تشکر کا یہ انداز کتنا دل فریب اور خوش کن تھا۔

ذاتی طور پر میری زندگی پر ان کے بے شمار احسانات ہیں جن کا ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔ مجھے انہوں نے تحقیق کے کام پر لگایا۔ مولوی محبوب عالم کی نایاب کتاب "فہرست اخبارات ہند" میرے حوالے کی اور کہا کہ اسے ایڈٹ کر دو۔ پھر جب میں نے اسے ایڈٹ کیا تو پورا مسودہ پڑھا اور زبان و بیان کی اصلاح کی۔ جب میں پی ایچ ڈی کے تحقیقی مواد کے لیے ہندوستان جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو ہمدرد

فاؤنڈیشن کے ذریعے میرے ہندوستان جانے کا انتظام کرایا۔ ہندوستان میں عابد رضا بیدار اور دوسرے لوگوں کو خطوط لکھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کا احسان یہ بھی ہے کہ اعلیٰ حسب نسب والے خاندان میں میرا رشتہ کرایا۔ وہ میرے ہر معاملے میں دخیل تھے۔ جن دنوں مجھ پر تصوف کا دورہ پڑا ہوا تھا اور میں احباب سے کٹ گیا تھا، خواجہ صاحب نے ایک خط کے ذریعے میری عزلت گزینی پر گرفت کی اور مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔ اپنے مکتبے سے میری دو کتابیں شائع کیں اور پائی پائی کا حساب ادا کیا۔ ان احسانات کے بدلے میں ان کے لیے آخرت میں مغفرت کی دعا ہی کر سکتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا غالب کی طرح وہ نماز روزے سے دور تھے لیکن حقوق العباد کے معاملے میں وہ انتہائی مستعد تھے اور ذہنی اور قلبی طور پر سچے مسلمان تھے۔ حقوق العباد کے معاملے میں ان کی استقامت دیکھ کر مجھے امید ہے اور میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے باعث خود اس کے حقوق کی ادائیگی میں خواجہ صاحب سے جو کوتاہی رہ گئی ہے وہ اسے معاف کر دے گا، انہیں جنت کے باغوں میں سے کسی باغ میں داخل کر دے گا۔ یا اللہ تو ایسا ہی کر!

(بحوالہ قومی زبان، مارچ ۲۰۰۵ء)

رُوٹھ کر آپ نے اچھا نہ کیا

مشفق خواجہ صاحب پر تاثراتی مضمون ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۰ء

کیا معلوم تھا...... یہ چند تنگ زینے طے کرتے ہی ہم ایک کشادہ قلب شخصیت کے قصرِ شفقت میں داخل ہو جائیں گے۔ ایک ایک فٹ کا پٹ جسے دروازہ کہیے، فرضی بند تھا۔ سر سے اوپر دائیں پہلو پر نصب گھنٹی نے انگشت شہادت کے مہذبانہ دباؤ کو حسب توفیق شرف قبولیت بخشا اور بیک لہر دیوار و در سمیت صاحب مکان کو مطلع کیا کہ، اے خواجہ ادیب نواز کوئی پیاسا تیری بارگاہ میں آیا ہے۔ ٹیلی فون پر پہلے سے وقت طے تھا اور پہلی ملاقات کا مرحلہ درپیش...... ٹکٹ لگا کر نصف ملاقات بھی کبھی نہ کی تھی۔ ٹیلی فون بھی (اوائل ۱۹۸۸ء) سے پہلے نہیں کیا...... نہ وہ ٹیلی وژن پر آنے والوں میں، نہ ہم ٹی وی دیکھنے والوں میں۔

لاہور طویل عرصہ قیام کے دوران فقط نام سنا تھا۔ کاٹ دار جملوں کے حوالے سے۔ اس کے باوصف توفیق نہ ہوئی کہ موصوف کے کالم دیکھے جائیں اور جملے ادھر ادھر سے سننے کی بجائے براہ راست حظ اٹھایا جائے۔ ان کی کوئی تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری تھی کہ ہم مطالعے کے نہیں مشاعرے کی مخلوق بن کر رہ گئے تھے۔ ایک پہلو سے اچھا ہی ہوا، موصوف کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ بھلا چنگے تھے کہ یہ وہ ہستی ہے جس کے فقروں کی دھوم پوری اردو دنیا میں ہے۔

دوسری طرف ہماری فقط ادبی حیثیت تھی یعنی کوئی ادبی حیثیت نہ تھی۔ موصوف کا ایک جملہ ہم ایسوں کی مجملہ شہرت سے کہیں زیادہ مقبول و معروف۔ انتظار میں لحہ گزر رہو گا کہ ایک تیز جھونکا ہمارا حوصلہ بڑھا گیا، یعنی ایک پٹ ذرا سا کھول کر ہنستا ہوا نامعلوم سمت روانہ ہو گیا...... جب جانا کواڑ فرضی بند تھا۔ ہم نے دونوں پٹ آہستگی سے وا کیے، دیکھا، کم کشادہ زینے کی پہلی منزل تک کوئی در جن بھر ہوں گے، صعود اور سر پر ایک اور کواڑ جو مطلع کا مصرع ثانی تھا (اور اس کو وا کرنے والے کا ثانی آج بھی نہیں) دوبارہ گھنٹی کی سفارش کا خیال آیا ہی تھا، ہماری قسمت کا در کھل گیا۔

سفید کرتہ پاجامہ میں ایک صحت مند شخص سامنے تھا۔ پرکشش ناک نقشہ، چہرہ شاداب، آنکھوں میں دلوں کو کھینچ لینے کی جاذبیت، تاثرات میں خوش گواریت، تبسم کا اجالا موتیوں کی مالا سے زیادہ دمکتا ہوا اور موتیے سے بڑھ کر مہکتا ہوا۔ آواز ایسی شیریں، خلوص کی کھنک سے بھرپور، شفقت میں ڈوبی، سماعت کو مسحور کرتی، روح و قلب کو مسرور کرتی، تعلق خاطر کو لحہ بہ لحہ منور کرتی، ذہنوں کے تیرہ و نیم تاریک گوشوں کو

جگمگاتی گو لفظ کوئی نیا ادا نہ ہوتا (سب وہی جو لغات میں پائے جاتے ہیں) لیکن مشفق خواجہ صاحب کے لہجے میں صوتی قدرتی مٹھاس عجب لطف دیتی۔

آواز کے چشمے سے سوچ کی دو کلیاں موصول ہوئیں۔ ''تشریف لائیے'' صعود و سعادت کے ساتھ ہم ان کے روبرو ہوئے اور سلام عرض کیا۔ جواب سے معلوم ہوا کہ ہمارا سلام قبول ہوا۔ گھر میں جناب کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔ جو کچھ نظر آیا وہ در و دیوار نہیں تھے، کتابیں ہی کتابیں تھیں۔

مکان کے ذیلی حصے کے تمام (چار پانچ) کمرے کتابوں، رسائل سے بھرے ہوئے، اوپر بھی یہی عالم..... جب مکان میں رہنے لگے ہوں گے نہیں معلوم ان کا ذاتی کمرہ کون سا تھا اور کتابیں کتنی تھیں۔ یقیناً شروع میں وہ جگہ نہیں تھی جہاں عمر کے آخری حصے میں لکھتے پڑھتے گزارا۔

ایک کمرہ کتابوں سے پُر ہوا تو دوسرے میں آ گئے، دوسرا ابھی بھر گیا تو تیسرے میں منتقل ہو گئے۔ ہوتے ہوتے ان کی میز اوپر کی منزل کے برآمدے میں دہلیز کے قریب آ گئی۔ پٹ تکلف سے کھلتے اور میز کے نیچے گھسی ہوئی اکلوتی مہمان کرسی طوعاً و کرہاً ہی پیچھے کو ہوتی کہ بالشت بھر فاصلے پر ٹیلی فون ایک باریک آہنی ڈنڈیوں سے بنے اسٹینڈ پر دھرا ہوتا جو ذرا سی بے تکلفی سے گر سکتا تھا۔

مہمان اور ٹیلی فون اسٹینڈ کی مڈبھیڑ کا واقعہ رونما ہوتے ہی خواجہ صاحب کو پریشانی لاحق ہوتی کہ جھٹ مہمان کو سنبھالیں یا اسٹینڈ کو پکڑیں۔ زینوں والے کواڑ کے قریب کتابوں کا ڈھیر قریبی ملک روانہ کرنے کے لیے رکھا ہوتا۔

''اچھا تو آپ تصحیح کا کام چاہتے ہیں!''

''جی'' ٹیلی فون پر ہم نے مدعا بیان کر دیا تھا اور یہ سوال اسی پس منظر میں تھا۔

''لاہور میں کس ادارے سے منسلک رہے!''

''ادارۂ ثقافت اسلامیہ''

''ذرا یہ ایک صفحہ بہ نظر تصحیح پڑھ دیجیے''

پتا نہیں کس زیر طبع کتاب کا تھا۔ پانچ سات لمحوں میں ہم نے دیکھ کر دے دیا۔ موصوف نے ملاحظہ کیا۔ کوئی لحاظ نہ کیا اور فرما دیا۔ ''تسلی بخش نہیں ہے۔''

ہم کیا کہتے، خاموش رہے۔

''اگر آپ فن تصحیح کے صحیح معیار تک پہنچنا چاہتے ہیں تو میرے ساتھ کام کیجیے اور مجھ سے سیکھیے، اپنا معاشی مسئلہ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔''

ہمیں اور کیا چاہیے تھا۔ ہامی بھر لی۔ ان کا شفقت سے معمور گلاب چہرہ پہلی ہی ساعت سے مانوس و مشفق محسوس ہوا تھا۔

''اس کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنے کے لیے کن صاحب نے کہا؟''

''یونس جاوید صاحب نے...... کہا: کراچی میں ہی رہنا ہے تو مشفق خواجہ صاحب کا تعاون ضرور حاصل کریں اور پہلی فرصت میں خواجہ صاحب سے ملیں۔''

''وہ جو ساغر صدیقی کا عرس مناتے ہیں؟''

''نہیں وہ تو یونس ادیب ہیں۔ یونس جاوید ڈرامے لکھتے ہیں، کیا آپ نہیں دیکھتے؟''

ہم نے توضیح کے ساتھ ایک سوال ختمی کر دیا۔

''میں ٹی وی نہیں دیکھتا'' سگریٹ سلگایا۔ کش لیا اور دھوئیں کے اخراج کا انداز واقعی ٹی وی کے سگریٹ اشتہاروں سے مختلف تھا۔

ہمارا خیال ہے ملاقات نہ ہونے کے سبب یونس جاوید کو یونس ادیب میں گڈمڈ کر جاتے تھے کہ کہاں ایک شخص پورے عرس کا سبز حوالہ رکھتا تھا دوسرا ان کے نزدیک پی ٹی وی کے مزار پر سبز چادر چڑھانے والا اور بس۔

''کہیں جانے کی جلدی تو نہیں! کچھ دیر میرے پاس بیٹھ سکتے ہیں؟''

''جی کیوں نہیں، کام پہلے، یہاں آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔''

''چائے پئیں گے!''

''چائے کی طلب نہیں۔ شکریہ''

''اچھا تو یہ چند صفحات میرے پڑھے ہوئے آپ دیکھیے کہ اغلاط کی نوعیت کیا ہے۔''

ہم نے کام دیکھنا شروع کیا، قرار واقعی محنت سے پڑھے گئے صفحات تھے اور ہمیں سیکھنے میں بہت مدد مل رہی تھی۔

لاہور میں تو ہمیں اس طرح بتایا سکھایا نہیں گیا تھا۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے متعلقہ ایک بدنیت صاحب نے پہلی ہی کتاب برائے تصحیح ابن عربی کی تھما دی۔ ہم سے اغلاط رہ گئیں۔ انھوں نے ناظم ادارہ (سراج منیر صاحب) کو لے جا کر دکھایا اور کہا کہ محیط تصحیح کے اہل نہیں۔ ن م راشد کے بھائی راجا جد صاحب نے ہماری وکالت کی کہ اس نوجوان کا ایسی مشکل کتاب کو آخیر تک جیسے تیسے پڑھ دینا ہی بڑے حوصلے کی بات ہے۔

خلوص نیت سے کوئی کسی کو سکھانا بتانا چاہے تو کوئی کام، کوئی ہنر کوئی فن مشکل نہیں رہ جاتا۔ فن تصحیح سے ہماری دلچسپی اور ترجیح کو دیکھ کر خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے کہ فی زمانہ ہزاروں شاعر ادیب پیدا ہوتے ہیں، لیکن ایک قابل ذکر مصحح سامنے نہیں آتا۔ اگرچہ وہ چاہتے تھے کہ ہم اپنی شاعرانہ حیثیت کو بھی منوائیں۔

خواجہ صاحب نے ہماری معاشی ذمہ داری تو قبول کر ہی لی تھی۔ ہفتے بھر میں سیکھنے کی رفتار اور قابلیت کا اندازہ کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو میں بہ حیثیت مصحح رکھنے کے لیے نور الحسن جعفری مرحوم (صدر) اور جمیل الدین عالی صاحب (معتمد اعلیٰ) سے مشورہ کر کے ہمیں ملازمت دے دی۔ انجمن کے

سپرد کرنے کے بعد انہیں بری الذمہ ہو جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں تھا۔

وہ معاشی حوالے سے ہمیں زیادہ مضبوط دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ ادارۂ یادگارِ غالب (غالب لائبریری ناظم آباد ۲) میں بھی جز وقتی (سہ پہر چار تا ساڑھے سات) ہمارے لیے جگہ بنا دی۔

دو مشاہروں سے ضروریاتِ زندگی پوری ہو رہی تھی۔ صبح ایک گھنٹا (۷ تا ۸) نصر اللہ خان صاحب کے ہاں اخبار سنانے کے بعد ان کے بولنے کی رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے کالم لکھنا، پھر لکھے ہوئے کو ان کی تسلی کے لیے سنانا ہماری ذمے داری تھی۔ جس کا معاوضہ ہفت روزہ تکبیر سے ادا ہوتا۔

ان تین لگی بندھی رقوم کے علاوہ بھی خواجہ صاحب ہماری آمدنی میں اضافہ کرتے رہے۔

فنِ تصحیح کے ساتھ ہمیں مخطوطہ شناسی بھی سکھا دی اور ہمیں نقل نویسی کا کام فارغ وقت میں گھر بیٹھے کرنے کو دے دیتے اور اس کا معقول معاوضہ ادا کرتے۔

اس پر بھی اکتفا نہ کیا۔ ہمارے حالات کو کراچی میں بہتر سے بہتر بنانے کی سعی و خواہش میں مزید مواقع پر نظر رکھتے۔

فرمایا: آپ ٹی وی پروگرامز سے بھی مالی فائدہ اٹھائیں گے، میرا چھوٹا بھائی راشد خواجہ پی ٹی ایم میں مجاز افسر ہے، کچھ پروگرام پہلے ریڈیو کے کیں۔"

ایک روز ریڈیو اسٹیشن بھیجا (اگرچہ معاوضہ اتنا کم ہوتا ہے ریڈیو کا کہ آدمی ایک دن گزارا مشکل سے کرے)۔ ہمارے پہنچتے ہی پروڈیوسر کو فون کر کے کہا "بھئی اس سہ ماہی میں محمد اسمٰعیل کو پروگرامز کا اتنا معاوضہ دے دیجیے کہ یہ کراچی میں ایک عدد فلیٹ خرید لیں" پروڈیوسر صاحب بہت محظوظ ہوئے بہت ہنسے۔

بہاول پور میں کل پاکستان مشاعرہ ہو رہا تھا سرکاری غالباً ۱۹۸۹ء ایک افسر اورنگ زیب عالم گیر صاحب نے خواجہ صاحب کو فون کیا تو خواجہ صاحب نے ہمارا نام لکھوا دیا اور طے پایا کہ ٹکٹ ہوائی آمد و رفت کے علاوہ معاوضہ بڑے شعراء کے مساوی دیا جائے گا۔

ہم جتنے حیران وہ اتنے خوش۔ فرمایا: بھئی ہم کسی کا حق تو نہیں مار رہے، آپ کا حق ہے، ملنا چاہیے۔"

غرض ہم وہاں پہنچے، دیکھا: قاسمی صاحب کا گروہ اور قاسمی صاحب کی صدارت میں مشاعرہ، پہلے تو سب شعراء حیران و پریشان کہ محمد بیچ میں کہاں سے ٹپکا! گروہ کو ہر بات کی خبر رہتی تھی لیکن ہماری شرکت کا علم نہ تھا۔ متعلقہ افسر سے فہرست لے کر دیکھی گئی۔ نام اولین شعراء میں درج تھا۔ کیا کر سکتے۔ اب معاوضے کی کن سن لی گئی۔ معلوم ہوا بڑے شاعروں کے برابر رکھا گیا ہے۔ انہیں یقین نہ آیا اور متعلقہ افسر سے کہا گیا کہ ضرور غلط فہمی ہوئی ہے، یہ تو جوان شاعر ہے۔ اس کا معاوضہ چھوٹے شاعروں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ جواب ملا۔ "اوپر کا معاملہ ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

عظیم شعراء کو اس خبر سے مزید دھچکا لگا کہ آمد و رفت کا ٹکٹ بھی جہاز کا دیا گیا ہے۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ خواجہ صاحب کسی بھی معاملے میں کتنا مضبوط اثر رکھتے تھے کہ ان کا کہا بیسیوں "پہنچے ہوئے" اشخاص مل کر بھی غیر موثر نہ کر سکتے تھے۔

روداد سن کر خواجہ صاحب نے فرمایا "خیر، اپنا پاسپورٹ تیار رکھیے، عرب امارات مشاعرے میں آپ کو جانا ہے۔"

ہم یقین کیسے نہ کرتے کہ تازہ کرشمہ دیکھ ہی چکے تھے۔

لاغر گھوڑے کو اچھی خوراک اور صحت افزا ماحول دیا جا رہا ہو تو گھڑ دوڑ میں کیوں نہ شامل ہو!

ساری کرم فرمائی اپنی جگہ...... ہمارے اشعار کے ساتھ حضرت جو زیادتی فرماتے تھے خدا کی پناہ! ایسی سنگ دلانہ تنقید پہلے کہیں دیکھی نہ تھی۔

ان سے پہلے بھی ہمارے دو استاد گزرے ہیں اور کوئی چھوٹے موٹے بھی نہیں، حضرت احسان دانش اور سراج منیر صاحب۔ جنہیں واسطہ ہی نہ پڑا ہو خواجہ صاحب سے کلام پر اصلاح لینے کا وہ نہیں جان سکتے کہ موصوف کیسے ظالم نقاد تھے۔ نتیجہ یہ کہ روز بہ روز کہنا کم ہوتا گیا۔

۱۹۷۵ء بہ عمر سولہ ہمارا شعر جس نے سنا پسند کیا تھا:

دن رات مجھ سے ملنے کو رہتے ہیں بے قرار
شاید میں حادثات کو بے حد پسند ہوں

۱۹۸۱ء میں نئی نئی زمینوں میں کہنے کا دورہ پڑا۔ سراج منیر صاحب کے بقول شاہ نصیر سے ہمارا رنگ ملتا تھا۔ (جلد کا نہیں، کلام کا) مثلاً

کہیں تو لیتا ہے آئینہ ہنر کروٹ
بدل رہی ہے کبھی شب، کبھی سحر کروٹ

مگر آپ سمجھے! اتنی مشق بہم پہنچانے کے باوجود ایسی تنقید فرماتے کہ پسلیاں توڑ کر رکھ دیتے۔ ماننے کو تو ہمیں شروع ہی سے قادر الکلام تسلیم کر لیا تھا، پھر اس کے بعد کلام کو [illegible] پر بھی قادر ہوئے۔

خواجہ صاحب نے ہماری شعری تربیت از سرِ نو دیوانِ مومن سے کی۔ گویا ہمارا ہاتھ شاہ نصیر سے چھڑا کر مومن کے ہاتھ میں دے دیا (جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے) ہم نے سرِ تسلیم خم کیا اور مومن کو پڑھا تو اتفاق محسوس ہوا یعنی خواجہ صاحب نے ہماری افتادِ طبیعت کے لیے مومن بالکل درست تجویز فرمایا تھا۔

گاہے گاہے غزل برائے اصلاح پیش ہوتی رہی اور خواجہ صاحب نے کبھی نہ کہا کہ بعد میں دیکھیں گے۔

ان کے نزدیک ایک اچھی تخلیق ادب کی خدمت میں سلام خلوص عرض کرنے کا عمل تھا جس کا جواب وعلیکم اسی وقت مل جاتا لیکن خواجہ صاحب سے اب ہمیں ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ غزل کا ایک ایک "شعر"

ان کے پاس جا کر بکری بن جاتا اور ان کا ہاتھ قصائی کا ہوتا۔

شعر پر ان کی نظر گویا لیزر شعاعوں کا گزرنا ہوتا۔ پہلے جرح کرتے، پھر جراحی کرتے۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ نقاد کی حیثیت سے باہر نہ آئے، ورنہ بڑے بڑے جید و سید نقادوں کے کان کاٹنے بلکہ سب کچھ کاٹ کر رکھ دیتے۔ عظیم شاعر تو شاید ہی سالم کوئی اس دور میں بچتا۔

خواجہ صاحب نے فراغت کے لمحے جب کوئی شعر سنا یا وہ یگانہ کا تھا، ہمیں شعر اچھا لگتا تو ایک اور پھر ایک اور، یگانہ ہی کے شعر سناتے کہ ان دنوں اس پر کام بھی کر رہے تھے۔

خواجہ صاحب کے ہاں سال بھر میں ۳۸ عیدیں ہوتی تھیں (شاعر ادیب تو اپنے گھر بھی عید کہاں مناتے ہوں گے جو دو شمار ہوتی ہیں) ہر اتوار ناشتے کے بعد سے وہ پہر ڈھائی بجے تک۔ ہر طرح کے اداس و کم اداس چہرے خواجہ صاحب کے فقروں سے کھل اٹھتے۔ سنجیدہ آتے اور ہنستے ہوئے لوٹتے۔

خدا گواہ ہم کسی عید پر اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا خواجہ صاحب کی محفل میں۔

اٹھنے کو کسی کا جی نہ کرتا، لیکن خواجہ صاحب کے معمولات کا قریباً سب کو علم تھا کہ وہ پہر ڈھائی بجے کھانے سے قبل دوا لیتے پھر طعام کے بعد قیلولہ فرماتے۔

ہم تو شام تک ان کے پاس رہتے اس لیے کھانے میں شریک ہوتے۔ ان کے آرام کرنے تک ہم ذیلی حصے کے کتب خانے میں کام کر رہے ہوتے۔

شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ مسلسل تین سال خواجہ صاحب کی سرپرستی کے دوران ہم نے جانا ہی نہیں کہ موصوف باقاعدہ ہر ہفتے ادبی کالم لکھتے ہیں (جیسا کہ سب کو معلوم ہے ہفت روزہ تکبیر میں، خامہ بگوش کے نام سے) نہ حضرت کو کبھی خواہش ہوئی کہ ہماری رائے معلوم کریں۔

فرضی نام کے ساتھ معاہدے سے وفاداری کا ایسا ثبوت کہاں مل سکتا ہے کہ کسی کو اتنا قریب کر لینے کے باوصف راز کو راز رکھا، ہمیں آگہی سے باز رکھا۔

۱۹۹۰ء میں جب محسوس کیا کہ تحقیقی کام کالم کے باعث متاثر ہو رہے ہیں تو صلاح الدین صاحب کے نام قلمی تعاون سے معذرت کا خط لکھ کر ہمارے حوالے کیا۔ (جب ہمیں معلوم ہوا) اور پتہ سمجھا دیا کہ انہیں دے آئیں۔

صلاح الدین صاحب نے پڑھتے ہی کہا "یہ نہیں ہو سکتا" لیکن سلسلہ موقوف تو ہوا۔

تصحیح کے امور میں ہم نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تو اب ان کا قیمتی وقت زیادہ سے زیادہ تحقیقی جنجال پر صرف ہونے لگا۔

مسلسل کام کے دوران چائے کام آ رہی ہوتی اور سگریٹ کام دکھا رہا ہوتا۔ سگریٹ خانہ ساز تھے اور ان کا خانہ خراب بھی کر رہے تھے۔

ہم نے دو تین مرتبہ مختلف انداز اور مودبانہ الفاظ میں سگریٹ کے نقصانات بیان کرنے کی

جسارت کی تھی۔

ہر بار مسکرا کر کہتے "اجی کمپنی کے سگریٹ کے مقابلے میں یہ بہت ہلکے اور کم نقصان دہ ہیں جب طلب محسوس ہوتی ہے چٹکی بھر تمباکو کو اس باریک کاغذ میں لپیٹتا ہوں، سگریٹ آپ کے سامنے تیار ہوتا ہے۔"

یہ محض الفاظ نہ ہوتے، ساتھ ساتھ عملی طور پر سگریٹ تیار کر کے ہمیں گویا لاجواب کر دیتے تھے۔

ڈبیا کھول کر چٹکی بھر تمباکو دو انگل مہین کاغذ پر ہموار کرنے کے بعد ایک کنارے کو اپنی شائستہ اردو زبان سے پنجابی لعاب لگاتے۔ دونوں ہاتھ کی انگشت شہادت انگوٹھے کے ساتھ حرکت میں آتیں اور دوسرے کنارے سے پہلے کنارے کے معانقے تک رقص انگشت بتدریج کم ہو کر ختم جاتا۔

پھر لائٹر کی لو دائیں انگوٹھے کی مہمیز پر سر اٹھاتی اور ایک بوسہ دے کر سگریٹ میں جان ڈال دیتی۔

گویا سگریٹ سرخ رو ہو کر خواجہ صاحب کے ہونٹوں سے لگ جاتا کش کیساتھ ہی جان کو لگ جاتا اور وہ بجھتے جان میں جان آئی۔

۱۹۸۹ء میں "اردو املا" رشید حسن خاں صاحب کی تالیف نظر سے گزری جس میں انجمن ترقی اردو کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی مجلس صحت املا کا ذکر تھا۔ اس میں اس وقت کے نامور ادیبوں کی سفارشات مرتب کی گئی تھیں۔ اس پر کہاں تک اور کب تک عمل ہوتا رہا، ہمارے علم میں نہیں۔

کراچی میں جب تک ہم خواجہ صاحب کی سرپرستی میں رہے، مالی پریشانی نے سر نہ اٹھایا۔

شہر میں جہاں "نقدی مشاعرہ" ہوتا خواجہ صاحب ہمارا نام ٹیلی فون پر لکھوا دیتے۔ پھر ہمیں اطلاع دیتے کہ فلاں دن فلاں وقت فلاں صاحب سے ملیں اور مشاعرہ پڑھ کر لفافہ حاصل کریں۔

ایک مشاعرے میں الٹ ہوا۔ ہم وقت مقررہ پہنچے اور متعلقہ اظہر حسن صدیقی صاحب سے ملے۔ انہوں نے رسمی تبسم کے ساتھ مصافحہ تو کیا اور کچھ کہے سنے بغیر کہیں چل دیے۔

الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

کے مصداق ہم نے ایک پل میں فیصلہ کیا اور محفل سے نکل کر غائب ہونے ہی والے تھے کہ صدیقی صاحب نے ہمیں آ لیا اور ایک لفافہ تھما کر بولے، مشاعرہ شروع ہوا چاہتا ہے آپ اسٹیج پر تشریف لے چلیں اور اس میں موجود رقم کا کسی شاعر سے ذکر نہ کریں (ویسے رات گئے مشاعرے کے اختتام پر لفافے شعراء میں تقسیم ہوئے تھے)۔

اسٹیج پر جانے سے قبل رقم دیکھی اچھی خاصی تھی۔ ہم تھے تو کم عمر اور غیر معروف شاعر لیکن خواجہ صاحب جہاں بھیجتے بڑا لفافہ ہاتھ میں آتا۔

۱۹۸۹ء میں آب گم کی تصحیح کے لیے مشتاق احمد یوسفی صاحب اپنے معیار و سنجیدگی کے شایان شان مصحح کا بندوبست کرنے لندن سے تشریف لائے اور خواجہ صاحب سے ذکر و مشورہ کیا۔

دوستی کا حق تو یہ تھا کہ خواجہ صاحب خود پڑھ دیتے، لیکن موصوف نے یہاں بھی ہمارے حق میں

فیصلہ کیا (یوسفی صاحب تو پہلے ہی باثروت تھے) لہٰذا صرف ہمارا فائدہ سوچا اور صاحب آبِ گم کے مشعلے لگا دیا (دامنِ یوسفی پہ داغ کہاں، ایک مشاہداتی خاکہ ۲۰۰۳ء کے اوائل ماہِ نو میں شائع ہو چکا ہے۔ ہمارے لیے دہرا اعزاز کہ آبِ گم کی تصحیح کی اور مشاہداتی خاکہ یوسفی صاحب نے پسند کیا۔ جب کہ خواجہ صاحب کے بقول دو تین جگہ ہم گستاخی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اللہ معاف رکھے اور یوسفی صاحب بھی)۔

قریباً چار سو صفحے کی تصنیف میں فقط دو تین الفاظ کے صحتِ املا پر یوسفی صاحب سے ہمارا اختلاف رہا۔ جناب کے مزاج کو بے مزہ کرنے کے لیے ایک لفظ کا اختلاف بھی بہت تھا۔ یوسفی صاحب کی شکایت سن کر خواجہ صاحب نے ہمارے حق میں صاد کیا۔

یوسفی صاحب کسی حد تک مطمئن ہوئے، لیکن معاوضے کے لیے اور کچھ کہے بغیر لندن روانہ ہو گئے۔

کام مکمل ہوا تو یوسفی صاحب کی ناشر (حوری نورانی) صاحبہ نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ ایک نازک ترین مرحلہ آخر طے ہوا۔ خوش ہو کر دستخط اور تازہ تاریخ کے ساتھ چیک ہمارے حوالے کیا۔ ہم نے دیکھا رقم ندارد Blank Cheque تھا۔ ان کی طرف سوالیہ نظر کی تو مسکرا کر بولیں: "جتنا چاہیں بھر لیں"۔

گویا سنہری موقع تھا لیکن ہم ہوشیار کب تھے، ہوتے تو یوسفی صاحب سے بھی بلینک چیک نہ لے لیتے؟

مکتبہ دانیال کے روبرو ہی بینک تھا۔ پہنچ کر رقم بھرنے کے لیے حساب لگایا تو خواجہ صاحب کا خیال آیا کہ وہ کیا کہیں گے: "اتنی رقم بھر لی"۔

پھر یوسفی صاحب کا جرم یاد آیا کہ پہلے سے کیوں نہ ہم سے رابطہ رکھا۔ غرض جرمانے کے طور پر پہلے کی تینوں کتابوں کا معاوضہ شامل کر کے رقم نکلوائی، بھاری جیب کے ساتھ خواجہ صاحب کے پاس پہنچے، ان سے مشورہ کر کے جاپانی نیشنل کا ٹی وی خریدا۔

قرار واقعی ایسے مہربان و مشفق ہستی کی سرپرستی سے کون دور ہونا چاہتا! لیکن ہمارے مقدر کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔

ہم اکیلے تمام عمر کی تگ و دو کے باوجود اس ترقی کی گرد کو بھی نہ پہنچتے، نہ کوئی اور صاحب قدم قدم پر ہمارا ہاتھ تھامے رکھ سکتے تھے، جس طرح خواجہ صاحب نے۔

ترقی کی گرد کو پہنچنے سے پیشتر کتابوں کی گرد نے کام دکھا دیا۔ پھر مقدر کا قاف کاف سے بدل گیا۔

خواجہ صاحب کے کتب خانے (ذیلی حصے) میں کئی روز مسلسل کام کے دوران کتابوں سے استفادہ بہت مہنگا پڑا۔ ہم ضیق النفس کے شکار ہو گئے۔ جو بھی کتاب، جریدہ نکالتے اس پر مہینوں کی مہین گرد ہوتی۔ لگے ہاتھوں اس خانے کی دیگر کتب کو بھی جھاڑ دیتے اور گرد سانس کی نالی میں جاتی رہی۔

شروع میں شدید چھینکیں، نزلہ، کھانسی، پھر دمے کی شکایت ہو گئی۔ ڈاکٹر کے استفسار پر جب بتایا کہ خاندان میں کسی کو بھی یہ شکایت نہیں تو اس نے مشورہ دیا کہ ساحلی ہوا (یعنی کراچی) سے دور چلے

جائیں، کیونکہ تیز دوا بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ سانس بری طرح متاثر اور برا حال تھا۔ مرتے کیا نہ کرتے، لاہور کا قصد کیا۔ ہمارے اس فیصلے اور ہمت ہار بیٹھنے سے خواجہ صاحب کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا۔ پوچھا:

"کیا یہ حتمی فیصلہ ہے!"

زبان گنگ تھی۔ ہم نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

ہماری جبینِ نیاز پر ندامت کی نمی تھی۔

خواجہ صاحب کی آنکھوں میں تین سال کی محنت پر پانی پھرنے کی نمی تھی اور ہمیں یہاں سے بھگانے پر کمربستہ پورے کراچی کی ہوا میں نمی تھی۔

۱۹۹۰ء کے آخر ہم نے لاہور کا رخ کیا۔ شرمندگی کے باعث ہم خط و کتابت بہت ہی کم کرتے تھے، خواجہ صاحب کا شہر سے نکلنا بہت کم ہوتا۔

جب بھی لاہور تشریف لائے ہمارے غریب خانے پر ضرور آتے۔

ہمارے بچوں سے انہیں جو محبت تھی (یہاں لفظ "ہمارے" فاضل ہے کہ وہ سب ہی کے بچوں سے حد درجہ شفقت فرماتے تھے) اس کیفیت کو بیان کرنے والا قلم یا قدرت ہمارے پاس نہیں۔ ان کے اکلوتے مجموعے "ابیات" میں اس کیفیت و احساس کے سینکڑوں جگنو جگہ جگہ چمکتے دمکتے اور کہیں کہیں سرخ لودیتے نظر آتے ہیں۔

اپنے پرائے جن جن بچوں کی تصاویر انہوں نے اتاریں، وہ البم کے البم ان کی شفقت کا پرتو ہیں...... اور ایک ایک تصویر اس پرتو کی پرت......

کاش خواجہ صاحب کی کوئی زندہ تصویر آج ہمارے درمیان چل پھر رہی ہوتی، ان کی آنکھیں، ان کی آواز، ان کے فقرے ہو بہو ہوتے!

(ماہنامہ "ماہِ نو" لاہور جلد نمبر ۵۸ شمارہ نمبر ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۵ء)

فرخ زہرا گیلانی

ایک نظم مشفق خواجہ کے لیے

آگہی بوتا رہا تاباں سحر کرتا رہا
زندگی بھر خدمت فکر و ہنر کرتا رہا
کارواں بھی خود ہی تھا اور قافلہ سالار بھی
اس طرح دشت جنوں میں وہ سفر کرتا رہا
جس کے سائے بانٹتے ہیں اب بھی ہر سو خنکیاں
اس شجر کو واقف اہل نظر کرتا رہا
اس کے حرفوں نے اُجالی ایک ایک صنف سخن
وہ دیار علم کو روشن نگر کرتا رہا
وہ خزاں موسم کو بھی کر کے شناسائے بہار
بے ثمر اشجار کو بھی باثمر کرتا رہا
طنز کے نشتر سے فرخ وقت کے ناسور کو
چاک کر کے، حرف حق کو معتبر کرتا رہا

(بحوالہ: "سہ ماہی معاصر انٹرنیشنل" جلد ۵، شمارہ نمبر ۵، ۶، جنوری تا جون ۲۰۰۵ء)

جعفر بلوچ

مشفق خواجہ زندہ باد

مشفق خواجہ انساں تھا اعجاز نہاد
شاعر، نثر نگار، محقق اور نقاد
محسن علم و ادب تھی اس کی طبع جواد
مشفق خواجہ زندہ باد

اس کا مثیل اب لایا جا سکتا ہی نہیں
اس کا رنگ چرایا جا سکتا ہی نہیں
اس نے کیا لکھنے کا وہ اسلوب ایجاد
مشفق خواجہ زندہ باد

قرباں تھے ان کی محفل آرائی پر
یہی نادر ادب کے اور علمی لیکچر
یوں بھی ہوئی ہے فکر اور فن کی شان زیاد
مشفق خواجہ زندہ باد

اس کے دل میں ابراہیمی جذبے تھے
اس کی نظر کے اٹھتے ہی ہو جاتے تھے
جھوٹ اور جہل کے تانے بانے سب برباد
مشفق خواجہ زندہ باد

اس کے مقابل وہ کیسے آ سکتے تھے
اس سورج کی تاب کہاں لا سکتے تھے
علم زادے، شپرہ چشم اور کور سواد
مشفق خواجہ زندہ باد

پرچم اونچا اس کے ادب کا آج بھی ہے
اس کا شہرہ، اس کا چرچا آج بھی ہے
مستقبل بھی اس کو مسلسل دے گا داد
مشفق خواجہ زندہ باد

☆☆☆

(بحوالہ ماہنامہ "الحمرا" اپریل ۲۰۰۵ء)

قطعہ تاریخ وفات

تھا بسکہ غنیمت دمِ مشفق خواجہ
کیسے نہ کریں ماتمِ مشفق خواجہ
بے سر ہوا، علم اور بے پا تحقیق
ہاتف جو پکارا غمِ مشفق خواجہ

2175-170=2005

عام قاری کے لیے تھوڑی سی تشریح نامناسب نہ ہوگی۔ تیسرے مصرعے میں علم کا بے سر ہونے کا مطلب ہے علم کا سر یعنی ع جس کے عدد 70 ہوتے ہیں اور بے پا تحقیق سے تحقیق کے پاؤں یعنی ق جس کے عدد 100 ہوتے ہیں، اگر غم مشفق خواجہ سے جس کے اعداد 2175 ہوتے نکال دیے جائیں تو باقی سال وفات 2005ء نکل آئے گا۔

(بحوالہ: فرائیڈے اسپیشل کراچی، ۱۸ مارچ ۲۰۰۵ء)

عمران نقوی

چراغ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے

(اہل قلم کے تعزیت نامے)

مشفق خواجہ بھی رخصت ہو گئے۔

اس قحط الرجال میں ان کا جانا کسی سانحے سے کم نہیں ہے۔ یہ دور وہ ہے کہ بڑے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور اس خلا کو پر کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ان کا دم اس بنجر ماحول میں شادابی کی علامت تھا۔ وہ کیا رخصت ہوئے کہ ادب کا منظر خالی خالی نظر آنے لگا ہے۔

تحقیق ان کا خاص میدان تھا اور اس حوالے سے ان کا نام سند کا درجہ رکھتا ہے۔ مشفق خواجہ اپنی شگفتہ مزاجی کے باعث ادیبوں کے سنجیدہ حلقوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ ان کے ادبی کالم قارئین کا وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ ان کے پر مغز اور کاٹ دار جملے پڑھنے والوں کو عجیب طرح کا لطف دیتے تھے۔

بطور شاعر بھی وہ اپنی الگ پہچان رکھتے تھے۔ ان کی رحلت سے اردو ادب ایک ایسے لکھنے والے سے محروم ہو گیا ہے جو نہ صرف خود اہم کام کرتا تھا بلکہ اردو ادب میں تحقیق کرنے والوں کے لیے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں بھی ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ اردو ادب کے حلقوں میں ان کی کمی تادیر محسوس کی جاتی رہے گی۔ آیئے دیکھتے ہیں ان کے احباب انہیں کس طرح یاد کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

مشفق خواجہ کا انتقال اردو زبان و ادب کے وابستگان کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ خواجہ صاحب ادبی تحقیق کا کام بہت بڑا اہم تھے۔ انہوں نے تحقیق و تدوین کا جتنا بھی کام کیا ہے، وہ محققین کے لیے ایک ''ماڈل'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

خوش معرکہ زیبا، کلیات یگانہ چنگیزی، غالب اور صفیر بلگرامی معرکے کے تحقیقی کام ہیں۔ جن پر سالہا سال ریاضت کی تب جا کر ایسے معیاری کارنامے تکمیل کو پہنچے ہیں۔ نسبتاً کم مقدار کے باوجود خواجہ صاحب کا تحقیقی کام اتنا معیاری ہے کہ ان کو بلا شبہ اردو کے چند گنے چنے بڑے محققین میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

مشفق خواجہ کی اچانک اور بے وقت موت جہاں میرے لیے ایک ذاتی سانحہ ہے وہاں اردو تحقیق اور تنقید کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ ہمارے ملک میں ویسے ہی محققین کی تعداد بہت کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ ایسے میں مشفق خواجہ جیسے محقق کا رخصت ہو جانا یقیناً تحقیق کی دنیا کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ان کے ذخیرۂ کتب کی بڑی شہرت رہی۔ قدیم اور جدید ماخذ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس حوالے سے ان کا جو کام سامنے آیا، وہ بہت اچھا ہے۔ بے حد معیاری لیکن بہت کم۔ ان کے وقت کا بیشتر حصہ ان کے گھر پر آباد رہنے والی مجلس آرائی کی نذر رہا۔ وہ بڑے بامروت آدمی تھے اور بہت زیادہ بہتر اور بہت یادگار علمی کارناموں کے سرانجام کے اہل تھے۔

ڈاکٹر فخر الحق نوری

جناب عبدالحی مشفق خواجہ کے سانحہ ارتحال کی خبر سن کر بہت ملال ہوا۔ وہ سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں اپنے اعلیٰ انسانی اوصاف اور تحقیقی کارناموں کے حوالے سے بے حد قدر و منزلت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ اگرچہ مشفق خواجہ نے خامہ بگوش کے روپ میں اردو میں ادبی کالم نگاری کو نیا رنگ و آہنگ دیا اور وہ ''ابیات'' میں شعر گوئی کے ہنر کا اظہار بھی کر گئے لیکن ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ تحقیق اور خصوصاً تدوین و ترتیب ہے۔

ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد

مشفق خواجہ کا نام اردو تحقیق کے حوالے سے درخشندہ ہے۔ وہ اپنے ادبی کام کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ تادم آخر علمی کاموں میں منہمک رہے۔ ان کا جانا سال رواں کا عظیم سانحہ ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

میرے لیے یہ علمی و ادبی نقصان کے ساتھ ذاتی سانحہ بھی ہے۔ انہیں مجھ سے جو شفقت اور محبت تھی اس سے محرومی کا کوئی مداوا نہیں۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر آج شعبہ اردو تہران یونیورسٹی میں ہم نے ایک تعزیتی اجلاس کیا جس میں مرحوم کی علم و ادب کے حوالے سے بے پناہ خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور ان کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا گیا۔

وحیدالرحمٰن خان

مشفق خواجہ اس عہد کے عظیم محقق اور نقاد تھے۔ ان کی وفات ایک بہت بڑا قومی اور ادبی المیہ ہے۔ ان کی وفات سے مجھے ذاتی صدمہ پہنچا ہے اور میں ابھی تک سکتے کی کیفیت میں ہوں۔ مجھے ان سے حد درجہ عقیدت تھی۔

محمد سلیم الرحمٰن

مشفق خواجہ کو بطور محقق یاد رکھا جائے گا لیکن مشہور محققین کے برعکس انہیں جتنی دلچسپی پرانے ادب سے تھی اتنی ہی جدید ادب سے بھی تھی۔ تحقیقی معاملات میں الجھے رہنے سے ان کی شخصیت کا ایک پہلو دب گیا ہے۔ وہ غزل بھی اچھی کہتے تھے لیکن اس صنف کی طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

فرخ زہرہ گیلانی

مشفق خواجہ دنیائے ادب کا ایک معتبر و موقر حوالہ..... تحقیق و تنقید اور ادبی کالم نگاری کے حوالے سے ایک قد آور شخصیت۔ بہت سے میگزینز کے ایڈیٹر رہے، انجمن ترقی اردو کو ان کی بائیس تئیس سالہ رفاقت کا شرف حاصل ہے۔ مولانا عبدالحق بابائے اردو کی زیر نگرانی بہت سے منصوبے جناب مشفق خواجہ کی رفاقت و شراکت سے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

مشفق خواجہ اردو تحقیق کا ستون تھے۔ واحسرتا کہ وہ ستون بھی گر گیا۔ ان کے دم سے تحقیق و تنقید کی دنیا سرسبز تھی اور ہمارے مخطوطے اور لسانی نوادرات بے وارث نہ تھے۔ ادب و تنقید کی دنیا میں ان کی نہایت درجہ بلند ساکھ تھی اور ان کی تحریروں کا انتظار کیا جاتا تھا۔

رفاقت علی شاہد

مشفق خواجہ ایک شخص کا نہیں ایک عہد کا نام تھا اور ہے۔ وہ صحیح معنوں میں محقق تھے۔ محقق میں سچائی، ایمانداری، غیر جانبداری، صبر و استقامت اور انکسار کی جو خصوصیات ہونی لازمی ہیں، خواجہ صاحب سے زیادہ میں نے کسی محقق میں وہ خوبیاں نہیں دیکھیں۔

لطیف ساحل

مشفق خواجہ ادبی دنیا میں روشنی کا ایسا مینار تھے جو تحقیق کی دنیا سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی تخلیق کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ وہ قدیم و جدید شعر و ادب کو پرکھنے اور اس کا تعین کرنے میں بے پناہ اور منفرد

صلاحیت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ضیاء الحسن

کیسے کیسے نہ تھے قصہ گو شہر میں
بولتے تھے کبھی، اب نہیں بولتے

(بحوالہ: روزنامہ "نوائے وقت" ۲۵ فروری ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ
محمد عالم مختار حق کے گھر لاہور اتاری گئی، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ء کی ایک یادگار تصویر

جامع الصفات ادبی شخصیت

مشفق خواجہ کی رحلت موجودہ صدی میں پاکستان کی علمی و ادبی اور تحقیق و تنقید کی دنیا کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ وہ ایک ایسی جامع الصفات ادبی شخصیت تھے جس کی کوئی مثال اردو کی معاصر ادبی دنیا میں نہیں ملتی۔ تحقیق و تنقید، شاعری اور طنز و مزاح میں ان کا شمار درجہ اول کے لوگوں میں ہوتا ہے لیکن ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ اسلام، پاکستان اور اقبال کے ساتھ ایک غیر متزلزل وابستگی رکھتے تھے اور یہ وابستگی انہیں اپنے والد خواجہ عبدالوحید سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ اپنے مخصوص شگفتہ اسلوب میں اشتراکیت، الحاد، آمریت، جعلی ادیبوں اور جعلی محققوں پر ایسی لطیف تنقید کیا کرتے کہ مخالف بلبلا اٹھتا مگر لطف بھی لیتا تھا۔

خواجہ صاحب ادبی دنیا کے تمام گروہوں، دھڑوں اور حلقوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ معدودے چند جعل سازوں کو چھوڑ کر وہ ہر ایک کی ضرورت تھے۔ حتیٰ کہ بھارت میں بھی خامہ بگوش کا کالم پاکستانی ادب کی مقبول ترین تحریر کے طور پر وہاں کے متعدد رسالوں اور اخبارات کے ادبی صفحات پر چھپتا اور ایک وسیع حلقے میں پڑھا جاتا تھا۔ ان پر سب سے پہلے دہلی کے ماہنامہ "کتاب نما" نے خاص نمبر شائع کیا تھا مگر خواجہ صاحب نام و نمود سے ہمیشہ بے نیاز بلکہ گریزاں رہے، حتیٰ کہ انٹرویو تک دینے کے روادار بھی نہ تھے۔ کوئی طالب علم ان پر تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتا تو سختی سے منع کر دیتے تھے۔ علم و ادب کا ایسا بے لوث اور بے غرض خدمت گزار، ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔

(بحوالہ: روزنامہ "نوائے وقت" ۲۵ فروری ۲۰۰۵ء)

اظہار تعزیت

مشفق خواجہ تحقیق کے آدمی تھے۔ اور یہی وہ خراج تحسین ہے جو ہم انہیں پیش کر سکتے ہیں۔ تحقیق کا جو کال ہمارے معاشرے میں ہے وہ سائنس ہو یا مذہب، ادب ہو یا صحافت، ہم نعروں پر پلے اور فتووں پر بڑھے ہیں۔ جستجو اور جانکاہی، پتہ مارنا اور تہ تک پہنچنا ہمارے قومی مزاج کا حصہ ہی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی غرضیں ہیں اور بڑی بڑی خواہشیں ہیں جنھوں نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

ادھر کچھ دنوں سے تحقیق کا ذکر زیادہ سننے میں آ رہا ہے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے تحقیق کے اتنے مواقع مہیا کر دیے ہیں اور ہر تحقیق کا اتنا اجر مقرر کر دیا ہے کہ منہ میں پانی بھر آئے۔ لیکن گھوڑے کو پانی تک تو لایا جا سکتا ہے، اسے پلایا نہیں جا سکتا۔ کانوں کی زبان سوکھ گئی ہے اور کوئی آبلہ پا تحقیق کی پرخار وادی میں قدم نہیں رکھتا۔ ایسے میں مشفق خواجہ کا دم غنیمت تھا اور اب جب وہ ہم میں نہیں رہے ان کی مثال روشن رکھنے کے لیے اردو یونیورسٹی ان کے نام سے موسوم تحقیق چیئر قائم کرے گی جس پر ایسے اہل علم اور تحقیق کے جویا رونق افروز ہوں گے جو یونیورسٹی میں تحقیق کی پیاس کو افزوں کریں اور علمی ماحول کو فروزاں۔ مشفق خواجہ سے بھی پہلے ہم پر مولوی عبدالحق اور پیر حسام الدین راشدی کا حق ہے۔ قاضی اختر جوناگڑھی اور مولوی ہاشمی فرید آبادی کی بھی تحقیق میں گراں خدمات ہیں اور ہم یکے بعد دیگرے سب کے نام سے چیئر قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

آپ سب کی شرکت مشفق خواجہ جیسے فقیر منش اور گوشہ نشین کو ایک خراج تحسین اور یہ تقریب خود ہمیں اپنے زندہ ہونے کا یقین دلاتی ہے کہ ہم ان کے سپاس گذار ہو سکتے ہیں۔ جنھوں نے ہمارے معاشرے کو اپنی خاموش جدوجہد سے جاں بخشی۔ شکریہ

(بحوالہ: ماہنامہ "قومی زبان" مارچ ۲۰۰۵ء)

عمران نقوی

مشفق خواجہ کی یاد میں

ممتاز محقق، شاعر اور دانش ور مشفق خواجہ کی وفات پر ملک بھر کے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے لاہور دفتر نے مرحوم کی ادبی اور علمی خدمات کا اعتراف کرنے اور ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا جس میں بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور طالب علموں نے شرکت کی۔ اس ریفرنس کی صدارت عطاء الحق قاسمی نے کی جبکہ مرحوم مشفق خواجہ کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر خواجہ زکریا، ڈاکٹر انور سدید، مسعود اشعر، ڈاکٹر انیس ناگی، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر اورنگزیب، ڈاکٹر اجمل نیازی، امجد طفیل، فرخ زہرہ گیلانی، صوفیہ بیدار اور قاضی جاوید شامل تھے۔ مقررین نے مشفق خواجہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک سچے ادبی عالم تھے۔ انہوں نے تحقیق کے شعبے میں حافظ محمود شیرانی کی روایت کو آگے بڑھایا، اور تحقیق و تدوین کے جدید تقاضوں کو پیش نظر رکھا۔ ان کا ذاتی کتب خانہ پاکستان میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس میں چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں اور ساٹھ ہزار رسائل و جرائد نہایت ترتیب سے رکھے گئے ہیں۔ اور شعراء کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکرے اس لائبریری کی زینت ہیں۔ مرحوم نے ساری زندگی تحقیق و تدوین کے لیے وقف کیے رکھی۔ نہ صرف ملک بھر سے بلکہ پوری اردو دنیا سے ریسرچ اسکالرز ان سے تعاون کے طلبگار ہوا کرتے تھے۔ تاہم انہوں نے ہمیشہ شہرت سے گریز کیا اور بڑی خاموشی اور ذمہ داری کے ساتھ کام کرتے رہے۔

بک ہوم رائٹرز کلب کے زیر اہتمام بھی مشفق خواجہ کی یاد میں ایک تعزیتی ریفرنس منعقد ہوا اس کی صدارت بک ہوم رائٹرز کلب کے چیئرمین رانا عبدالرحمن نے کی۔ اجلاس میں ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور پبلشرز نے شرکت کی۔ اس تعزیتی ریفرنس سے پنجاب فورم کے چیئرمین پروفیسر عباس نجمی، سیکرٹری جنرل زاہد مسعود، ریاض احمد، رانا عبدالرحمن، ڈاکٹر انور محمود خالد، صدیق جاوید، ایم سرور، وحید الرحمن خان، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، زاہد حسن، محمد انور اور شبیر میواتی نے خطاب کیا۔

(بحوالہ: روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، ۳ مارچ ۲۰۰۵ء)

ادیب سہیل

مشفق خواجہ کا سفر آخرت

مورخہ ۲۲ فروری ۲۰۰۵ء صبح سات بجے فون کی گھنٹی بجی، فون اٹھایا تو عبدالقیوم چچا بولے۔ "سہیل تمہیں کچھ پتہ ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "خیر تو ہے؟"

بولے۔ "مشفق خواجہ صاحب گزشتہ شب انتقال کر گئے۔"

یہ سن کر میں لمحہ بھر کے لیے سکتے میں آ گیا۔ میں نے معاً انجمن کے دفتر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ نو بجے دفتر پہنچ گیا۔ نسیم احمد موجود تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کے انتقال کی تصدیق کر دی۔ دفتر میں ابھی اکا دکا لوگ آئے تھے۔ پھر یکے بعد دیگرے اراکین دفتر آنا شروع ہو گئے۔ اس سانحے سے بیشتر ارکان ابھی بے خبر تھے۔ روایت کے مطابق خواجہ صاحب کے سانحہ ارتحال کی پریس ریلیز تیار کی گئی، انجمن کے نائب معتمد امراؤ طارق کے دستخط سے اخباروں کو بھیج دی گئی۔ اخبار میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق خواجہ صاحب کا جنازہ ان کے گھر پاپوش نگر کے بجائے ان کی بڑی بہن کے گھر واقع سی ویو اپارٹمنٹ سے چار بجے تدفین کے لیے پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ انجمن کے عاملین کے لیے فرداً فرداً وہاں پہنچنا آسان نہ تھا۔ لہٰذا اسے آسان بنانے کے لیے سوچا گیا کہ ایک چھوٹی بس کرائے پر آمد و رفت کے لیے ساتھ لے لی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ تمام اراکین انجمن خواجہ صاحب کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے سی ویو اپارٹمنٹ پہنچے تو اپارٹمنٹ کے چوکیدار نے بتایا کہ جنازہ ابھی ابھی قبرستان کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ ہم لوگ قبرستان کے لیے لوٹے اور خدا خدا کر کے تدفین سے پہلے قبرستان کی مسجد پہنچ گئے۔ مسجد کے اندر اور باہر ادیبوں، شاعروں اور مشفق خواجہ کے چاہنے والوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔

بعد نماز عصر مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ اور پھر مسجد کے احاطے کے ساتھ ہی لگے ہوئے قبرستان کی جانب لوگ جنازہ لے کر چل پڑے۔ صاحبان علم، ادیب دوستوں اور خواجہ صاحب کے چاہنے والوں سے رستہ چھلکا پڑتا تھا۔

یہاں آ کے معلوم ہوا کہ اس قبرستان کو خواجہ صاحب کی تدفین کے لیے کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ یہیں ان کے والد خواجہ عبدالوحید اور والدہ کی قبریں ہیں، اس لیے انہی کے پہلو میں مشفق خواجہ صاحب کی تدفین مناسب سمجھی گئی۔

تدفین کے بعد انجمن ترقی اردو پاکستان اور ادارہ یادگار غالب کی طرف سے مشفق خواجہ کے مزار پر پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں۔ چادریں چڑھانے کی رسوم امراؤ طارق اور نسیم احمد نے ادا کی۔ ان کے ہمراہ انجمن اور ادارہ یادگار غالب کے دیگر اراکین بھی موجود تھے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے بھی مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔ قبر کے ساتھ جو لوگ کھڑے تھے ان میں اکثر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ بے شک سب کے لیے مشفق خواجہ صاحب کا درمیان سے اچانک سفر آخرت پر چلے جانا ایک بڑا المیہ تھا۔ قبر پر گل پوشی اور گل پاشی کے بعد فاتحہ خوانی ہوئی۔ فاتحہ خوانی میں بھی سوگواروں کا ہجوم تھا، دعائے مغفرت کے لیے لاتعداد ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ فاتحہ خوانی ختم ہوئی اور آخری دیدار کے لیے آئے ہوئے سینکڑوں سوگوار صدمات سے دبے ہوئے اور بوجھل قدموں سے اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔

(رپورٹ، ادارہ: قومی زبان، مارچ ۲۰۰۵ء)

مشفق خواجہ اپنی ذات میں انسائکلوپیڈیا تھے

ممتاز شاعر اور دانشور ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے کہا ہے کہ مشفق خواجہ اپنی ذات میں ایک ڈکشنری اور انسائکلوپیڈیا تھے۔ ایسے باکمال لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے آرٹس کونسل کے تحت ادبی ریفرنس میں اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں ان کے کتب خانے کو طلسمی کتب خانہ کہتا ہوں۔ پاکستان میں ایسے کتب خانوں کی کمی ہے۔ ان کے کتب خانے کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا مشفق خواجہ نے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام زندگی علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ وزیر اعلیٰ سندھ کی مشیر فاطمہ ثریا بجیا نے کہا کہ پاکستان دنیا بھر میں ایک نگینہ ہے، یہاں صاحبان علم بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں علم و ادب کی کمی نہیں ہے، علم و ادب کی جستجو کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا، مشفق خواجہ بلاشبہ قلندر صفت آدمی تھے۔ انہوں نے بے نیازانہ زندگی گزاری، مشفق خواجہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ ان کا حافظہ بھی قابل رشک تھا۔ مجھے تو دور تک ان جیسا محقق نظر نہیں آتا۔ معروف شاعر نقاد اور آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ مشفق خواجہ کا کام تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ تحقیق و تنقید اور ایک خاص انداز کے مزاح پر انفرادی دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے ترتیب و تدوین کے جو شاہکار چھوڑے ہیں وہ غیر معمولی نوعیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے "کلیات یگانہ" مرتب کر کے مثالی کام کیا ہے۔ شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے کہا کہ مشفق خواجہ نے اپنی علمی اور فکری روشنی سے اپنے آپ کو منفرد رکھا۔ وہ بے بدل ادیب، بے مثال محقق اور بہت اعلیٰ شگفتہ نگار تھے۔ معروف ادیب اور صحافی

غازی صلاح الدین نے کہا کہ مشفق خواجہ نے دنیا کے جھمیلوں سے خود کو دور رکھا اور علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ آرٹس کونسل کے اعزازی سیکرٹری انیق احمد نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور نظامت بھی کی۔ اس موقع پر سجاد میر، یمین مرزا، عیم اختر اور نوشابہ صدیقی نے بھی خیالات کا اظہار کیا۔

(رپورٹ: روزنامہ "جنگ" کراچی، ۵ مارچ ۲۰۰۵ء)

میر پور خاص کی ادبی و ثقافتی تنظیم "مکالمہ" کی جانب سے
مشفق خواجہ کی یاد میں ادبی ریفرنس

ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ میر پور خاص کے چیئرمین، پروفیسر انوار احمد زئی نے کہا ہے کہ موجودہ عہد بے مثل محقق اور صاحب طرز ادیب سے محروم ہو گیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے میر پور خاص کی معروف ادبی و ثقافتی تنظیم "مکالمہ" کی جانب سے مشفق خواجہ کی یاد میں منعقد ہونے والے ادبی ریفرنس کے موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ طنز و مزاح کا جو دبستان رشید احمد صدیقی کے نام سے عبارت تھا، مشفق خواجہ اس کا آخری حوالہ تھے۔ حیدر آباد سے آئے ہوئے معروف افسانہ نگار قدیر غوثی نے کہا کہ کتب خانے کے حوالے سے مشفق خواجہ ملک کی سب سے بڑی انفرادی لائبریری کے مالک تھے۔ انہوں نے ادب کی مختلف جہتوں پر کام کیا۔ ان کی کتاب ادب اور تحقیق کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس موقع پر ماہر اجمیری، نوید سروش، مرزا عاصی اختر، آصف خان، شبیر جہانگیر، صابر علی اور عمران چشتی نے بھی خطاب کیا۔ بعد ازاں ان کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی۔

(رپورٹ: روزنامہ "جنگ" کراچی)

نمونہ کلام

معنی زیست تک رسائی دے
یا پھر اس قید سے رہائی دے
ناشناسوں کو جو خدائی دے
وہ ہمیں کاسۂ گدائی دے
اس اندھیرے میں ایک جگنو بھی
مہر تاباں ہے گر دکھائی دے
وہ خموشی ہے چونک اٹھتا ہوں
اپنی آواز اگر سنائی دے
میری آنکھوں کو آئنہ تو کیا
اب انہیں عکس آشنائی دے
اس بہانے ہی کر لے یاد مجھے
اس کو توفیق بے وفائی دے
اب یہ آنکھوں کا حال ہے تجھ بن
دیکھوں سب کچھ، نہ کچھ دکھائی دے
یہ تصوف نہیں ہے تجربہ ہے
خود کو دیکھوں تو وہ دکھائی دے
میں اسے دیکھوں، اپنے آپ کو وہ
اب جہاں تک مجھے دکھائی دے

(بحوالہ: "فرائیڈے اسپیشل" ۱۸ مارچ ۲۰۰۵ء)

(انتخاب)

سفرنامہ یا شاہی دسترخوان...... خامہ بگوش

جو اہل قلم ایک سے زائد اصناف ادب کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے ہیں، ان میں سے اکثر عموماً خسارے میں رہتے ہیں کہ ان کی ادبی توانائی مختلف جہتوں میں تقسیم ہو کر ادب کے لیے بھی خسارے کا سبب بنتی ہے لیکن محسن بھوپالی کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ جس صنف ادب کو بھی ہاتھ لگا دیتے ہیں، وہ سونا بن جاتی ہے۔ آج کل مہنگائی کی وجہ سے اصلی سونا نایاب ہے، اس لیے محسن بھوپالی کے تیار کردہ سونے کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

محسن بھوپالی کے شعری سفر کا آغاز اس شعر سے ہوا جو بالآخر ان کے شعری سفر کا حاصل قرار پایا۔

نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

اس شعر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی کوئی دوسری مثال موجودہ زمانے کی شاعری میں نہیں ملتی۔ لوگوں کے ذہنوں سے لے کر بسوں اور رکشاؤں تک پر یہ شعر ثبت ہو چکا ہے۔ محسن کے معاصرین کے مجموعے دیکھ جائیے، ان میں ایسا ایک شعر بھی نظر نہیں آئے گا، بلکہ خود محسن کے اپنے مجموعے بھی اس قسم کے کسی دوسرے شعر سے خالی ہیں۔ مگر اتنے بھی خالی نہیں ہیں کہ تشنگان سخن ان سے اپنی پیاس نہ بجھا سکیں۔ سچی بات یہ ہے کہ محسن جیسا کوئی دوسرا شاعر ان کے معاصرین میں دور دور تک نظر نہیں آتا اور اگر نظر آ جائے تو اسے نظر کا دھوکا سمجھنا چاہیے۔

محسن نے شاعری میں رنگا رنگ تجربے کیے ہیں۔ نظم اور افسانے کے امتزاج سے ایک نئی صنف سخن "نظمانہ" ایجاد کی ہے۔ شاعری میں نثر کی تمام خوبیوں کو یک جا کر دینا کوئی آسان کام نہ تھا، ہمارے ہاں شاعرانہ نثر لکھنے کی روایت تو موجود تھی، شاعری میں نثر نگاری کی روایت کا آغاز محسن سے ہوتا ہے۔

محسن کی ہائیکو نگاری کی تعریف میں ہم ایک پورا کالم لکھ چکے ہیں جس کی تردید ابھی تک کسی نے نہیں کی۔ ویسے بھی ہم جو کچھ لکھتے ہیں، کسی دوسرے کو اس کی تردید کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ ہماری ہر تحریر میں تردید کے لیے داخلی شواہد موجود ہوتے ہیں۔ ایسا ہم جان بوجھ کر نہیں کرتے۔ بدقسمتی سے کسی کی تعریف کرتے وقت ہمارا موقف ہی کمزور ہوتا ہے، لیکن محسن بھوپالی کے سلسلے میں ہمارا موقف کمزور نہیں ہے۔ ہاں دلائل جو ہم نے دیے ہیں وہ کمزور ہوں تو الگ بات ہے کیونکہ دلائل کے ساتھ مثالیں تو بہر حال محسن کی شاعری ہی سے دی گئی تھیں۔

محسن نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی طرف بھی بھرپور توجہ کی ہے۔ ان کی ایک نثری تصنیف "قومی یک جہتی میں ادب کا کردار" کے نام سے چھپ کر ان لوگوں میں مقبول ہو چکی ہے جن کے اس کتاب میں انٹرویو ہیں۔ اب دوسری کتاب "حیرتوں کی سرزمین" منظرِ عام پر آئی ہے جس کے بارے میں ہمیں اس وقت کچھ عرض کرنا ہے۔

دیباچے میں محسن بھوپالی نے لکھا ہے کہ اس سفرنامے کو "آپ عام سفرناموں سے ہٹ کر پائیں گے۔ اس میں آپ کو نہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات ملیں گی، نہ تجارت و معاشیات کے اعداد و شمار کا گورکھ دھندا اور نہ ہی دورانِ سفر کسی نیلی آنکھوں والی دوشیزہ سے مکالمے اور بعد میں معاشقے کی داستان نظر آئے گی۔"

یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے ہٹ کر ہی نہیں بلکہ بہت پرے ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں واقعی کوئی گورکھ دھندا نہیں ہے۔ لیکن ایک خاص نوعیت کا دھندا ضرور ملتا ہے اور وہ ہے مشاعروں کا دھندا۔ ہر تیسرے صفحے پر کسی مشاعرے یا شعری نشست کی روداد نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں سوائے مشاعرے بازی کے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ حیرت ہے کہ اس مشاعرے بازی کے باوجود امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا اور ہم نے اپنی ساری طاقت مشاعروں میں ضائع کر دی، بلکہ بہت سے شاعر بھی ضائع کر دیے کہ وہ سال میں آٹھ مہینے امریکہ میں مشاعرے پڑھتے ہیں اور ایسے سخن شناسوں کے مہمان بنتے ہیں جو ہمارے شاعروں کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔

محسن بھوپالی نے بتایا ہے کہ ایک مشاعرے میں جمیل الدین عالی کو جمیل الدین مالی کہہ کر ڈائس پر بلایا گیا۔ عالی صاحب جیسے بڑے شاعر کے ساتھ امریکہ میں یہ سلوک ہو سکتا ہے تو اس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ عام شاعروں کی کیا کیا عزت افزائیاں نہ ہوتی ہوں گی۔

کراچی سے نیویارک پہنچ کر محسن بھوپالی کو جو سب سے پہلا خوش گوار تجربہ ہوا وہ بیک وقت حیرت اور خوشی کے جذبات کا آئینہ دار تھا۔ حیرت اس بات پر کہ تقریباً ۲۴ گھنٹے سفر کرنے کے بعد بھی تاریخ نہیں بدلی اور خوشی اس بات کی کہ عمرِ عزیز کو مفت میں ایک دن زائد مل گیا۔ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ اس قسم کی حیرت اور خوشی سے دوچار ہونے کے لیے کراچی سے نیویارک تک سفر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے گھر میں مقید ہو کر مشاعرہ باز شاعروں کا کلام پڑھتے ہیں تو تاریخ تو کیا، صدی بھی نہیں بدلتی، بیسویں صدی میں انیسویں صدی کا رنگِ سخن مزہ دے جاتا ہے۔

محسن بھوپالی بتاتے ہیں کہ امریکہ میں مقیم پاکستانی اپنے ہم وطن شاعروں کو بڑے اشتیاق سے مدعو کرتے تھے، انھیں خوب کھلاتے پلاتے تھے، کلام سنتے تھے اور پھر چلتے وقت گیارہ گیارہ ڈالر نقد یا کوئی تحفہ پیش کرتے تھے اور تو سب اس صورتحال سے خوش تھے، مگر جون ایلیا کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی کہ کھانے کے بعد گانا بھی ہو۔ جون شاعری کے لیے "گانے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں حالانکہ وہ اپنا کلام تحت اللفظ سناتے ہیں۔ ایک محفل میں تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا "ایسی محفلیں عام ہو گئی ہیں کہ شعرا کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ شعر سنائیں، ہمیں کھانے اور گانے کے اس رجحان کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔"

جون ایلیا کی یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی، جو لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے شاعروں کو امریکہ بلاتے ہیں، وہ صرف کھانا کھلانے کے لیے نہیں بلاتے۔ دنیا میں ہر شخص روزی کے لیے محنت کرتا ہے۔ شاعروں سے بھی اس کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ محنت کر کے روح و تن کا رشتہ برقرار رکھیں گے، اسی لیے کھانا اور گانا لازم و ملزوم ہیں۔ گانے کے بغیر کھانا نہیں مل سکتا اور کھانے کے بغیر گانا ممکن نہیں ہے۔

محسن بھوپالی نے بتایا کہ دورانِ سفر جون ایلیا کی وجہ سے ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہو گیا۔ مشاعرہ گردوں کی ٹولی جہاں بھی جاتی تھی، جون ایلیا کو ان کے لمبے بالوں کی وجہ سے خاتون سمجھا جاتا تھا، کئی مرتبہ ہوٹل کے بیروں نے انھیں "میڈم" کہہ کر مخاطب کیا اور ایک مرتبہ تو یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ جب وہ ایک جگہ باتھ روم میں داخل ہونے لگے تو کسی اہل کار نے انھیں روک کر کہا "خواتین کا باتھ روم دوسری طرف ہے۔"

اس دلچسپ صورتحال کی وجہ سے جون ایلیا کو امریکہ اتنا پسند آیا کہ مشاعروں کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنے ہم سفر شاعروں کے سامنے یہ تجویز رکھی "کیوں نہ ہم لوگ ایک ٹیکسی خرید لیں اور ہم سب مل کر ایک منڈلی بنا لیں" سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ امریکہ میں اس قسم کے گروپ عام تھے جو گا بجا کر اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ جون ایلیا کے مجوزہ گروپ کا نام "بھٹکے ہوئے لوگ" رکھا گیا۔ محسن بھوپالی نے یہ واقعہ یہیں تک بیان کیا ہے۔ سفرنامے میں گروپ کی سرگرمیوں کی تفصیلات نہیں دیں، شاید اس موضوع پر الگ کتاب لکھنے کا ارادہ ہو کیونکہ کھٹکے والے قرطاس و قلم کے حوالے سے بھی کھٹک سکتے ہیں۔

محسن بھوپالی نے جون ایلیا کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک تفریح گاہ میں دو سیاح طالبات نظر آئیں تو مشاعرہ گردوں نے ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ جب یہ طالبات رخصت ہو گئیں تو جون ایلیا نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا "ان طالبات سے ان کے نام اور پتے تو پوچھے ہی نہیں۔" اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف کی شاعری میں جو سوز و گداز ملتا ہے اس کا ماخذ کس قسم کی محرومیاں ہیں۔

تصویروں کی بات چلی ہے تو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ محسن کا سفرنامہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کی بھی چیز ہے۔ اس میں امریکہ کے بے شمار مناظر اور اہم عمارات کی تصویریں ہیں مگر کوئی تصویر اصلی حالت میں نہیں ہے، ہر عمارت کے سامنے اور ہر منظر کے درمیان جناب مصنف اپنے شرکائے سفر کے ساتھ موجود نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جناب مصنف کو اپنی تصویریں چھپوانے کا شوق ہے۔ پوری کتاب میں ان کی صرف تیس درجن تصویریں شامل ہیں۔ صفحات کتاب کی تعداد کے مقابلے میں تصویروں کی تعداد بہرحال بہت کم ہے۔

اس سفرنامے کی تعریف کے لیے اگر صرف ایک لفظ استعمال کرنے کی پابندی لگا دی جائے تو وہ سوائے "لذیذ" کے کوئی اور لفظ نہیں ہو سکتا۔ دعوتوں اور انواع و اقسام کے کھانوں کا ذکر اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ مصنف کے حافظے اور ہاضمے دونوں کی داد دینی پڑتی ہے۔

انھوں نے امریکہ میں قیام کے دوران جس دسترخوان سے جو فیض اٹھایا، اس کی تفصیل کتاب میں

موجود ہے۔ جن کھانوں کا ذکر کیا گیا ہے، اگر میزبانوں سے پوچھ کر ان کے پکانے کی ترکیبیں بھی لکھ دی جاتیں تو یہ سفرنامہ گھریلو خواتین کے کام بھی آ سکتا تھا۔

ساری دعوتوں کو ''کھانے'' کا مختتانہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ کم از کم ایک دعوت ایسی ضرور نظر آتی ہے جس کے بعد شاعروں نے کلام نہیں سنایا۔ اس دعوت کی تفصیل یہ ہے ''کھانوں کی ورائٹی اور مختلف ڈشوں نے واضح کر دیا کہ یہ نشست کلام سننے کے مطلب سے منعقد نہیں کی گئی تھی بلکہ اصل میں شعرا کو کھانوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے کی گئی تھی اور یہ بات اس وقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی جب کھانے کے بعد فرح (میزبان) نے مہمانوں کے سامنے صرف پانچ مختلف پڈنگ کی ڈشیں لا کر رکھیں۔''

اس دعوت کے بعد شعرا سے کلام نہ سننے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ اتنا کچھ کھانے کے بعد شعرا کے لیے کلام سنانا ممکن نہ رہا ہو گا یا پھر میزبانوں نے سوچا ہو گا کہ اتنی اچھی دعوت کے بعد کلام سن کر منہ کا مزہ خراب کیوں کیا جائے۔

محسن بھوپالی نے اگرچہ دیباچے میں یہ کہا ہے کہ انہوں نے سفرنامے میں کسی قسم کی معلومات پیش نہیں کیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ سفرنامے کے مطالعے سے قاری کی معلومات میں اضافہ نہ ہوتا ہو، بعض جگہ تو انہوں نے ایسے ایسے انکشافات کیے ہیں جن کا ذکر اس سفرنامے سے پہلے تو کیا بعد میں بھی کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ مثلاً ایک جگہ یہ انکشاف کیا ہے ''امریکہ میں ہر مقام پر قطار ضرور نظر آتی ہے، وہ بھی مخلوط، اگر دو آدمی بھی کسی دروازے، کسی کاؤنٹر یا کسی کھڑکی پر دیکھے ہیں تو برابر نہیں، آگے پیچھے۔'' اس قسم کی معلومات کی بنا پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا، محسن بھوپالی نے اسے از سر نو دریافت کیا ہے۔ دوسرے کارنامے کی اہمیت پہلے کارنامے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اس سفرنامے کو پڑھنا ایک خوش گوار تجربہ ہے۔ محسن بھوپالی اسی آسانی سے نثر لکھ لیتے ہیں جس آسانی سے وہ نظم لکھنے پر قادر ہیں۔ بلکہ نثر پر انہیں کچھ زیادہ ہی قدرت حاصل ہے اسی لیے وہ بعض لفظوں کے استعمال میں عام روش کی پیروی نہیں کرتے۔ مثلاً عام لوگ جہاں صرف ''سرگشت'' سے اپنا مفہوم ادا کر لیتے ہیں وہاں محسن ''پیدل سرگشت'' لکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے لیے احترام کے الفاظ لکھنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، انہوں نے جہاں کہیں اپنا اور اپنے ہم سفر شاعروں کا ذکر کیا ہے، وہاں ''ہم شعرائے کرام'' کے الفاظ استعمال کر کے عبارت کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔

ساقی فاروقی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے محسن بھوپالی نے بعض الفاظ کا املا بھی تبدیل کر دیا ہے۔ ''بحث و تمحیص'' کو ''بحث و تمحیث'' لکھ کر ''ص'' کے غیر ضروری استعمال سے نجات حاصل کر لی ہے، دونوں لفظ ''ث'' سے لکھے جائیں تو اچھے لگتے ہیں۔ جن لوگوں کو ''ث'' ناپسندیدہ ہو وہ محسن کے وضع کردہ اصول کے مطابق ''بحص و تمحیص'' بھی لکھ سکتے ہیں۔ (۲ مئی ۱۹۹۶ء)

(بحوالہ: ''امت'' کراچی، ۲۷ جنوری ۲۰۰۵ء)

مشفقِ من خواجۂ من

عظیم محقق، لاجواب کالم نگار، مشفق انسان، خزینۂ علم و ادب، شناورِ بحرِ تحقیق، حجتی فی العلم، کتاب دوست، کتاب خواں، کتاب شناس، ہمہ صفت، نادرِ روزگار شخصیت "مشفق خواجہ" کی پہلی برسی کے موقع پر تعزیتی اور تاثراتی تحریروں پر مشتمل یہ مجموعہ ہمارے اس عہدِ ناسپاس کے ایک بہت بڑے محقق اور عظیم انسان کی خدمت میں ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے، جسے تشنگانِ علم کے لیے ہمارے اس عہد کے ایک اور گوشہ نشین محقق جناب محمد عالم مختار حق نے بڑی محبت اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ وہ آنسو ہیں جو خواجہ صاحب کی محبت سے سرشار ان کے عقیدت مندوں کی آنکھ سے ٹپکے ہیں۔ ان کی یادوں سے معطر سدا بہار پھول ہیں جنھیں خواجہ مشفق کی نذر گزارنے کے لیے بڑی محبت سے گوندھ کر ایک ایسی مالا میں پرو دیا گیا ہے جس سے مشامِ جاں تادیر معطر رہے گا۔ مشفق خواجہ برصغیر پاک و ہند کے گنے چنے کتاب شناسوں اور کتاب دوستوں میں سے تھے۔ تحقیق، شاعری، کالم نویسی، ادارت، فوٹو گرافی ان کے خاص مشاغل تھے۔ علم و ادب کی اس بے مثال شخصیت کی رحلت دنیائے ادب کا ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ ان کے فروزاں کیے ہوئے ادب و دانش کے چراغ تادیر راہِ ادب کے نو واردان کو راستہ دکھاتے رہیں گے۔ زیرِ نظر مجموعے میں شامل تحریروں سے مجھے جس مشفق خواجہ سے شناسائی ہوئی، زندگی میں اس سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کرنے کا دکھ تا زندگی رہے گا۔ آپ بھی جب یہ تحریریں پڑھیں گے تو میری ہم نوائی کریں گے کہ ایسے پراگندہ طبع لوگ تو قدرت کا خاص انعام ہوتے ہیں۔

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اُٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں رہتی ہے۔ لوگ اس سرائے میں آتے ہیں قیام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں مگر مشفق خواجہ جیسے لوگ یہاں سے جا کر بھی اپنی خوش گوار یادوں کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ امر ہو جاتے ہیں۔

مظہر سلیم مجوکہ
مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ نیک ڈائجسٹ لاہور
0333-4377794